کلامِ نرم و نازک

آپ بیتی

داستانِ پاکستان

بزبانی

چوہدری نذیر احمد خان

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور — راولپنڈی — کراچی

کلامِ نرم و نازک

آپ بیتی

داستانِ پاکستان

بزبانی

چوہدری نذیر احمد خان

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور ○ راولپنڈی ○ کراچی

کلامِ نرم و نازک

آپ بیتی

داستانِ پاکستان

بزبانی

چوہدری نذیر احمد خان

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور ○ راولپنڈی ○ کراچی

پہلی بار ۱۹۷۵
تعداد ۱۰۰۰
قیمت ۲۰.۶۰

ناشر: چودھری محمد رشید، دفتر "الاحبا" ۱۱۔ ڈنگہ سنگھ بلڈنگ
شارع قائداعظم، لاہور
مطبوعہ: فیروز سنز لمیٹڈ لاہور، باہتمام عبدالحمید خاں پرنٹر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشکش

اُس پاکستان کی خدمت میں

جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم

کے نام پر حاصل کیا گیا تھا ________

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

(اقبالؒ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

کلامِ نرم و نازک

پھُول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

(اقبالؒ) (بحر تری ہری)

اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں
میرے سیکرٹری عزیز چوہدری محمد رشید صاحب
نے قابلِ قدر کام کیا ہے۔ جس لگن سے اُنھوں
نے اس کتاب کو مکمّل کروایا اور چھپوایا ہے
اللہ تعالیٰ انھیں اس کے لیے جزائے خیر دے۔

فہرست

پیش لفظ

جناب جسٹس ڈاکٹر ایس اے رحمٰن
سابق چیف جسٹس پاکستان

سیرت نگاری ایک مشکل فن ہے۔ کسی شخصیت کے تعارف کی کوشش ایک کٹھن سفر ہے جس میں کئی نازک موڑ آتے ہیں۔ اگر اس راہ کے مسافر کا توشہ معروضی حقیقت پسندی ہو تو اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ راہِ راست سے نہ بھٹکے۔ لیکن اگر وہ اپنے گرد و پیش کو ذاتی جذبات و احساسات کی عینک سے دیکھنے کا عادی ہو تو عین ممکن ہے کہ راستے کے مناظر کا اصلی رنگ رُوپ اس کی نظر سے اوجھل رہے۔ کسی حد تک تو یہ بشریت کا تقاضا ہے کہ موضوعی اندازِ نظر کا پَرتو ہر سعیٔ دریافت پر پڑے۔ لیکن اگر اس امکان کا شعور ہو تو فکرِ سلیم میزانِ عدل کے کسی پلڑے کو ایک طرف زیادہ جھکنے نہیں دیتی اور رہرو ایک متوازن راستہ اختیار کر لیتا ہے۔

حقیقت کے چہرے کی نقاب کشائی اور بھی مشکل ہو جاتی ہے جب سیرت نگار کا موضوع خود اپنی ذات ہو۔ ہوسِ نمود 'غیر شعوری طور پر' دل کے نہاں خانوں میں چھپ چھپ کر رُوئے حقیقت کو مسخ کر سکتی ہے۔ خود احتسابی کے لیے عالی ظرفی اور وسعتِ قلبی کی ضرورت ہے لیکن دوسری طرف اس بات کا بھی امکان ہے کہ واقعات کے صحیح خد و خال آپ بیتی لکھنے والے کے دماغ میں موجود ہوں اور عوامی ذہن میں ان کا نقشہ کم علمی کے تعصب نے دگرگوں کر دیا ہو۔ ایسی صورت میں' سیرت نگار کے پیش کردہ انکشافات کی تاریخی افادیت سے انکار بے انصافی ہوگی۔

زیرِ نظر کتاب چودھری نذیر احمد خاں کی کہانی' اُن کی اپنی زبانی پر مشتمل ہے۔ چودھری صاحب اپنی زندگی کے ،، سالوں میں نشیب و فراز کی متعدد گھاٹیوں سے گزرے ہیں اور جو تجربات انھیں

حاصل ہوئے ہیں، ان کے نتائج کا ابلاغ اُن کے پیشِ نظر ہے۔ چودھری صاحب نے وکالت کے پیشہ میں اپنی محنت اور لیاقت سے ناموری حاصل کی لیکن وہ محض ایک کامیاب وکیل ہی کی حیثیت سے منظرِ عام پر نہیں اُبھرے، ان کے دردمند دل نے انھیں ملک اور قوم کی خدمت کے جذبے سے سرشار رکھا۔ وہ اسلامی ذہن رکھتے ہیں اور اسلامی اقدار کے فروغ کے لیے وہ مدت العمر اور مقدور بھر کوشاں رہے ہیں۔ مسلمان بچوں کی تعلیم کا مسئلہ اُن کے لیے جاذبِ توجہ رہا اور انھوں نے اس میدان میں قابلِ قدر عملی اقدامات کیے۔ تحریکِ پاکستان کے دوران میں ان کی اسلامی عصبیت نے انھیں قید و بند کی صعوبتوں سے بھی آشنا کیا۔ لیکن ان کے پائے استقلال کو لغزش نہ ہوئی۔ فرنگی کی عطا کی ہوئی "عزت" کی نشانیاں اُن کے لیے بے حقیقت ہو گئیں اور اس نازک دور میں انھوں نے ذاتی ایثار اور خلوصِ عمل کی ایک درخشاں مثال نوجوانوں کے سامنے رکھی۔

جب بفضلِ ایزدی پاکستان ایک آزاد مملکت کی صورت میں وجود میں آگیا، تو وہ آئین ساز اسمبلی کے رُکن ہوئے۔ پاکستان ایک فقید المثال ملک ہے، جس کی اساس علاقہ، نسب، خون یا رنگ کی یکسانی پر نہ اٹھائی گئی بلکہ جسے زندگی کے اسلامی نظریہ نے پروان چڑھایا۔ خدا کے بندوں نے، خواہ وہ مغربی پاکستان سے تعلق رکھتے تھے اور خواہ مشرقی پاکستان سے، اسلامی یک نظری اور ہم دلی کے طفیل، یہ ملک اس لیے حاصل کیا تھا کہ پاکستان کی مسلم آبادی اپنی زندگیوں کو قرآنی اقدار کے سانچوں میں ڈھال سکے۔ آئین ساز اسمبلی کی کارروائیوں نے طول کھینچا لیکن پہلے مرحلہ میں جب قراردادِ مقاصد زیرِ بحث آئی، تو چودھری صاحب نے اس کے منظور کرانے میں سعیِ بلیغ کی تاکہ مستقبل کی عمارت مضبوط بنیادوں پر استوار ہو۔ چودھری صاحب اور ان کے ہم خیال مسلم اراکین نے، خاصی مخالفت کے علی الرغم، یہ مہم کامیابی سے طے کی اور اس طرح سے کاروانِ پاکستان کی سمتِ سفر متعین ہو گئی۔

چودھری صاحب حکومتِ پاکستان کے وزیر بھی رہے اور اس کے اٹارنی جنرل بھی۔ ان

حیثیتوں میں ان کے کارناموں کی داستان' ان اوراق میں قارئین ملاحظہ فرمائیں گے' جو دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ وہ بین الاقوامی اداروں میں بھی پاکستان کی نمائندگی کرتے رہے اور انھوں نے پاکستان کو بین قومی برادری سے روشناس کرانے میں کوئی موقعہ ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ اس کارِ خیر میں بعض اوقات ان کے راستے میں روڑے بھی اٹکائے گئے' لیکن ان کی ملی لگن اور دینی حمیت انھیں خاطر میں نہ لائی۔ اپنے عہدِ وزارت میں انھوں نے کلیاتِ اکبر کی تدوین وطباعت کا بندوبست کر کے ادب دوستوں سے خراجِ تحسین بھی وصول کیا۔ گویا انتظامی معاملات میں منہمک رہ کر بھی' انھوں نے ایک مفید ادبی کام کا بیڑا اُٹھایا اور اسے منزلِ مقصود تک پہنچایا۔

سرکاری عہدوں سے علیحدگی نے ملک کے وسیع تر مفاد کی خدمت کا میدان اُن کے لیے کھول دیا۔ وہ اسلامی عالمی برادری کے اتحاد کی تجاویز کو بروئے کار لانے میں محو ہو گئے۔ انہی کی مخلصانہ کوششوں سے "الاخوۃ" کا ادارہ وجود میں آیا جس کے رسالہ "الاخوۃ" کو انھوں نے اسلامی ملکوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے اور ایک دوسرے کے مسائل سمجھنے سمجھانے کا وسیلہ بنایا۔ انھوں نے اس کے مصارف اپنی جیبِ خاص سے برداشت کیے۔ اسلامی دولت مشترکہ کا نصب العین انھوں نے ایک مستقل تصنیف کی شکل میں اسلامی برادری کے سامنے رکھ دیا ہے۔

چودھری صاحب کے دنوں کا سوز اور شبوں کا گداز اسلامی نظریہ کی پیش رفت کے لیے وقف رہا ہے۔ اب بھی اس پیرانہ سالی میں ان کے دم خم جوانوں کے سے ہیں۔ جس نوع کی بھرپور زندگی چودھری صاحب نے گزاری ہے یقیناً اس کی کہانی محض آپ بیتی نہیں رہتی بلکہ اس کے ڈانڈے جگ بیتی سے جا ملتے ہیں۔ وہ ایمان کی دولت سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عمل پسند انسان ہیں۔ انھوں نے ایک فعال اور پہلودار زندگی گزاری ہے۔ وہ ادب کا بھی صاف ستھرا ذوق رکھتے ہیں اور قوموں کی زندگی میں صالح ادب کے تعمیری کردار کے نکتہ شناس بھی ہیں۔ لیکن ان جیسے عملِ پیہم کے رسیا انسان سے محض ادبیت کی خاطر عبارت آرائی کی توقع

عبث ہوگی۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا، سوچا، یا محسوس کیا، بڑی صاف دلی سے، سادہ انداز میں سپرد قلم کر دیا ہے۔ اپنوں اور بیگانوں کے متعلق، اپنے مشاہدات کی روشنی میں، جو رائے انھوں نے قائم کی، اس کا اظہار انھوں نے برملا کر دیا ہے۔ اس کتاب میں عام قاری کے لیے سامانِ لطف اندوزی موجود ہے۔ لیکن شاید بے جا نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ ان کا رُوئے سخن زیادہ تر نسلِ نَو کی جانب ہے، جس کو وہ اس خود نوشت سرگزشت کے ذریعے سے زندگی کی اقدار سے رُوشناس کرانا چاہتے ہیں جنھیں وہ خود عمر بھر اپناتے رہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ہماری نژادِ نَو اس کتاب کے مطالعہ سے اپنے قومی تشخص کی شناخت میں امداد حاصل کرے گی ۔

ایس اے رحمٰن

لاہور

۲۵ر اپریل ۱۹۷۵ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

کلامِ نرم و نازک

طاعنوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہِ خطا
وار ان کا اس لیے اکثر خطا کرتا رہا
مُنھ نہ دیکھیں دوست پھر اگر وہ یہ جانیں کہ میں
ان کو کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا (حالی)

عرضِ حال

بارہا دیکھا کہ جب کسی نے کسی انتخابی مقابلہ میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو جواز یہ پیش کیا کہ "احباب کے اصرار" پر ایسا کر رہا ہوں۔

اسی طرح جب کسی نے اپنی سوانح حیات لکھی تو اکثر بار یہی عذر پیش کیا کہ "دوستوں کا تقاضا" ہے۔

میں ہمیشہ یہ خیال کرتا تھا کہ دونوں صورتوں میں تکلف (یا مبالغے) سے کام لیا جاتا ہے۔
غور کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ حقیقت یہ ہے کہ دوستوں کی تحریک بھی ہوتی ہے لیکن فیصلہ کا زیادہ تر انحصار اپنے میلانِ طبع اور ذاتی رائے پر ہوتا ہے۔
تو۔ یہ "داستانِ حیات" جو آپ کو سنا رہا ہوں۔ اس کے سنانے کا خود بھی شوق تھا اور احباب کا تقاضا بھی تھا۔
ہم سب نے یہ سوچا کہ ان لوگوں کی تعداد میں تیزی سے کمی ہو رہی ہے جنھوں نے

پاکستان کے پودے کے لیے زمین کی تیاری میں حصہ لیا یا کم از کم یہ مرحلہ دیکھا ضرور، پھر بیج بونے کا عمل بھی دیکھا۔ پھر اس کو پانی دیا۔ پاکستان کا ننھا سا پودا اُن کے سامنے بڑھا۔ پھلا پھُولا پروان چڑھا۔ انھوں نے اس کی نگہداشت اور آبیاری میں حصہ لیا۔ پھر اُنہی آنکھوں نے پاکستان کے پھل دار درخت کو کمزور پڑتے دیکھا۔ اس سے اپنوں کی لاپروائی اور غفلت دیکھی جو غداری کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ غیروں کی سازشیں دیکھیں اور پھر اُن کی ناپاک کوششوں سے اس نخلِ بارآور کا آدھا حصہ کٹ کر اس سے جُدا ہوتا بھی دیکھا۔

اُور۔ سب سے زیادہ دردناک یہ کہ اب بچے کھچے پاکستان میں ایسے رجحانات دیکھ رہے ہیں کہ اگر ان کا بروقت مداوا نہ کیا گیا تو خدانخواستہ موجُودہ پاکستان کا بھی وہی حشر ہوگا جو ماضی میں ہُوا تھا۔

پہلے تردو ٹکڑے ہونے سے ہمارے نظریۂ حیات کو ٹھیس لگی کہ ہماری صد سالہ کوشش یک قلم ملیا میٹ ہوگئی۔ جس کا مقصد (سرسیدؒ کے زمانے سے) مسلمانوں کو ہندوؤں سے ایک جُدا قوم ثابت کرنا تھا۔ اور جس کا خیال اقبالؒ نے پیش کیا اور جس کی عملی شکل قائداعظم محمد علی جناحؒ نے دنیا کے سامنے کچھ اس طریقہ سے پیش کردی کہ دشمن تک (بہ مجبوری) قائل ہو گئے۔ یہ کام درحقیقت شاہ ولی اللہؒ کے زمانے سے شروع ہوا تھا جس کی آبیاری سید احمدؒ بریلوی اور سید اسمٰعیل شہیدؒ نے اپنے خون سے کی تھی۔ اور مسلمان کو جہاد کا بھُولا ہوا سبق پھر یاد کرایا تھا۔

ہم نے سب پر ثابت کردیا کہ امتِ مسلمہ کے لیے تمام جغرافیائی حد بندیاں اور فاصلے۔ تمام نسلی امتیازات۔ رنگ اور زبان کے تمام اختلافات۔ رسوم و رواج کے تمام تضاد کوئی حقیقت (یا اہمیت) نہیں رکھتے۔ اور مسلمان خواہ دُنیا کے کسی حصہ میں ہو، ہر دوسرے مُسلمان کا بھائی ہے۔

لہٰذا مشرقی اور مغربی پاکستان درحقیقت ایک ہی دل کی دو دھڑکنیں تھیں اور ہم پر یک جان دو قالب کی مثل صادق آتی تھی۔

اور اب ۔ آں قدح بشکست وآں ساقی نماند' پیالہ تو ٹوٹنا ہی تھا۔ ساقی نے بھی آنکھیں پھیرلیں۔ چنانچہ آج پاکستان کے شاندار درخت کا آدھا حصّہ اس سے کٹ کر غیروں کے قبضہ میں ہے۔ آج مشرقی پاکستان "بنگلہ دیش" بن چکا ہے۔ لیکن اس کی باگ ڈور بنگالیوں کے ہاتھ میں نہیں۔ وہ اب ایک عظیم عالمی طاقت کے زیرِ سایہ بھارت کی ایک قسم کی نوآبادی کا درجہ رکھتا ہے اور اس کی حکومت پاکستان کے نظریہ کے خلاف ہے۔ ایک قومیت کا نعرہ لگانے والے بے بس اور اُداس مُنہ تک رہے ہیں۔ وہ بنگلہ دیش کو پھر سے پاکستان کا حصّہ بنانے کی اُمید سے مایوس تو نہیں لیکن عالمی اثرات کے ماتحت جلدی اپنے بچھڑے بھائیوں سے ملنے کی توقع بھی نہیں رکھ سکتے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان کے گہرے اور (تا حال) انمٹ اثرات باقی ماندہ پاکستان پر بھی ظاہر ہو رہے ہیں۔ سب سے بڑا افسوس تو یہ ہے کہ ہم نے اس المیہ کو اپنی قومی زندگی کی تاریخ سے قریباً قریباً مٹا دیا ہے اور جو سبق اس عظیم حادثہ سے حاصل کرنا چاہیے تھا وہ نہیں کیا :

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ موجودہ پاکستان میں بھی چار قومیتوں، صوبائی خود مختاری، علاقائی زبانوں اور علاقائی ثقافت کو فروغ اور نسلی تعصبات کو ہوا دی جا رہی ہے اور ہر طریقہ سے دو قوموں کے تصوّر کو کمزور کیا جا رہا ہے اور مختلف حیلوں بہانوں سے بعض ملکوں سے آشتی اور دوستی کے جذبہ کو نئی نسل کے دل میں کچھ اس طرح سمویا جا رہا ہے کہ گویا (خدانخواستہ) ہم نے پاکستان بنانے میں غلطی کی تھی اور اب بھارت سے علیحدگی کا جواز ختم ہوتا جا رہا ہے۔ میری رائے میں یہی وہ خطرناک مکتبِ فکر ہے جس نے ہماری نوخیز نسل کو دغدغہ اور الجھن میں مبتلا کر دیا ہے اور اسی رَوِش پر چلنا ہمارے لیے مہلک ثابت ہو سکتا ہے۔

اس کتاب کا مقصد اوّل نئی نسل کو (جو پاکستان بننے پر ظہور میں آئی ہے) پاکستان بنانے

کی اصل وجوہ سے آگاہ کرنا ہے، اور آئندہ لائحۂ عمل سوچنے کی دعوت دینا ہے۔

بس، یہی خیال ان معروضات کو آپ کے سامنے پیش کرنے کا محرک ہُوا۔ کیونکہ میری رائے میں پانی ابھی سر سے نہیں گزرا۔ سفینے میں کچھ سوراخ ہیں لیکن ویسے کشتی اور پتوار سلامت ہیں۔ صرف مخلص ملّاحوں کی اور جاں فروش کارکنوں کی ضرورت ہے۔ ملّتِ پاکستان کی یہ ڈگمگاتی ناؤ اب بھی ساحلِ مراد سے ہمکنار ہو سکتی ہے۔ پاکستان اب بھی صحیح معنوں میں ایک اسلامی فلاحی مملکت بن سکتا ہے (جس کا ہم نے وعدہ کیا تھا) ہمارے بچھڑے بھائی پھر ہم سے مل سکتے ہیں بشرطیکہ ہم یہ طے کرلیں کہ ہمارا مقام کیا ہے۔ ہم نے کہاں پہنچنا ہے۔ ہمارے راستے کیا ہیں۔ ہمارے دشوار سفر کے لیے ہمارے پاس زادِ راہ کیا ہے۔ اور چلنے والوں کے پاؤں میں کتنی سکت ہے۔ کیا ہم ظاہری مشکلات سے گھبرا کر اپنی منزل تو نہیں چھوڑ دیں گے؟

رہرو راہِ محبت رہ نہ جانا راہ میں
لذّت صحرا نوردی دُوریٔ منزل میں ہے

میں اپنی اس سرگزشت کو لن یوٹنگ LIN YU TUNG کے اسلوب پر ان کی مشہور تصنیف "آنسوؤں اور قہقہوں کے درمیان" BETWEEN TEARS AND LAUGHTER لکھنا چاہتا ہوں۔ بس اتنی تبدیلی کروں گا کہ اپنی کتاب کو BETWEEN LAUGHTER AND TEAR کی طرز پر لکھوں کہ میری رائے میں یہ زیادہ حسبِ حال ہوگا۔

ظاہر ہے کہ میرے طرزِ بیان میں کئی مقامات ایسے آسکتے ہیں جہاں اس کتاب کے پڑھنے والے میری رائے سے اختلاف رکھتے ہوں اور میرے تجزیہ کی صحت کے قائل نہ ہوں بلکہ ممکن ہے کسی حد تک میرے الفاظ دلخراش بھی سمجھے جائیں لیکن میں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میں اپنی معروضات کسی اعتراضی رنگ میں یا نکتہ چینی کے طور پر نہیں پیش کر رہا نہ کسی کی دل آزاری مقصود ہے بلکہ نہایت خلوص اور دردمندی سے اہلِ دانش کو دعوتِ فکر دے رہا ہوں کہ

"بہ بیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما"

میں نے کتاب لکھتے وقت محض اپنے حافظے اور اپنی یادداشت سے کام لیا ہے۔ واقعات کی تاریخیں شاید درست نہ ہوں۔ زمان ومکان کی پابندی کا مجھے حتمی طور پر اعتماد نہیں ہے لیکن واقعات کی صحت کا میں یقین دلا سکتا ہوں۔ زبان کی غلطی جہاں بھی ہو اس کی معافی چاہتا ہوں۔

میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ میں نہ کوئی ادیب ہوں نہ مصنف۔ نہ تاریخ دان ہوں نہ مؤرخ۔ نہ اہلِ زبان ہوں نہ زبان دان۔ صرف دیکھنے اور اس کے ساتھ سوچنے کی کوشش ضرور کرتا رہتا ہوں۔ اس لیے یہ کتاب صرف میرے ذاتی مشاہدات کا نچوڑ ہے اس کی خامیوں، غلطیوں اور کوتاہیوں کو "چشمِ مروّت" سے دیکھیں اور میرے "جذبۂ دروں" کو ملحوظِ خاطر رکھیں۔ میری دعا ہے کہ میری کوشش "دلفریب" ہو یا نہ ہو "دل گداز" ضرور ہو۔ اِلّا ماشاء اللہ۔

اے شعر دلفریب نہ ہو تو، تو غم نہیں
پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو (حالیؔ)

۹۲ گلبرگ لاہور — طالبِ مغفرت
۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء — نذیر احمد خاں

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کلامِ نرم و نازک

۱۹۰۲ سے ۱۹۱۲ تک

سکول کا زمانہ :

میری پیدائش ۱۲ ستمبر ۱۸۹۸ء عیسوی کو اقبالؒ کے شہر سیالکوٹ میں ہوئی۔ جہاں میرے والد صاحب مرحوم منشی محبوب عالم (اُس زمانے میں ایک خاص درجہ کے سرکاری افسران کو سرکاری طور پر منشی کہا جاتا تھا) تحصیلدار تھے جو بہت جلد ترقی پا کر ۱۹۰۲ء میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز ہو گئے۔ جو اُس وقت ایک کافی اُونچے درجہ کا عہدہ تصور کیا جاتا تھا۔ وہ تین سال تک راولپنڈی میں تحصیل دار رہے اور بہت مقبول و کامیاب تحصیل دار ثابت ہوئے۔ وہاں سے ترقی پر پشاور جانے پر کئی روز دعوتوں کا سلسلہ ان کے اعزاز میں جاری رہا۔ ایک شاندار الوداعی تقریب میں خادم بھیروی نے ایک مدحیہ پڑھا اُس کا ایک مصرع ابھی تک یاد ہے۔

"قصہ خوانی میں ترے قصے رہیں جاری سدا"

والد صاحب مرحوم ترقی پا کر پشاور جا رہے تھے جہاں کا قصہ خوانی بازار اس وقت بھی اتنا ہی مشہور تھا جتنا اب ہے۔

پشاور سے والد صاحب مرحوم ریاست ٹونک (راجپوتانہ) کی سٹیٹ کونسل کے ہوم ممبر

اور صدر بن کر گئے۔ حقیقتاً وہ حکمران تھے اور نواب صاحب ایک نمائشی علامت۔ ٹونک آکر ریاستوں کی ظاہری ٹیپ ٹاپ کی شان دیکھی۔ خود ہمارے گھر گھڑ سواروں کا پہرہ ہوتا تھا۔ ہمیں درباری آداب کے قواعد سکھائے گئے۔ نواب صاحب کے حضور اکثر جانا ہوتا تھا۔ میں اور میرے بڑے بھائی چودھری بشیر احمد (مرحوم)، نواب صاحب کے ننھے مصاحبین PAGES میں شامل تھے۔

ریاست میں انگریز کے زمانہ میں دیسی نوابوں اور راجاؤں کی مصنوعی اور فرضی زندگی کا مُرقع پیش نظر رہتا۔ گھر سے باہر یہ طمطراق دیکھتا لیکن گھر کا ماحول نہایت سادہ تھا دیہاتی اور شہری زندگی کا حسین امتزاج۔ دراصل میرے آبا و اجداد جنجوعہ راجپوت تھے جو پنڈدادنخان (ضلع جہلم) کے قریب پُوہا سیدن شاہ سے نقل مکانی کرکے دو تین پُشتوں سے موضع تلے والا (ضلع گوجرانوالہ) میں آکر آباد ہوئے اور آبائی پیشہ زمینداری اختیار کیا۔ والد صاحب مرحوم خاندان میں پہلے میٹرک پاس تھے جو نائب تحصیل دار بھرتی ہوکر اپنی خداداد قابلیت، ذہانت، محنت اور دیانت کی وجہ سے آٹھ دس سال کے قلیل عرصہ میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے بلند اور مُعزز عہدہ پر فائز ہوئے لیکن جیسا میں نے عرض کیا مجھے بچپن سے زندگی کے دو رُخ دیکھنے کا موقع ملا۔ ظاہری شان و شوکت بھی اور گھر کا نہایت صاف ستھرا اور سادہ اسلامی ماحول بھی، اس لیے شروع سے ہی اُس سے مغائرت اور اس سے ایک دلی لگاؤ پیدا ہوتا گیا۔ جو ظاہریت باہر دیکھتے تھے گھر پہنچ کر اس کے خلاف ردِ عمل کا سا جذبہ پیدا ہو جاتا تھا

میری تعلیم شروع سے مشن سکولوں۔ گورنمنٹ سکولوں۔ دربار ہائی سکول ٹونک اور قصور میں ۱۹۰۵ء میں ایم بی ہائی سکول میں ہوئی۔ ان تمام مدرسوں میں انگریزی تعلیم، انگریز کی برتری بلکہ اس کی پرستش کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مجھے یاد ہے قصور میں سکول شروع ہونے سے پہلے ہیڈ ماسٹر صاحب، اساتذہ اور سینئر جماعتوں کے لڑکے اکٹھے ہوتے تو یہ کورس CHORUS گایا کرتے تھے:

اقبال و بخت ہے بڑا برطانیہ ترا　　جھنڈا جہاں میں ہے گڑا برطانیہ ترا
چھلنی زمیں کو کر دیا گھوڑوں کی ٹاپ سے　　لشکر جہاں پہ جا پڑا برطانیہ ترا
پیتے ہیں گھونٹ زہر کے دشمن ترے سبھی　　لبریز جام شربت ہے برطانیہ ترا

اور

"یارب رہے سلامت فرمانروا ہمارا"

تو قریباً ہر مدرسہ میں وظیفہ کے طور پر دُہرایا جاتا تھا۔

دراصل انگریز کی پالیسی یہ تھی کہ جب ہندوستان کو بالجبر زیر کرنے کا عمل مکمل ہو جائے، تو ان کے ذہنوں کو بدل کر اور مغربی سانچہ میں ڈھال کر برطانیہ کا سکہ ان کے دلوں پر جاری کر دیا جائے۔ پہلے طاقت پھر مدرسہ کی تعلیم۔ تالیف قلوب کا یہ نسخہ عام طور پر بہت مؤثر رہا لیکن بعض زندہ دلوں نے اس کو قبول نہ کیا اور اس کا پول کھول دیا۔ اکبرؔ الہ آبادی نے برملا کہا:

توپ کھسکی، پروفیسر پہنچے　　جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

گھر کا ماحول میں کہہ چکا ہوں سادہ، اسلامی، کسی حد تک دیہاتی تھا۔ وسیع دسترخوان، سادہ غذا، مہمان نوازی۔ (یہاں تک کہ بعض میرے ہم جماعت ہمارے ہاں مہمانوں کی ریل پیل سے خیال کرتے کہ میں کسی ہوٹل میں رہتا ہوں) اقربا پروری۔ والد صاحب مرحوم اور والدہ صاحبہ مرحومہ کی بے پناہ شفقت و دینداری، ان کی مروّت و سخاوت، بھائیوں میں محبت اور سلوک، پھر مذہبی اقدار، اسلامی اخلاق کے عملی نمونے۔ بیشتر وقت پیش نظر رہتے۔ والد صاحب کے احباب کی محفلیں۔ علمی اور ادبی (اور ایک حد تک نیم سیاسی ہوتی تھیں۔) ہمیں بزرگوں میں بیٹھنے کا خاص موقعہ دیا جاتا تھا جس سے پند و نصائح سننے کا بہترین موقعہ میسر آتا۔ ان محفلوں میں دین سے لگاؤ۔ مذہب کی عظمت اور اسلام کی فضیلت کا وہ جذبہ پیدا ہوا جو ساری عمر نہ مٹ سکا۔

دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا　　(اکبرؔ الہ آبادی)

سکول میں انگریز کی برتری کا سبق تھا تو گھر میں اللہ کی بادشاہی اور برتری کی تلقین تھی۔ پھر حالیؒ کی مسدس کا ورد۔ اکبرؒ کے کلام کا تذکرہ۔ شبلی و ظفر علی خاں کے اشعار کا ذکر۔ غرضکہ گھر کا ماحول خود اسلامی ہونے کے علاوہ دردمندانِ اسلام کے کلام سے مہکا ہوا تھا۔

ہمارے ہاں ہی نہیں۔ کئی گھروں میں یہی دیکھا کہ انگریز کی بے انتہا مصنوعی کوشش کے باوجود اس سے عقیدت نہ بڑھی بلکہ ایک طرح کا ردِّ عمل شروع ہو گیا۔ ادھر ترکوں کی خلافت جو دسطوتِ اسلام کی آخری نشانی تھی اکو ہر حیلے بہانے اور جارحیت سے ختم کرنے کی کوشش کا ہندوستان کے مسلمان کے دل پر بہت بڑا اثر پڑا اور ان کا عمومی رجحان مغرب کے خلاف بڑھتا گیا۔

چونکہ اس وقت انگریز کی سیاست مغرب کے عزائم پر چھائی ہوئی تھی' اس لیے ہمارے دلوں میں خاص طور پر انگریز کے خلاف ایک خاموش شکایت پیدا ہونی شروع ہوئی جو اس کی کوششوں کے باوجود دب نہ سکی بلکہ بڑھتی گئی اور سارے مغرب کے متعلق ہمارا خیال پختہ ہو گیا کہ انگریزوں کی طرح وہ بھی عالمِ اسلام کے دشمن ہیں۔

جنگِ ترکی و اٹلی کے دوران ۱۲-۱۹۱۱ء میں محاذِ طرابلس میں فاطمہ بنت عبداللہ، گیارہ سالہ عرب لڑکی۔ عین اس وقت جبکہ وہ زخمیوں کو اپنے مشکیزہ سے پانی پلا رہی تھی ایک اطالوی درندے کی سنگین سے شہید ہوئی تو اقبالؒ نے لکھا تھا:

فاطمہ تو آبروئے ملّتِ مظلوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشتِ خاک کا معصوم ہے

کس قدر سوزت تجھے اے محورِ صحرائی ملی
غازیانِ ملّتِ بیضا کی سقائی ملی،

ایسی چنگاری بھی یا رب! اپنے خاکستر میں تھی
یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی

اپنے صحرا میں ابھی آہو بہت پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

یہاں یہ نکتہ قابلِ بیان ہے کہ لیبیا کے مردِ مجاہد کرنل قذافی کے رُونما ہونے سے نصف صدی پہلے ترجمانِ حقیقت نے فاطمہ کی شہادت پر پیش گوئی بھی کی تھی:

ہے کوئی ہنگامہ تیری تُربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں
جس کی تابانی میں اندازِ کہن بھی، نَو بھی ہے
اور تیرے کوکبِ تقدیر کا پرتَو بھی ہے

اقبال کے اشعار (فاطمہ کی شہادت کے متعلق) چھپتے ہی ہندوستان کے مُسلمان گھروں میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ کئی گھروں میں تو کھانا تک کسی نے نہ کھایا۔ اسلام کی بے بسی پر اور فرنگی بربریّت کے خلاف دلوں میں ایک شدید جذبہ پیدا ہوتا گیا جو انگریز کی ہندوستانی پالیسی کے متعلق مسلمانوں کے دلوں میں نفرت بڑھاتا چلا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستانی مسلمان کو نہ صرف اپنی طاقت ختم ہونے کا احساس شدید تر ہوتا گیا بلکہ عالمِ اسلام کے خلاف فرنگ کی ناپاک سازشوں کے متعلق بھی معلومات میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا۔

اسے یہ بھی معلوم ہُوا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد انگریز ہندوستانی مُسلمان کو عملی طور پر ختم کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ہندو (بنیا ذہنیت والے ہندو) کو سر چڑھایا جا رہا ہے۔ مُسلمان کو پسِ پُشت دھکیلا جا رہا ہے۔ ہندو کے پھلنے پھُولنے کے لیے حالات سازگار ہیں۔ مُسلمان بچارے کانٹوں میں اُلجھ کر رہ گئے:

سبزہ پاکر کرگئیں گائیں کلیل
اُونٹ کانٹوں پر لپکتے ہی رہے — اکبرؔ الٰہ آبادی

لیکن اللہ تعالیٰ کو اپنے حبیبؐ پاک کی اُمّت کا دھیان تھا۔ سرسید احمد خانؒ نے

ایم اے او کالج کی بنیاد ڈالی۔ تحریک علی گڑھ ALIGARH MOVEMENT کا آغاز ہوا سرسید کے رفقا، محسن الملک، شبلی نعمانی، حالی اور متعدد دیگر معروف ہستیوں نے پہلی بار مسلمانوں کے حوصلوں کو بڑھایا۔ اقبالؒ کے ترانۂ ملی نے تو ہر پڑھے لکھے ہندوستانی مسلمان کے دل میں گھر کر لیا، اور جب علی گڑھ کے ایک طالب علم نے اسے ریکارڈ کرایا تو وہ ریکارڈ ہر خواندہ مسلمان کے لیے شمعِ ہدایت بن گیا۔ لوگ ریکارڈ سُنتے اور سر دُھنتے تھے:

چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا
مُسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

دُنیا کے بُتکدوں میں پہلا وہ گھر خُدا کا
ہم اُس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
سَو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا

اے گلستانِ اُندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

اے ارضِ پاک تیری حُرمت پہ کٹ مرے ہم
ہے خوں تری رگوں میں ابتک رواں ہمارا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا

میری تجویز ہے کہ ترانۂ ملی پاکستان کے ہر سکول اور کالج میں دن شروع ہوتے وقت بطور کورس پڑھایا جائے۔

ملک میں پہلی بار فرنگ کے خلاف جذبہ کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے عزائم سے آگاہ رہنے کا خیال مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوا۔ اکبرالہ آبادیؒ اور مولانا ظفر علی خانؒ ان مفکرین کے پیش پیش تھے جنھوں نے ہندوؤں کی چالوں سے خبردار رہنے کا احساس دلایا۔

اُمورِ ملکی کی بحث میں تم بنو گے گر ہندوؤں کے ساتھی
نہ لاٹ صاحب خطاب دیں گے نہ راجاجی سے ملے گا ہاتھی

اکبرالہ آبادیؒ

کالج کا زمانہ

۱۹۱۲ء تا ۱۹۱۹ء

میں اس ساری فضا سے متاثر ہوتا ستمبر ۱۹۱۲ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں فرسٹ ایر FIRST YEAR میں داخل ہوا۔ ایک نہایت شفیق استاد جو انگریز تھے ، ہمارے پرنسپل تھے LT.COL. J. STEPHENSON اور کئی انگریز پروفیسر تھے جو اکثر وسیع القلب اور وسیع النظر تھے۔ انگریز تو وہ یقیناً تھے لیکن کالج کا ماحول آزادانہ تھا۔ گھٹا گھٹا نہ تھا۔ ایک عظیم استاد مرزا محمد سعید تھے جنھوں نے "خوابِ ہستی" اور "یاسمین" دو ناول لکھ کر ملکی شہرت حاصل کی تھی۔

کالج کی زندگی امنگوں اور یادوں کی زندگی ہے۔ ہر طرح سے اس زندگی میں بھرپور حصہ لیا۔ گورنمنٹ کالج میں کرکٹ کی فرسٹ ٹیم میں تو پہلے سال ہی لے لیا گیا تھا۔ تھرڈ ایر میں کرکٹ کلب کا سیکرٹری منتخب ہوا۔ جو ہمارے زمانہ میں کالج کا ایک اہم عہدہ ہوتا تھا۔ انگریزی میں اوّل انعام بھی حاصل کیا۔ بی۔ اے کے امتحان میں کالج میگزین "راوی" کا اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی بنا۔ ایک دفعہ پانچ روپے جرمانہ بھی ہوا۔ کالج کی ڈرامیٹک کلب کا (جو اُن دنوں بہت مقبول تھی) منیجر بھی رہا۔ غرضکہ ہر شعبہ میں خدا کے فضل سے نمایاں حصہ لیا۔

کالج میں پہلی بار کرکٹ کلب جاری کی۔ میں اُس کا کپتان تھا۔ یونیورسٹی کے مقابلہ میں ہم گورنمنٹ کالج لاہور سے بری طرح ہارے لیکن مجھے سونے کا تمغہ ملا کہ میرا ذاتی سکور ۴۰ تھا جب کہ باقی ساری ٹیم کا ۷ تھا۔

کالج میں داخل ہونے سے پہلے دہلی میں جارج پنجم کا دسمبر ۱۹۱۱ء والا دربار منعقد ہوچکا تھا اور پایۂ تخت کو کلکتہ سے دہلی منتقل کرنے کا اعلان ہوچکا تھا۔ انگریز کچھ تبدیل شدہ پالیسی کی امید دلا رہا تھا لیکن لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کی دوربین نظروں نے حقیقتِ حال کو بھانپ لیا۔ فرمایا:

قدم انگریز کلکتہ سے جو دہلی میں رکھتے ہیں!
تجارت خوب کی اب دیکھیں شاہی کیسے کرتے ہیں

پایۂ تخت دہلی میں منتقل ہونے کے اعلان کے ساتھ والدِ مرحوم دہلی میں آفیسر حصولِ اراضی کے عہدہ پر فائز ہوگئے۔ انھوں نے دارالسلطنت کی ضروریات کے لیے اراضی حاصل کرنی تھی۔ مجھے بھی ۱۹۱۲ء میں دہلی رہنے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر مختار احمد انصاری جو بعد میں مشہور کانگرسی لیڈر بنے اور پہلی جنگ عظیم میں ہندی مسلمانوں کی طرف سے ترک مجاہدین کی مدد کے لیے ایک طبی وفد لے کر ترکی گئے، ہمارے ہمسایہ تھے۔ مسیح الملک حکیم محمد اجمل خاں صاحب سے والدِ مرحوم کے کچھ اتنے قریبی اور دلی تعلقات تھوڑے عرصہ میں قائم ہوگئے کہ حکیم صاحب مرحوم و مغفور جیسے عدیم الفرصت شخص گرمیوں کے مہینوں میں عصر کے بعد اپنی شاندار فٹن گاڑی میں ہمارے ہاں آتے اور والد صاحب مرحوم کو لے کر باہر سیر کو جاتے۔ بعدِ نمازِ مغرب والد صاحب کو چھوڑ کر شہر میں اپنے دولت کدہ تشریف لے جاتے۔

انہی ایام میں میر باقر علی مرحوم "داستان گو" سے ملاقات ہوئی اور پہلی ہی ملاقات میں ہم ان کے اتنے گرویدہ ہوگئے کہ مبلغ ساٹھ روپے ماہوار کے مشاہرہ پر دو ماہ ہمیں داستانِ امیر حمزہؓ سنانے ہمارے گھر آتے رہے۔ کئی دن انھوں نے عرب کے متعلق بتایا پھر کئی دن عرب کے رؤسا کا ذکر رہا۔ پھر حضرتِ امیر کے کارناموں کا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک فلم دیکھ رہے ہیں جس میں معلومات کا خزانہ بھرا ہوا ہے۔ میر صاحب کی عمر اس وقت ساٹھ سال کے قریب تھی۔ پتلے دُبلے منحنی سے۔ لیکن جس وقت وہ شاہسواری یا پہلوانی یا جنگ میں

بہادری کا نقشہ کھینچے تو ایسے محسوس ہوتا کہ ایک جواں عمر جری اور دلیر جرنیل اپنی فوج کا حوصلہ بڑھا کر اُن کو فتح سے ہمکنار کرا رہا ہے ۔ وہ اعلیٰ درجے کی ایکٹنگ کرتے تھے اور معلومات کا تو وہ گویا انسائیکلو پیڈیا تھے ۔ گھوڑوں کی قسمیں بیان کرتے تو بیسیوں نسلیں گنا چھوڑتے تھے ۔ پھر ان کا رکھ رکھاؤ ۔ ان کی بیماریاں ، ان کا علاج ۔ علیٰ ھذا دیگر سامانِ حرب کا ذکر ۔ غرضکہ اس زمانہ کی جنگوں کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے تھے ۔

میر باقر علی آخری داستان گو تھے ۔ یہ معزز فن اُن کے انتقال کے ساتھ ختم ہو گیا ۔ دراصل داستان گو ، شاہی دور میں شاہزادوں ، شہزادیوں کے گھر یا انتظامیہ کے گُر ، حکمرانی کی صفات ، صلح و جنگ میں بادشاہوں کے اسلوب وغیرہ داستان کی صورت میں سکھاتے تھے کہ یہ تعلیم دنیائے عمل میں اُن کے کام آئے ۔ میر باقر علی ایک نادر ہستی تھے اور میری خوش قسمتی تھی کہ ان کے فن کا مظاہرہ دیکھ سکا ۔

یہی زمانہ تھا کہ مسٹر محمد علی بی ۔ اے (آکسن) یعنی مولانا محمد علی جوہر نے اپنا شہرۂ آفاق ہفتہ وار اخبار کامریڈ COMRADE دہلی سے نکالا ۔ جس نے اُس وقت کی سیاست میں تہلکہ مچا دیا ۔ مسٹر محمد علی کبھی کبھی ڈاکٹر انصاری کو ملنے آتے تو چونکہ ہماری کوٹھی دیوار بہ دیوار تھی ، اِس لیے کبھی کبھا اس عظیم انسان کی (دور سے ہی سہی) زیارت کا شرف حاصل ہو جاتا تھا ۔ مسٹر محمد علی ابھی کانگریس میں شریک نہ ہوئے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ برہمن کی ابلیسی چالوں کو اچھی طرح سمجھتے تھے ۔ وہ مسلمانوں کے حقوق کے بھی شدت سے طالب تھے ۔ مجھے یاد ہے کہ غالباً ۱۹۱۲ء میں ہی کامریڈ میں ایک کارٹون چھپا تھا ، جس میں ایک برہمن ماتھے پر قشقہ ، گلے میں زنار ، ہاتھ میں مالا ، پیپل کے درخت کے نیچے چبوترہ پر آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے اور ایک خاکروب بغل کے نیچے ٹوکری اور جھاڑو سنبھالے ایک پرچی اس کے حوالے کر رہا ہے اور برہمن کہہ رہا ہے :-

BROTHER, GIVE ME THY VOTE BUT AWAY-
-WITH THEE.

"اے میرے بھائی! اپنا ووٹ تو مجھے دے دو، لیکن آپ دور ہو جاؤ۔"

اچھوتوں کو ہندوؤں کے قریب لانے کی چال کی کیا خوبصورت پھبتی اڑائی گئی ہے، سبحان اللہ!

کالج کے ابتدائی زمانہ میں اردگرد کی فضا میں کچھ ارتعاش پیدا ہوا کہ اس سے متاثر نہ ہونا مشکل تھا۔ لسان العصر جن کے متعلق اقبالؔ نے ان کی وفات پر لکھا تھا:۔

گہے گریۂ او چو ابرِ بہارے
گہے خندۂ او چو تیغِ اصیلے

واقعات پر رواں دواں سبق آموز تبصرہ، مغربیت کے خلاف جہاد، اپنی اخلاقی قدروں اپنے طور طریقوں، اپنے رسم و رواج، اپنی مشرقی چیزوں سے محبت، مغربیت سے نفرت اور انگریزی غلامی کے خلاف ایک وعظِ مسلسل جاری رکھتے تھے:۔

ہر چند کہ ہے مِس کا لونڈر بھی بہت خوب
بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے

———— • ————

مرا ٹٹو زیادہ مشرقی ہے شیخ صاحب سے
کہ وہ موٹر پہ چڑھتے ہیں یہ موٹر سے بھڑکتا ہے

انگریزی حکومت کی برکتیں گنواتے ہوئے فرماتے ہیں اور کیا خوب فرماتے ہیں:۔

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں برٹش راج
کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں، اصول بھی ہے

اسی طرح اور "برکتوں" کا بیان ہوتا ہے لیکن اخیر میں وہ چوٹ لگائی جاتی ہے کہ یہ سب مبینہ برکتیں اپنے اصلی روپ میں ظاہر ہو جاتی ہیں:

جب اتنی نعمتیں ہم کو نصیب ہوں اکبرؔ — تو حرج کیا ہے جو ساتھ اسکے ذلّ و ذل بھی ہے

کالج جاتے ہی فضا میں کچھ اسی قسم کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ اِدھر اقبال ہر سال انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں "شکوہ" اور "جوابِ شکوہ" "خضرِ راہ" اور "طلوعِ اسلام" جیسی معنی خیز نظموں سے دل کو گرماتے اور مایوسی کے بدلے اُمید کا پُر نور تصور دکھاتے، اسلام کی عظمتِ رفتہ کی داستان سناتے اور آئندہ کے لیے امنگیں پیدا کرتے:

ظلمت آخر دور ہو گی جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

۳ راگست ۱۹۱۳ء کو کانپور کا حادثہ رونما ہوا۔ مچھلی بازار کی مسجد کے کچھ حصہ کو انگریزی حکومت کے کل پرزے، ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے سڑک کو چوڑا کرنے کے لیے شہید کرا دیا۔
مسلمان سینکڑوں سالوں کی حکومت کے مٹنے کا قلق دل سے دور کرنے کی کوشش تو کر سکتے تھے:

حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مُسَلّم سے کوئی چارہ (اقبالؒ)

اور راضی برضا ہو سکتے تھے لیکن اپنے پیارے مذہب کی توہین ہرگز ہرگز برداشت نہ کر سکتے تھے نا ممکن تھا کہ غیر ملکی عیسائی حاکم خانۂ خدا کو شہید کر دیں اور مسلمان خاموش تماشائی بنے رہیں۔ مولانا آزاد سبحانی کی کوشش سے ایک مجمع فوراً مسجد کو دوبارہ تعمیر کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ اس میں بچے بھی تھے، بوڑھے بھی تھے۔ انگریز حاکم نے گولی چلا دی۔ کئی معصوم بچے شہید ہوئے۔ کچھ بوڑھوں نے بھی جامِ شہادت نوش کیا۔ بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ مولانا شبلی نے اس حادثہ پر کہا:-

تعجب کیا جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں
کہ یہ بچے ہیں ان کو جلد سو جانے کی عادت ہے

پھر فرمایا:-

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جاکے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفلِ خوردہ سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر!
نیند آگئی ہے منتظرِ نفخِ صور ہیں
کچھ پیرِ کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک وخوں میں بھی ہمہ تن غرقِ نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم، آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں!

مولانا شبلی کی نظم اخبارات میں چھپی تھی کہ سارے ہندوستان کے گھروں میں کہرام مچ گیا۔ قریباً قریباً وہی حالت ہوئی جو فاطمہ بنتِ عبداللہ کی شہادت پر ہوئی تھی۔ ہر گھر میں صفِ ماتم بچھی ہوئی تھی۔ کئی گھروں میں کھانا نہ پکا۔ انگریز اور اس کی ظالم حکومت کے خلاف سخت نفرت پھیلی۔ ہندو یہ تماشا مزے سے دیکھتا رہا۔ مسلمان کے حق میں کسی ہندو نے آواز نہ اٹھائی۔

فضا ان جذبات سے معمور تھی کہ کالج میں داخل ہوتے ہی کلام حسرت موہانی پڑھنا شروع کیا۔ اس کے وہ حصے جہاں مولانا کے قیدِ فرنگ کی سختیاں جھیلنے کا تذکرہ ہے، بہت مؤثر ثابت ہوئے۔ مولانا کے خلوص اور ان کے بے ریا کلام نے دل موہ لیا۔ انگریز سے نفرت اور بڑھ گئی۔ گورنمنٹ کالج میں رہ کر انگریز استادوں کی تعلیم کے باوجود انگریز کی سیاست سے گہری نفرت دلوں میں جاگزیں ہوگئی۔

ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

جو چاہے سزا دے تو تم اور بھی کھل کھیلو
پر ہم سے قسم لے لو جو کی ہو شکایت بھی

———— • ————

درسِ حق جاری ہے یاں بھی حسرتِ آزاد کا
قید خانہ مدرسہ گویا ہے فیض آباد کا!

حسرت کا یہ کلام بہت پسند تھا اور اخبار "زمیندار" کے مقالے اور مولانا ظفر علی خان کی "باغیانہ" نظمیں (جن میں فرنگ اور انگریزی استبداد کے پرخچے اڑائے جاتے تھے اور جن کی وجہ سے وہ کئی سال جیل میں رہے) اکثر وردِ زبان رہتے۔

شیٹ کو یہ جا کے سنا دو کہ آج سے
نگنی کا ناچ ہم کو نچایا نہ جائے گا
اقصائے ہند میں علمِ حق ہوا بلند
یہ پرچم اب کسی سے گرایا نہ جائے گا

———— • ————

شہادت کی تمنا ہو تو انگریزی حکومت پر
کسی مجلس میں تو بھی نکتہ چینی برملا کر لے

———— • ————

فراہم کر د جنگ کا ساز و سامان
نصاریٰ پہ ہیبت کا سکہ بٹھاؤ

———— • ————

فرعون نے بچوں کو تہ تیغ کیا تھا!
پر آپ کا اندازِ قضا اور ہی کچھ ہے (مولانا ظفر علیخاں مرحوم)

کامریڈ COMRADE کے فوراً بعد اسی پیغام کو لے کر "ہمدرد" اردو زبان میں دہلی سے شائع ہونا شروع ہوا۔ اُدھر مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" کلکتہ سے نکلا۔ ان اخبارات نے ہندی مسلمان کے دل پر گہرا نقش چھوڑا۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اُس وقت یہ چاروں اخبار "کامریڈ" "ہمدرد"۔ "الہلال" اور "زمیندار" مقبولِ عام تھے۔

پاکستان میں یہ مقبولیت بہت عرصہ تک "نوائے وقت" لاہور کو حاصل رہی اور اب بھی ایک حد تک ہے۔

غرضکہ ہر طرف سے آزادی کے گیت، مسلمانوں کی حق تلفی کی شکایت، اُن پر مصائب کی بوچھاڑ کا شکوہ، مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کی امنگیں فضا میں کچھ اس طرح پھیلی ہوئی تھیں کہ ہماری نوجوان نسل اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ شاید ہی کوئی مسلمان نوجوان ہو جو بالکل بے پروا رہا ہو۔ جس طرح موسمِ بہار میں پھولوں کی مہک ہر کس وناکس کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، اسی طرح اس وقت کے ہندوستان میں نوجوان مسلم کے لیے ایک تازہ جامِ حیات پیش کیا جا رہا تھا۔ کسی نے تھوڑا پیا، کسی نے خم کے خم لنڈھائے۔ محروم کوئی نہ رہا۔

انگریز کی انتہائی کوشش کے باوجود مسلمانوں کے دلوں میں اس سے بیزاری بڑھتی جا رہی تھی۔ عین اس وقت جب کہ ہندوستانی مسلمان میں اضطراب بڑھتا جا رہا تھا اور انگریز کے خلاف شکایت زیادہ ہوتی جا رہی تھی، جولائی ۱۹۱۴ء میں موجودہ دنیا کی پہلی جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ یہ جنگ شروع تو ہوئی تھی مغربی طاقتوں کی رقابتوں کے نتیجہ کے طور پر، لیکن اس کے چھڑتے ہی عالمی سیاست کا نقشہ تیزی سے بدلنا شروع ہو گیا۔ خصوصاً مسلمان کے اقتدار کو، جو ترکیہ کی خلافت میں کسی حد تک قائم تھا، ختم کرنے کے ناپاک منصوبوں کو تکمیل دینے کا بہانہ بھی تلاش کر لیا گیا اور باقی مسلمان ممالک پر بھی تسلط جمانا شروع کر دیا گیا۔ ہندوستان میں اس مسلم کشی کی پالیسی کا شدید ردِعمل ہوا۔ ایران کی پسپائی پر اکبر بولے:

چناں بردند صبر از دل کہ قصے یاد آتے ہیں   تڑپ جاتا ہوں یہ سن کر کہ اب ایران جاتا ہے

سقوطِ بغداد پر حسرت روئے :

شاہِ جیلاں سے یہ حسرت عرض ہے اسلام کی
یوں نہ ہونا چاہیئے تھا فیصلہ بغداد کا

(بغداد جو کئی سو سال مسلمانوں کے شاندار دورِ عباسیہ کی درخشندہ یادگار تھا اور اس وقت کی دنیا کا دل سمجھا جاتا تھا، اب انگریز کے قبضہ میں تھا۔)

اور پھر جب فرنگ کی مکاری اور مسلم آزاری حد تک پہنچ گئی اور مسلمانوں نے کوئی بھی سبق نہ سیکھا تو حسرت جھلائے :

غضب ہے کہ پابندِ اغیار ہو کر
مسلمان رہ جائیں یوں خوار ہو کر !
سمجھتے ہیں سب اہلِ مغرب کی چالیں
مگر پھر بھی بیٹھے ہیں بیکار ہو کر

لیکن ہندی مسلمان کے پاس تھا کیا۔ جس سے یورپ (جس پر انگریز چھایا ہوا تھا) کا مقابلہ کرتا اور انگریز کی مسلم دشمنی کا مؤثر جواب دے سکتا۔

نہ لائسنس ہتھیار کا ہے، نہ زور
کہ ترکی کے دشمن سے جا کر لڑیں !
تہِ دل سے ہم کوستے ہیں مگر
کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

اس زمانہ میں لے دے کے افغانستان ہی ایک مسلم ملک رہ گیا تھا جس کو آزاد کہا جا سکتا تھا۔ "امیر صاحب کابل" کی مملکت ہندی مسلمان کو ملجا و ماوا نظر آتی تھی۔ چنانچہ کئی منچلے یہاں کے حالات سے دل برداشتہ ہو کر اوائل ۱۹۱۵ء میں کابل ہجرت کر گئے۔ ان میں کئی میرے ملنے والے تھے لیکن ایک میرے عزیز دوست تھے۔ میاں عبد الباری مرحوم (جو پاکستان بننے کے وقت

پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے) یہ پہلی ہجرت بالکل ناکام رہی۔ کئی نوجوان خواری کی حالت میں راہیٔ ملکِ عدم ہوئے۔ میاں عبدالباری گرفتار ہوئے۔ ہندوستان لائے گئے۔ کچھ مدت نظربند رہے بڑی مشکل سے رہائی ہوئی۔

میں نے اس ہجرت کا ذکر اس لیے کیا ہے کہ ہندی مسلمان کی انگریزوں سے بیزاری کا صحیح اندازہ ہو سکے۔

والد صاحب کی وفات

۲۵ جنوری ۱۹۱۶ء کو میری زندگی کا سب سے المناک حادثہ پیش آیا۔ والد صاحب مرحوم اچانک وفات پا گئے۔ وہ اس وقت جہلم میں اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ میں بھی سب سے پہلے جہلم تھا۔ اس وقت تاثرات نے دل پر گہرا نقش چھوڑا جس نے میری زندگی میں ایک ذہنی انقلاب پیدا کر دیا۔

۱۹۱۸ء کے قریب جب اتحادی طاقتوں نے ترکی کو ختم کر کے مسلمانوں کا قتلِ عام شروع کیا تو "الھلال" کلکتہ میں مولانا شبلی کی مشہور نظم "کب تک" شائع ہوئی اور شائع ہوتے ہی بحقِ سرکار انگلشیہ ضبط ہو گئی۔ لیکن ہم میں سے اکثروں نے ایک بار پڑھ لیتے ہی حفظ کر لی۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی!
دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا!
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے !!
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کا آشیاں کب تک
جو ہجرت کر کے بھی جائیں تو شبلیؔ اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام و نجد و قیرواں کب تک

(قیروان شمالی افریقہ کی سب سے بڑی اسلامی یونیورسٹی آج تک قائم ہے۔)

۱۱ نومبر ۱۹۱۹ء کو پہلی جنگِ عظیم کے عارضی صلح نامہ پر دستخط ہوئے۔ جنگ بند ہو گئی، لیکن انگریز اور اس کے حلیفوں نے مسلمان طاقتوں کو ختم کر دیا۔ ایک ایسا نازک وقت بھی اس جنگ میں آیا جب کہ پنجاب کے انگریز لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈوائر O'DEVYER نے یہاں کے چند مذہبی رہنماؤں سے فتویٰ حاصل کیا کہ نظر بہ حالات ہندی مسلمانوں کے لیے مکّہ پر گولہ باری جائز ہے (انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔) (شبلیؔ نے اپنی نظم میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا تھا۔ "حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں"۔

۱۹۱۹ء میں ہی جلیانوالہ باغ میں گولی چلی۔ انگریز جنرل ڈائر DYER نے کوئی ڈیڑھ سو کے قریب نہتے ہندوستانیوں کو ہلاک کر دیا جس سے سارے ملک میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔

اپریل ۱۹۱۹ء میں پنجاب کا پہلا (اور اصلی) مارشل لا رلگایا گیا۔ جس کے اٹھتے ہی ہنٹر کمیشن کا قیام عمل میں آیا کہ حادثہ جلیانوالا کے متعلق اور مارشل لا رکے نفاذ اور عمل کے متعلق رپورٹ کرے۔

دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس کا خاص اجلاس امرتسر میں ہوا۔ میں نے بھی جلسۂ عام دیکھا۔ دورانِ اجلاس مولانا محمد علی جوہر اور ان کے بھائی مولانا شوکت علی چھنڈواڑہ جیل سے عارضی رہائی حاصل کر کے امرتسر پہنچ گئے۔ اجلاس میں شریک ہوئے۔ جس پر اقبال نے اپنے وہ مشہور شعر ارشاد فرمائے، جو "علی برادران" کی عظمت کے مظہر ہیں:

ہے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند
مُشکِ اذفر چیز کیا ہے؟ اک لہو کی بُوند ہے
مُشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں فطرت مگر
کم ہیں وہ طائر جو ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپرِ زاغ و زغن در بندِ قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہیں کردہ اند

یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانانِ ہند اکثر اسلامی ملکوں کے مٹنے یا ان کے حصے بخرے ہوتے دیکھتے (خصوصاً خلافتِ ترکیہ کے ختم ہونے) سے سخت مضطرب تھے۔

انگریز کی بنائی ہوئی انڈین نیشنل کانگریس نے (جو ابھی تک انگریز سے مراعات حاصل کرنے کی جدوجہد کرتی رہی اور اس میں کئی چوٹی کے لیڈر بھی اس وقت شامل تھے۔) اسلامی دنیا کے سقوط پر یا خلافت کے مٹنے پر مگرمچھ کے روایتی آنسو بھی نہ بہائے لیکن جونہی علی برادران نے تحریکِ خلافت شروع کی تو گاندھی جی مہاراج نے سوچا کہ اب مسلمانوں کو اپنے ہمنوا بنانے کا اچھا موقع ہے۔ کانگریس اور خلافت نے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر انگریز کا ناطقہ بند کرنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کانگرس ایک روایتی مباحثہ گاہ تھی مگر علی برادران کی قربانیوں اور مسلمانوں کی خونی جدوجہد نے اس میں جان ڈال دی۔ "ہندو مسلم بھائی بھائی" کے نعرے بلند ہوئے۔

مسلم لیگ کا اس وقت تک کوئی فعّال وجود نہ تھا۔ وہ ۱۹۱۶ء میں لکھنؤ میں شروع ہوئی اور اسے کانگرس کے مقابلہ میں ایک رجعت پسندانہ جماعت سمجھا جاتا تھا۔

مسلمانوں کے چوٹی کے راہنما علی برادران، مسٹر محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد کانگرس

کے ممبر تھے۔ مسلمان میں سیاسی حس ضرور تھی، لیکن وہ بنیا برہمن ذہنیت سے کما حقہٗ واقف نہ تھا۔ باوجود اس بات کے کہ اوپر کے درجہ کے ہندو مسلم لیڈر مل کر بیٹھتے تھے لیکن اندر ہی اندر ہندو اپنا کام کیے جا رہا تھا۔ تحریکِ خلافت نے مسلمانوں کی مردہ رگوں میں ایک بار پھر زندگی کی لہر دوڑا دی۔ کانگرس نے ان کی (ظاہراً) بھرپور حمایت کی مگر اصل مقصد اپنی مطلب براری تھی۔ مسلمان کے ملکی و غیر ملکی عزائم سے کوئی دلی ہمدردی نہ تھی۔ تحریکِ خلافت کے زوروں پر عدمِ تعاون اور دوبارہ ہجرت کے مظاہرے زور پکڑ گئے۔ کئی ہندی مسلمانوں نے ترکِ وطن کیا۔ کئی جیلوں میں گلتے سڑتے رہے۔ گو تحریکِ خلافت خود (بوجوہات) کامیاب نہ ہو سکی۔ انڈین نیشنل کانگرس کو وہ ایک فعال ملکی تحریک کا علمبردار قرار دلوا گئی۔

منٹگمری میں وکالت کا زمانہ

۱۹۲۱ء تا ۱۹۴۷ء

مجھے نوکری سے ہمیشہ کچھ دوری سی رہی۔ ڈاکٹر بننا چاہتا تھا۔ لیکن ایک امتحانی داخلہ کی بروقت اطلاع نہ ملنے کی وجہ سے میڈیکل کالج میں داخل نہ ہوسکا۔

اُس زمانہ کے معیار کے مطابق مجھے بی۔ ایس۔ سی B.Sc. پاس کرتے ہی اچھی سے اچھی سرکاری ملازمت کے دعدے بھی ہوئے۔ خاصے اونچے درجے کی ملازمت کی پیشکش بھی ہوئی۔ لیکن گورنمنٹ اور مشن سکولوں میں پڑھا ہوا اور گورنمنٹ کالج لاہور میں پانچ سال گذارنے والا لڑکا (ان اثرات کے تحت جن کا پہلے ذکر کرچکا ہوں) سرکاری ملازمت پر تیار نہ ہوا۔ اور ڈاکٹر بننے کی بجائے بخوشی وکالت کی طرف رجوع کیا۔ ۱۹۱۹ء میں لاء کالج۔ لاہور سے ایل۔ ایل۔ بی کی ڈگری حاصل کرکے اپنے آبائی وطن گوجرانوالہ میں کام شروع کرنے کا ارادہ کیا۔ وہاں میرے سب سے بڑے بھائی راجا عنایت اللہ خان (آنریری مجسٹریٹ اور ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ) رہتے تھے۔ وہ بے حد شفیق انسان تھے۔ اپنے بھائیوں کے عاشق۔ انھوں نے میری ہر جائز خواہش کو پورا کیا۔ ان کی وجہ سے مجھے بڑا حوصلہ تھا۔ لیکن مجھے ایک عصبی درد کی وجہ سے وہاں کی مرطوب آب و ہوا موافق نہ آئی۔ فیصلہ کیا کہ منٹگمری (حال ساہیوال) میں جہاں موسم گرم و خشک ہے اور ویسے بھی نئی آبادی ہے۔ کام شروع کیا جائے۔ اس کے واسطے کچھ عرصہ کسی راہبر وکیل کے زیرِ تربیت رہ کر کام سیکھا جائے۔ چنانچہ سات آٹھ ماہ سرگودھا میں اپنے نہایت ہی واجب

الاحترام پرانے محب دحسن کے ساتھ خاندانی تعلقات اس خلوص کے تھے کہ میں ان کو اپنا بڑا بھائی تصور کرتا تھا۔) شیخ عبدالغنی صاحب (علیگ) مرحوم جو اس وقت سرگودھا کے چوٹی کے وکیل شمار کیے جاتے تھے اور مسلمان وکلاء کے مسلمہ لیڈر تھے۔ ان کے ہاں کام سیکھنا شروع کیا۔ کام تو کیا سیکھنا تھا۔ ملک فیروز خان نون سے جو انھی دنوں بیرسٹر ہوتے تھے اور وطن واپس آئے تھے، گہری رفاقت ہوگئی جو قریباً قریباً ساری عمر قائم رہی اور چند ایک احباب بھی ایک مجمع کی صورت میں اکثر کھیل، شکار اور دعوتوں میں وقت گذارتے۔ وکالت کے دھندے کا اللہ حافظ۔ (ضمناً ذکر کردوں کہ ملک فیروز خان نون بعد میں ریپبلکن پارٹی میں شامل ہوکر پاکستان کے وزیر اعظم بنے۔ اس وقت مجھے سید ہادی علی شاہ صاحب سابق میئر MAYOR لاہور کی معرفت پیغام بھیجا کہ اگر میں مسلم لیگ کو چھوڑ کر ریپبلکن پارٹی میں شامل ہو جاؤں تو مجھے پاکستان کا وزیر خارجہ مقرر کیا جائے گا۔ میں نے سختی سے انکار کیا جس کی وجہ سے ملک صاحب سے میرے پرانے ذاتی تعلقات میں کچھ فرق آیا۔ میدان سیاست میں ان کے ساتھ تعاون نہ کیا بلکہ ایک حد تک ان کی مخالفت کی۔) خیر سرگودھا کے قیام میں اچھی اور صاف ستھری وکالت کے اصول اپنے شفیق بھائی اور استاد سے سیکھے جو ساری عمر میرے لیے مشعلِ راہ بنے۔ میں اپنے مرحوم بھائی کا یہ احسان ساری عمر نہ بھول سکوں گا۔

اپریل ۱۹۲۱ء میں منٹگمری میں وکالت کا کام باضابطہ شروع کیا۔ وہاں میرے بڑے بھائی بشیر احمد (مرحوم) زمینداری کرتے تھے۔ جس محبت سے انھوں نے میری سرپرستی کی، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ ایسے بھائی دنیا میں کم ہوتے ہیں (میرے یہ بھائی پاکستان بننے پر اس کی ملکی ریڈ کراس کے سیکرٹری جنرل مقرر ہوئے اور بین الاقوامی شہرت حاصل کی۔)

میں شگونوں کا قائل ہوتا تو کبھی وکالت شروع نہ کرتا۔ جس دن ENROLE

ہونے عدالت میں گیا۔ دو آدمی برآمدے میں بیٹھے باتیں کر رہے۔ ایک بولا "یار اتنی وبا پھیلی، اتنی بیماریاں آئیں۔ یہ وکیل کم بخت نہ مرے"۔

جس دن ADMIT ہونے گیا۔ احاطۂ عدالت میں یہ خوشخبری سنی دچند آدمی آپس میں گفتگو کر رہے تھے "بھائی صاحب میری بات یاد رکھنا۔ وکیلوں کا بھی تانگہ والوں جیسا ریٹ ہو جائے گا۔ پہلے گھنٹہ کا ۶ آنے دوسرے گھنٹہ کا ۴ آنے" (اس زمانہ میں لاہور کے تانگہ والوں کا یہی ریٹ تھا)

اب یہ وہ زمانہ تھا جب ہندو مسلمانوں کی سیاسی دوستی میں شگاف پڑنے شروع ہو گئے۔ مسلمان اہل دانش اور مفکرین، جن میں حکیم الامت پیش پیش تھے، کانگرس کی شاطرانہ چالوں سے مسلمانوں کو آگاہ کرنے لگے۔ خود مولانا محمد علی جوہر نے جو کانگرس کے کوکناڈا سالانہ اجلاس کے صدر رہ چکے تھے۔ ایک دو سال بعد یو۔پی کے کسی شہر میں (مجھے اب صحیح نام یاد نہیں) ایک جلسۂ عام میں گرج کر اعلان کیا "میں ایک فاسق و فاجر کلمہ گو (مسلمان) کو اچھے سے اچھے ہندو پر ترجیح دیتا ہوں"۔

مولانا ظفر علی خان کانگرس چھوڑ کر اس کی مخالفت پر تل گئے۔ منٹگمری میں وکالت شروع کرتے ہی میری ملاقات چودھری قائم علی صاحب سے ہوئی۔ جو امر ناگزیر تھا۔ کہ وہ سرکار کی طرف سے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر PROSECUTING INSPECTOR تھے۔ اور میں فوجداری مقدمات میں ملزم کی طرف سے پیش ہوتا تھا۔ ملاقات جلدی گہری دوستی میں تبدیل ہو گئی کہ باوجود محکمہ پولیس کی ملازمت کے چودھری صاحب کا ذوق علمی وادبی تھا۔ اگرچہ حضرت اکبر نے ایک دفعہ فرمایا تھا۔

بیاض شعر سے مطلب نہیں کلرکوں کو!

رجسٹروں کو ہی کرتے ہیں وہ سیاہ فقط

لیکن چودھری صاحب کو شعر سے بڑا لگاؤ تھا اور حضرت اکبرؒ کے اشعار تو

(میری طرح) ان کے نوکِ بزبان رہتے ۔ تنباکو ہمیشہ کوٹ کی جیب میں کھلا رکھتے (اکبر نے کہا تھا۔ن تنباکو بیں ہے کیوں میم سے لکھتے ہیں لوگ) کام سے فارغ ہوئے مجھے اپنے دفتر بلالیا کرم دین اردلی کو کوٹ کی جیب سے تنباکو دیا، کہ حقہ تازہ کرو۔ میں پہلے عرض کرچکا ہوں کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندو اور مسلمان میں تشکوک پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے ۔ پنڈت مدن موہن مالوی اور مولانا شوکت علی نے ایک دوسرے کے خلاف بیان دیئے تھے ۔ حضرت اکبرؔ نے اس پر لکھا۔

جو ہیں مالوی اور شوکت میاں۔ لگے کرنے آپس میں سرگوشیاں

وہ بولے کہ ہندو کا ہوگا جو رول RULE
ہم انگریز ہی کو کریں گے قبول
یہ بولے کہ کابل سے ہوگا گزند
ہم انگریز ہی کو کریں گے پسند!
جدا جب ہوئے اور ملے بزم میں
تو پایا گیا یہ دلی عزم میں!
نہ تھا اس سے آپس میں کچھ ان کے رنج
لگے ہو کے کہنے وہ یوں بذلہ سنج
کریما بہ بخشائے برحالِ ما
کہ ہستیم اسیرِ کمندِ ہوا!

ہم نے یہ برجستہ اور تازہ ترین اشعار چودھری قائم علی صاحب کو سنائے انھوں نے بہت پسند کیے ۔

کوئی چھ سات دن بعد کرم دین کی معرفت مجھے بلایا۔ کہنے لگے۔ میں نے حضرت اکبر کے اشعار پر گرہ لگانے کی جسارت کی ہے ۔

میں نے کہا فرمایئے۔

بولے۔

جو پنڈت کے ہوں ایسے ایسے خیال
تو عدمِ تعاون کی کس کو مجال
جو خائف ہوں اس بات سے مالوی
تو سیتا گرہ کی قلعی کھل گئی!
امیدِ سوا راج جاتی رہی
یونہی عقل چکر سا کھاتی رہی
وہ تھا جوشِ خون اس کو ٹھنڈا کرو
چلو چل کے انگریز سے یوں کہو!
نداریم غیر از تو فریاد رس!
توئی عاصیاں را خطا بخش و بس!

میں نے یہ سارا واقعہ حضرت اکبرؒ کو لکھ بھیجا۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا "آپ کے دوست نے میرے خیال کی تکمیل کر دی ہے۔" میں نے وہ خط چودھری صاحب کو دکھایا۔ بہت خوش ہوئے۔ یہ خط اب بھی میرے پاس موجود ہے۔

۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی کا انتقال ہوا۔ اقبال انھیں اپنا پیر و مرشد کہا کرتے تھے۔ مجھے ان سے بے پناہ عقیدت تھی (ان کے چند خطوط اب بھی میرے پاس ہیں اور میری متاعِ عزیز ہیں۔)

اقبال نے مرثیہ لکھا۔

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر
حیاتش بحق بود روشن دلیلے!

گہے گریۂ او چو ابرِ بہارے
گہے خندۂ او چو تیغ اصیلے
سرزدہ طورِ معنے کلیمے!
بہ بت خانۂ دورِ حاضر خلیلے
زدہ لبہا بہ آئندۂ لات و عزّٰی
بہ جان ہا کشایندہ سلسبیلے
دماغش ادب موزدہ عشق و مستی
دلش پرورش دادۂ جبرئیلے

یہ اشعار میں نے خود کلامِ اقبال میں چھپے ہوئے پڑھے۔ جب وہ ابتدا میں شائع ہوا۔ بعد کی اشاعت میں (نہ معلوم کس مصلحت سے) انھیں حذف کردیا گیا۔

مجھ پر خاص طور پر اکبر کے کلام اور پیغام کا بہت زیادہ اثر ہوا۔ مغربیت سے بیزاری۔ انگریز کی سیاست سے نفرت۔ مشرقی اور اسلامی اقدار سے محبت۔ اسلام اور عالمِ اسلام کے مسائل میں دلچسپی۔ اخلاقیات سے لگاؤ۔ یہ سب حضرت اکبر کے پاکیزہ کلام کے پیغام کا نتیجہ ہیں۔

میں حالیؒ۔ شبلیؒ۔ اکبرؒ کو ان بلڈوزرز BULLDOZERS سے تشبیہ دیا کرتا ہوں۔ جنھوں نے ہمارے ذہنوں کو ہموار کیا۔ ان کی اونچ نیچ درست کی۔ اگر یہ تینوں بزرگ نہ ہوتے تو ہم اقبال کے پیغام کو کبھی نہ سمجھ سکتے اور قائداعظم کی بات تک سننے کے لیے تیار نہ ہوتے۔

پاکستان کے اوّلین معماروں میں جہاں سرسیدؒ اور ان کے عظیم رفقاء کا نام زندۂ جاوید رہے گا۔ وہیں ہمارے ذہنوں اور دلوں کو اسلامیانِ ہند کے صحیح نصب العین کے لیے تیار کرنے والوں خصوصاً حالی، شبلی، اکبر کا نام بھی ہمیشہ تابندہ رہے گا۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ آج اس پاکستان میں جس کے ابتدائی تصور میں ان بزرگوں

نے ہماری رہنمائی کی۔ ان کے نام سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ان کے پیغام سے آشنائی تو اونچا مرحلہ ہے۔

تنزل پذیر قوموں کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے محسنوں کو بھلا دیتی ہیں۔ اور مجھے یہ کہنے میں باک نہیں ہے کہ یہ علامت ہم میں پائی جاتی ہے۔

میرے وکالت شروع کرنے کے جلد ہی بعد مسلم لیگ کا نام مسلمانوں کے مجمعوں میں کثرت سے لیا جانا شروع ہوا۔ لیکن چونکہ کانگرس کے مقابلہ میں یہ کوئی فعال جماعت نہ تھی، اس لیے مسلمانوں کے بیشتر پڑھے لکھے طبقے نے (جو ہندوؤں کی سابقہ تاریخ اور روایات کو مدنظر رکھتے ہوئے۔ ان کی جماعت (کانگرس) میں شامل نہ ہونا چاہتا تھا۔ لیکن تھے وہ سب کام کرنے والے لوگ اس لیے نچلے بھی نہیں بیٹھ سکتے تھے) تعلیمی میدان میں کام کرنا شروع کیا کہ تعلیم اور سیاست کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ فی الحال مسلمانوں کی تعلیمی حالت بہتر ہو جائے تو کسی وقت میں وہ سیاسی معاملات میں بھی شعور کے ساتھ حصہ لے سکتے ہیں۔

میاں سر فضل حسین مرحوم وزیر تعلیم پنجاب کی تحریک اور خان بہادر ملک زمان مہدی خاں ڈپٹی کمشنر منٹگمری کی معاونت سے اکتوبر ۱۹۲۳ء میں دوسری پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے منٹگمری میں انعقاد کا بندوبست کیا۔ میں مجلس استقبالیہ کا آنریری سیکرٹری تھا۔ سیکرٹری کیا تھا۔ کرتا دھرتا تھا۔ ۵ ماہ کے لیے نئی نئی وکالت کو خیرباد کہا۔ گرمیوں میں گاؤں گاؤں پھرا۔ چندہ اکٹھا کیا۔ تعلیم خصوصاً تعلیم اسلامی و تعلیم فنی کی اہمیت پر مضامین لکھے۔ تقریریں کیں اور خدا کا شکر ہے کہ اس ساری تگ و دو میں کافی کامیابی ہوئی۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (مرحوم) کو جو انڈیا کونسل کے ممبر تھے۔ لندن سے شمولیت کے لیے بلوایا۔ ایک جوشیلے مقرر نے کانفرنس کے اجلاس عام میں تقریر کرتے ہوئے بدحواسی سے "آفتابہ" صاحبزاد احمد خاں کی شمولیت پر خاص خوشی

کا اظہار کیا۔ یار لوگوں میں "آفتابہ" صاحب کی اصطلاح کئی دن دلچسپ مزاح کا سامان بنی رہی۔

چودھری سر شہاب الدین سپیکر پنجاب اسمبلی کی باغ و بہار شخصیت صدارت کانفرنس کی رونق و وقار کا باعث بنی۔

مسٹر فریڈرک پکل (جو بعد میں سر فریڈرک پکل ہو کر گورنمنٹ آف انڈیا میں سیکرٹری مقرر ہوئے) کانفرنس کے دنوں میں ضلع کے COLONIZATION OFFICER آفیسر آبادکاری تھے۔ نئی زمینیں دینے۔ نمبردار۔ ذیلدار بنانے کے وہ ذمہ دار تھے۔ ڈپٹی کمشنر محض ایک انتظامی آفیسر تھا۔ میں نے مسٹر پکل سے رابطہ قائم کیا۔ وہ مجھے جانتے تھے۔ میں نے کانفرنس کی غرض وغایت بیان کی۔ بتایا کہ ضلع کی ۶۰ فیصدی آبادی مسلمان ہے ہم حکومت کی کوششوں میں تعلیمی میدان میں اس کا ہاتھ بٹانا چاہتے ہیں۔ کوئی مستقل ادارہ قائم کر کے سکول بنانے یا وظائف کا انتظام کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت کی سرپرستی ہماری کوشش کو حاصل ہے۔ مسٹر پکل نے کہا: "میں کیا کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا ہمیں سرمایہ کی سخت ضرورت ہے۔ اگر آپ اپنے افسران کو ہدایت کر سکتے ہیں کہ وہ ہمیں مالی امداد دینے میں تعاون کریں تو ہماری تحریک کو بڑی تقویت حاصل ہوگی۔

مسٹر پکل نے ایک ۳" × ۹" کی چٹ CHIT اپنے آفس RACK میں سے اٹھائی۔ پانچ چھ سطریں لکھیں اور چٹ مجھے دے کر کہا کہ کیا یہ فائدہ مند رہے گی؟ میں نے پڑھا تو ایسا محسوس ہوا کہ میری کرسی چھت سے جا لگی ہے۔ صاحب بہادر نے انگریزی میں لکھا تھا۔ جس کا مطلب تھا۔ چودھری نذیر احمد خاں سیکرٹری مجلس استقبالیہ پنجاب ایجوکیشنل کانفرنس نے مجھے اس کے اغراض و مقاصد بتائے جن سے مجھے ہمدردی ہے۔ وزیر تعلیم اس کے سرپرست ہیں۔ یہ ایک مفید اقدام ہے۔ میں خوش ہونگا اگر

محکمہ آبادی کے تمام آفیسر اس کانفرنس کی مالی امداد میں حصہ لیں گے۔

میں نے اپنے جذبات کو قابو میں کرتے ہوئے مسٹر کپل کا گرمجوشی سے شکریہ ادا کیا۔

اس چیٹ سے ہمیں بائیس ۲۲ ہزار روپیہ وصول ہوا۔ بے ساختہ حضرت اکبر الہ آبادی کا شعر یاد آگیا۔

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا!

کانفرنس کے موقعہ پر کل بیالیس ہزار روپیہ جمع ہوا۔ جو آج تک آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے کسی اجلاس میں بھی نہ ہوا۔ پنجاب کے قریباً قریباً تمام اضلاع سے مندوبین شامل ہوئے اور اس کانفرنس کو ہر لحاظ سے اس وقت تک کی سب سے زیادہ کامیاب کانفرنس قرار دیا گیا۔

دو ہزار کے قریب کانفرنس کے انتظام پر خرچ ہوا۔ دس ہزار پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (لاہور) کو دیا۔ باقی تیس ہزار کے سرمایہ سے میرے محترم دوست آغا عطاء اللہ خاں اسسٹنٹ رجسٹرار کوآپریٹیو سوسائیٹیز منٹگمری کے مشورہ اور ڈپٹی کمشنر صاحب اور استقبالیہ کمیٹی کی اجازت سے "مسلم کوآپریٹیو ایجوکیشنل ایسوسی ایشن لمیٹڈ" کی بنیاد رکھی جو ہندوستان بھر میں اپنی قسم کی پہلی انجمن تھی (بعد میں ہندوستان کے اکثر صوبوں میں اس قسم کی انجمنیں بنیں) ہماری انجمن نے سینکڑوں مسلمان نوجوانوں کو تعلیم کے لیے (آج تک) لاکھوں روپیہ قرض دیا ہے۔ ایک ہائی سکول بنایا جو ماشاء اللہ آج تک قائم ہے۔

میں قریباً ۲۰ سال اس کا اعزازی سیکرٹری رہا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب سائمن SIMON کمشن ہندوستان آیا تھا۔ ہم نے ان کی سپیشل ٹرین منٹگمری کے اسٹیشن پر رکواکر ان کو مخلوط انتخابات کے خلاف اور جداگانہ

انتخابات کے حق میں میمورنڈم پیش کیا۔

۲۸ مارچ ۱۹۳۴ء میری شادی حمیدہ خانم سے ہوئی جو مولوی غلام محی الدین صاحب ایڈووکیٹ جو اس وقت انجمن حمایت اسلام کے سیکرٹری تھے اور بعد میں صدر بنے، کی بڑی صاحبزادی تھیں۔ میری زندگی کا یہ ایک اہم ترین اور سب سے زیادہ خوشیوں والا دن تھا کہ اس دن مجھے ایسی نیک صفات والی رفیقۂ حیات مل گئی، جنھوں نے میری آئندہ زندگی پر بہت اچھا اور گہرا اثر ڈالا۔ حمیدہ ماشاءاللہ نہایت راسخ الاعتقاد، دریا دل، باعمل، دردمند اور ہمدرد مسلمان خاتون ہیں۔ جنھوں نے ساری عمر نہایت خاموشی سے حاجت مندوں کی خدمت کی ہے۔ اپنے لیے کچھ نہیں بنایا۔ دوسروں پر خرچ کیا۔ سفر زندگی میں ہمیشہ میری راہبری کی ہے۔ مبارک ہے وہ قوم جس میں اس بلند پایہ کردار کی ہستیاں موجود ہیں۔ حمیدہ میری زندگی میں ہمیشہ ایک مشعل کا کام دیتی رہیں۔ میں جہاں کہیں دنیا کے سفر کو گیا ان کو ساتھ لے گیا۔ ان کی رفاقت میرے لیے حسین ترین یادوں کا مرکز رہی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ جو کچھ میں کر سکا ہوں وہ محض اللہ تعالیٰ کی مہربانی ہے اور حمیدہ کا نیک مشورہ۔

میری شادی کے موقعہ پر ان کی ایک سہیلی نے بڑا خوبصورت سجع لکھا۔

اِدھر تو محمد نذیر آئے بن کر اُدھر پایا خالق سے خُلقِ حمیدہ

ہمارے ایک محترم دوست قاضی محمد اسحاق صاحب انسپکٹر آف سکولز جموں و کشمیر نے (جو شادی میں شامل نہ ہو سکے) فارسی میں قطعہ لکھا۔

زہے سعادت وظفرے کہ چوں زگنجی بار
نذیر رفت بہ لاہور قافلہ سالار!
مرا بشیرؓ بشیرے بہ کشورِ کشمیر
کہ از عنایتِ ایزد مراد شد بکنار

(۱) میرے بڑے بھائی صاحب ظفر حسین خاں۔
(۲) علاقہ منٹگمری کا پرانا نام گنجی بار ہے۔
(۳) برات منٹگمری کے ایک گاؤں سے لاہور گئی تھی۔
(۴) میرے بڑے بھائی بشیر احمد خاں۔
(۵) میرے سب سے بڑے بھائی عنایت اللہ خاں۔

میرے پھوپھا جی چوہدری عبدالحمید خاں ڈپٹی رجسٹرار کوآپریٹو سوسائیٹیز نے ایک دلکش سہرا لکھا۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

دھوم اوصافِ حمیدہ کی تیری سُن کے نذیر
قاف میں پریاں ہیں بے تاب کہ گائیں سہرا

جیسا کہ میں اشارہ کر چکا ہوں، اس زمانے میں مسلمانوں کا نصب العین یہ تھا کہ ہندوؤں کی اکثریت کی آمریت سے بچا جائے۔ انگریز کو تو ہم دیر سے ناپسند کرتے تھے کہ اس نے ہماری سلطنت چھینی۔ ہمارا اقتدار چھینا۔ ہندو کو آگے کیا اور ہمیں پیچھے دھکیلا۔ باوجود اس کے کچھ وقت ہندو اور مسلمان بھائی بھائی بنے۔ لیکن اب ہندو مسلم اتحاد جو تحریک خلافت کے دوران بلند ہوا تھا۔ کافی دھیما پڑ چکا تھا۔ مسلمان کو سمجھ آنے لگی تھی کہ ہندو قوم مسلمان کو آلہ کار بنا رہی ہے۔ تاکہ اقتدار میں جو حصہ ان کو ملے، اس کے بل بوتے پر مسلمان اقلیت پر (کئی سو سال کی مسلم حکومت کے بعد بھی ہندو اکثریت میں تھے جو اس بات کی زندہ دلیل ہے کہ ہندوستان میں اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا) حکمرانی کر سکیں۔ تجارت۔ صنعت و حرفت۔ اعلیٰ ملازمتیں۔ وکالت۔ ڈاکٹری بیرون ملک تعلقات غرضکہ ہر بات میں ہندو مسلمان سے بہت آگے تھے۔ ان کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ مسلمان نے ان پر سینکڑوں سال حکمرانی کی ہے۔

وہ پراچین بھارت کے خواب دیکھ رہے تھے۔ جب برما سے غزنی و قندھار

تک ہندو کا اقتدار تھا۔ قدرتی بات ہے کہ اس وقت کے سمجھ دار مسلمان کو اس پس منظر کا کافی طور پر احساس تھا۔ اس لیے کانگرس کا ملمع عام تعلیم یافتہ مسلمان کی بھاری اکثریت پر نہ چڑھ سکا۔

شادی سے پہلے میں اکثر رسالوں میں مضامین لکھتا تھا اور نہ معلوم کیوں اپنا نام نہیں لکھتا تھا۔ بعض "آوارہ و مجنوں نے رسوا سر بازارے" لکھا کرتا تھا اور اس نام سے "زمانہ" (کانپور) تمدن (دہلی) مخزن (لاہور) شباب اردو (لاہور) وغیرہ رسالوں میں اسی نام سے مشہور تھا۔

ایک سال (اب مجھے یاد نہیں کہ کون سا سال تھا) آل انڈیا پوسٹ مین کانفرنس منٹگمری میں منعقد ہوئی ــــ مجھے بھی تقریر کی دعوت دی گئی۔ میں نے پوسٹمینوں کے جلسہ میں یہ لطیفہ (جو صحیح واقعہ ہے) سنایا "میرے بڑے بھائی صاحب نے سکھر سے مجھے خط لکھا کہ ہم لاہور جا رہے ہیں۔ ایک روز آپ کے پاس قیام کریں گے اور فلاں وقت پہنچیں گے۔ خط پر پتہ لکھا تھا "آوارہ و مجنوں نے رسوا سر بازارے" وکیل منٹگمری یہ خط مجھے فوراً مل گیا۔ بھائی صاحب کو اسٹیشن پر لینے گیا تو کہنے لگے میرا خط مل گیا تھا۔ میں نے کہا۔ جی۔ کہنے لگے تو پھر ڈاک والوں کے حسن انتظام کا اعتراف کرنا چاہیئے میں نے کہا ضرور کرتا۔ اگر آپ نے وکیل کا لفظ نہ لکھا ہوتا اور پھر بھی یہ خط مجھے مل جاتا۔ بھائی صاحب کہنے لگے مجھے اس کا خیال تو آیا۔ لیکن میں نے کہا اگر میں نے صرف آوارہ و مجنوں نے رسوا سر بازارے۔ منٹگمری لکھا ہوتا تو ڈاکیہ یہ سمجھتا کہ یہ خط اس کے نام ہے۔ کیونکہ اس سے بڑھ کر اور آوارہ و مجنوں نے رسوا سر بازارے کون ہوتا ہے۔ ڈاکیوں کی کانفرنس میں مجھے یاد ہے یہ لطیفہ بہت ہی پسند کیا گیا۔

۱۹۲۹ء میں میں نے پھر منٹگمری میں پنجاب مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد کرایا۔ اس دفعہ سر راس مسعود۔ سر سید کے پوتے (جو اس وقت علی گڑھ کے وائس چانسلر تھے)

کو خاص طور پر شمولیت کی دعوت دی۔ دعوت کیا دی۔ ایک پر لطف داستان کی بنیاد رکھی گئی۔ دعوت نامہ کے جواب میں ان کے سیکریٹری کا رسمی خط شکریئے کا موصول ہوا کہ سر راس مسعود یونیورسٹی سائنس کالج کے لیے چندہ جمع کرنے جنوبی ہندوستان کا دورہ مقرر کر چکے ہیں، معذرت کرتے ہیں۔ میں اس بات پر تلا ہوا تھا کہ راس مسعود ضرور آئیں۔ قصہ مختصر یہ کہ دو ماہ کی طویل خط و کتابت ہوئی۔ تاریں دیں۔ مضامین لکھے۔ التجائیں کیں۔ لیکن بے سود (سر راس مسعود کا اپنا پہلا خط بھی "ڈیر سر" سے شروع ہوا تھا) یہ واقعہ لکھتے لکھتے اکبر الہ آبادی کا شعر یاد آگیا۔

غیر کو نامہ میں وہ مائی ڈیر لکھتے ہیں
مجھ سے بیگانہ وشی ہے جو ڈیر سر لکھا

قصہ مختصر کہ دعوت ناموں کے ایک اور دور کے بعد تیسرے مہینہ آخر سر راس مسعود کا خط آہی گیا۔ "مائی ڈیر برادر" میں آرہا ہوں اور اپنے ساتھ ۱۲ مہمانوں کی ٹیم لا رہا ہوں۔ ملک زمان مہدی خان جو اس وقت رہتک میں ڈپٹی کمشنر تھے۔ ان کو بھی ساتھ لا رہا ہوں۔

سر راس مسعود اور ان کے معزز رفقاء کی شمولیت کے خیال سے ہماری دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔ حوصلے بڑھ گئے۔ معززین ضلع کی استقبالیہ کمیٹی (جس کا میں اب کی بار بھی آنریری سیکریٹری تھا) ریلوے سٹیشن پر استقبال کے واسطے قطار باندھے کھڑی تھی۔ ٹرین پہنچی۔ اب جو سین SCENE ہوا وہ قابل ذکر ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

جونہی ٹرین کھڑی ہوئی۔ ملک زمان مہدی خان سب سے پہلے اترے، پھر سر راس مسعود۔ میں آگے بڑھا۔ ملک صاحب نے تعارف کرایا۔ "یہ چوہدری نذیر احمد خان خان ہیں۔ سر راس مسعود مجھ سے بھی قد آور تھے اور قوی ہیکل (ان کا قد بلاشبہ چھ فٹ سے زیادہ تھا) بجائے السلام علیکم یا ہاتھ ملانے کے انھوں نے مجھے سر سے پیر تک

دیکھا اور صرف یہ کہا "لاحول ولا قوۃ۔ یعنی آپ ہیں نذیر احمد۔ لاحول ولا قوۃ۔ اب ادھر میں حیران کہ مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے یا کیا ظاہری کمی ہے جو اس موقعہ پر لاحول پڑھی جارہی ہے جب کہ میں اور دیگر ممبران استقبالیہ کمیٹی پرخلوص استقبال کے لیے حاضر ہیں۔

راس مسعود صاحب نے پھر میری طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ انھیں بات پسند نہیں آئی۔ ملک زمان مہدی خان کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔

"ارے زمان ہمارے ساتھ دھوکا ہوگیا۔ یہ ہیں نذیر احمد۔ لاحول ولا قوۃ اتنا کہہ کر راس مسعود صاحب مجھ سے لپٹ گئے اور اس طرح بغلگیر ہو کر بھینچا کہ مشکل سے میں نے چیخ کو روکا۔ مجھ سے جدا ہوئے تو فرمانے لگے۔ ارے میں نے تو سمجھا تھا کہ تو کوئی بہت بڑا روحانی بزرگ ہوگا۔ ماتھے پر محراب۔ نورانی داڑھی۔ جبہ و عمامہ ہاتھ میں تسبیح۔ ارے تو تو کل کا چھوکرا ہے۔ (میری عمر اس وقت ۳۱ برس کی تھی۔ چہرے سے اتنے سالوں کا معلوم نہیں ہوتا تھا۔) میرا جنوبی ہند کا دورہ رکوانے والا اور مجھے یہاں کھینچ کر بلانے والا۔ کوئی بہت بڑا مذہبی راہنما ہوگا۔ پھر فرمایا۔ زمان۔ قسم ہے خدا کی۔ اگر ہماری قوم میں اس قسم کے نوجوان موجود ہیں تو ہم کبھی نہیں مر سکتے" اس کے بعد پھر میری طرف بغلگیر ہونے کو لپکے۔ میری پسلیاں پہلے ہی درد کر رہی تھیں۔ میں جلدی سے ایک طرف ہوگیا۔ اور کہا۔ قبلہ آپ پرے کھڑے ہو کر بشوق مجھ پر لاحول پڑھتے رہیں۔ میں ہڈیاں تڑوانے کو تیار نہیں ہوں۔

سبحان اللہ! تعمیر ملت کا وہ کیا زمانہ تھا۔

کانفرنس کے موقعہ پر میرے ۸ مہمان تھے جو زیادہ تر میرے بنگلہ "بہلافشاں" میں مقیم تھے۔ سر راس مسعود کے علاوہ ان کے رفقاء نواب صدر یار جنگ۔ بے نظیر شاہ وارثی (اپنے گیروے کپڑوں میں، ننگے سر۔ ننگے پاؤں) ڈاکٹر ہادی حسن۔ ڈاکٹر ظفر الحسن

(علی گڑھ یونیورسٹی کے دو ڈین DEAN -) علی گڑھ سٹوڈنٹس یونین کے صدر اور نائب صدر (ان کے نام میں اب بھول گیا ہوں،) پاکستان بننے کے بعد دونوں معروف و نیک نام ہوئے ۔ ان کے علاوہ سر عبد القادر۔ حفیظ جالندھری ۔ میر غلام بھیک نیرنگ ۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین ۔ شیخ عظیم اللہ ۔ سیکرٹری انجمن حمایت اسلام ۔ آغا محمد صفدر سیالکوٹی (جو کسی وقت پراونشل کانگرس کمیٹی کے صدر رہ چکے تھے ۔ لیکن ہندوؤں کی اندرونی چالوں سے آگاہ ہو کر کانگرس چھوڑ چکے تھے) میرے خسر محترم مولوی غلام محی الدین قصوری ۔ جنرل سیکرٹری انجمن حمایت اسلام ۔ میرے بڑے بھائی زیڈ ۔ ایچ ۔ خان (ظفر حسین خان) جو بعد میں انڈیا کے ریلوے بورڈ کے ممبر ہوئے ۔ جو محکمہ ریلوے کا اعلیٰ ترین عہدہ تھا اور پھر پاکستان کی پہلی وزارتِ مواصلات کے سیکرٹری مقرر ہوئے ۔ مشہور پنجابی شاعر عشق لہر غرضیکہ پنجاب و شمالی ہند کی چوٹی کی شخصیتیں غریب خانہ کی رونق کا باعث ہوئیں ۔

کانفرنس دو دن رہی ۔ اجلاس کے بعد میرے ہاں رات کو پلنگوں پر برآمدے میں لیٹے لیٹے (اپریل کا مہینہ تھا) ایک غیر رسمی مشاعرہ شروع ہوتا ۔ بے نظیر شاہ صاحب کے تین شعر یاد ہیں :-

یہ ہیں رندہی جو ہیں خوش شکلوں میں
یہی گت کسی پارسا کی تو ہوتی !

کسی سے تو زاہد کو ہوتی محبت
بتوں سے نہ ہوتی خدا سے تو ہوتی

گلہ بے نظیر اس کی رحمت کا کیا ہے
کبھی تو نے دل سے دعا کی تو ہوتی

دوسرے شعر کو لکھتے وقت بے ساختہ اکبر کا شعر یاد آ گیا ۔

گھٹی گو کر رندی میں وقعت مری — طبیعت مگر بے ریا ہو گئی

اسی کانفرنس پر تیرہ ہزار روپیہ جمع ہوا۔ جو حصہ رسدی مسلم کوآپریٹو ایجوکیشنل سوسائٹی لمیٹڈ منٹگمری میں جمع ہوا۔

میرے ہاں قیام کے دوران ایک صبح میں مہمانوں کی خبرگیری کے لیے ڈاکٹر ہادی حسن اور ڈاکٹر ظفر الاحسن کے کمرہ میں تھا کہ سر راس مسعود آگئے۔ بیٹھ گئے۔ باتوں میں مجھے کہنے لگے۔ حالی مسلم ہائی سکول۔ پانی پت کے لیے دو ہزار روپیہ دلواؤ۔" میں نے کہا صاحب! میرے پاس اتنا روپیہ کہاں۔ فرمانے لگے " ایسوسی ایشن سے دلاؤ۔ میں نے عرض کیا۔ ہماری انجمن کوآپریٹو سوسائٹیز ایکٹ کے ماتحت رجسٹرڈ ہے۔ اس کا مفاد صرف اہالیان منٹگمری کو پہنچ سکتا ہے۔ رجسٹرار کی اجازت کے بغیر بیرون ضلع خرچ نہیں ہو سکتا اور اجازت ملنی اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور ہے۔ سر راس مسعود جلال میں آگئے (وہ طویل القامت سرخ و سفید رنگ کے قوی الجثہ نہایت بارعب لیکن دلکش شخصیت کے مالک تھے) ان کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں۔ فرمانے لگے: پتہ ہے حالی کون تھا۔ قسم ہے خدا کی اگر حالی نہ ہوتا تو آج میں اور تم اور یہ سب ٹوکری ڈھو رہے ہوتے " میری حالت یہ تھی۔ جیسے بند آنکھیں کھل گئی ہوں۔ عرض کیا۔ ضرور روپیہ دلوا دوں گا۔ خواہ رجسٹرار سے لڑائی نہ لڑنی پڑے۔

لڑائی ہوئی۔ لیکن آخر رجسٹرار مان گئے۔ اور دو ہزار روپیہ حالی مسلم ہائی سکول پانی پت کو دینا تھا وہ دیا اور ڈنکے کی چوٹ پر دیا۔

کاش کہ نئی نسل کو معلوم ہوتا کہ پاکستان کا جذبہ پیدا کرنے والے کون لوگ تھے۔ کن لوگوں نے سیاسی نجات کی راہ دکھلائی۔ کن لوگوں نے ایک مردہ قوم کے قالب میں روح پھونکی اور دلوں کو لذت آشنائے حرم بنا دیا۔

حالی ان بزرگوں میں اولیت کا مقام رکھتے ہیں۔ جنھوں نے ملت کی ڈگمگاتی کشتی کو ساحلِ مراد پر پہنچانے کی سبیل بتائی۔

اب یہ وہ زمانہ تھا کہ تحریک خلافت سرد پڑ چکی تھی۔ وہ گیت جو ہندوستان کے کونہ کونہ میں زبانوں پر جاری ہوا۔
"بولی اماں محمد علی کی۔ جان بیٹا خلافت پہ دینا" ختم ہو چکا تھا۔ غیر ملکی سیاست اور خود ترکوں کے عمل نے خلافتِ عثمانیہ کی دھجیاں اڑا دیں۔

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ (اقبالؒ)

بیرونی مسلم طاقت ختم کر دی گئی تھی۔ افغانستان، عرب۔ کسی شمار و قطار میں نہ تھے۔ اس لیے فی الحال ہندی مسلمانوں کی توجہ باہر سے ہٹ کر اندرون ملک حالات پر مبذول ہوئی۔ اس عمل میں ان پر منکشف ہوا کہ ہندو کی نیت صاف نہیں ہے۔ اس نے بظاہر مسلمان دوستی کا ڈھونگ تو حزور رچایا ہوا ہے لیکن اندرونِ خانہ وہ سازشیں کر رہا ہے کہ انگریز سے جو طاقت منتقل ہوگی، وہ مسلمان کی سرکوبی یا کم از کم اسے زیر کرنے کے واسطے استعمال کی جائے گی۔ اس سازش کا جلد ہی انکشاف ہو گیا جب بعض صوبوں میں کانگریس کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ وہاں مسلمانوں سے وہ بے انصافیاں ہوئیں کہ ان کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کی حالت زار دیکھ کر دوسرے صوبوں کے مسلمان بھی متنبہ ہو گئے۔
ہندو ارادوں کا پول پوری طرح اس وقت کھلا جب مشہور نہرو رپورٹ اور پیرپور رپورٹ PIRPUR REPORT شائع ہوئی۔ جس کو پڑھ کر ہر تعلیم یافتہ مسلمان کی آنکھیں کھل گئیں اور ہندوؤں کے صحیح عزائم بے نقاب ہو گئے۔ انڈین نیشنل کانگریس سے مسلمانوں نے اجتناب کرنا شروع کر دیا۔ نتیجۃً مسلم لیگ مضبوط ہوتی گئی۔
حکیم الامت کے خطبۂ صدارت نے ۱۹۳۰ء میں پہلی بار ایک الگ وطن کا تصور پیش کیا۔ ان کی دعوت پر مسٹر محمد علی جناح نے لیگ کی قیادت سنبھالی اور اب مسلمانوں کو مستقبل میں اپنا صحیح مقام صاف طور پر نظر آنے لگا۔ جس کی وجہ سے ان کے ارادوں

کی سمت میں درشتگی پائی جانے لگی۔

مسلمانوں کو بدکتے ہوئے دیکھ کر ہندو نے اسے ورغلانے کی سر توڑ اور آخری کوشش کی لیکن اب اقبالؔ کے روح پرور پیغام اور مسٹر محمد علی جناح کی صحیح دلیر اور بے لاگ قیادت کی وجہ سے مسلمان ہوش میں آچکے تھے۔ ان کو اب ایک ایسا قائد مل گیا تھا جو ہر معنےٰ میں قائداعظم ثابت ہوا۔ مرد مجاہد۔ قابل۔ نڈر۔ محمد علی جناح کی راہنمائی نے ملّتِ اسلامیہ کی اکثریت کو اس خیال کی طرف کھینچ لیا کہ ہندو و مسلمان (باوجود اس کے کہ وہ صدیوں سے ایک ہی ملک میں رہتے ہیں۔ ظاہر میں لباس و زبان میں بھی کوئی فرق نہیں۔ کھانا پینا بھی عام لوگوں کا ملتا جلتا ہے) دو مختلف قومیں ہیں جو کبھی متحدہ ہندوستان میں رہ کر ایک دوسرے کے شانہ بشانہ کام نہیں کرسکتیں۔

قائداعظم نے بے پناہ دلیلیں اپنے موقف کے حق میں پیش کیں (جن کو شروع شروع میں نہ انگریز نے مانا نہ ہندو نے۔ نہ بیرونی دنیا نے اور نہ ہی اس وقت کے مسلمان غلامانِ کانگرس نے)۔ یہ دلیلیں روز بروز طاقت اور وزن حاصل کرتی گئیں۔ تاآنکہ لاہور کا تاریخی اجلاس منعقد ہوا۔ اور پہلی بار مسلم قوم نے حتمی طور پر پاکستان کو اپنا نصب العین قرار دیا۔

۲۳ رمارچ ۱۹۴۰ء کا دن ہماری قومی زندگی میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کہ اس دن ہمارا کارواں منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوا۔ میں اس تاریخی اجلاس میں موجود تھا۔ بہ حیثیت ایک کارکن کے۔ میں نے جو کچھ کر سکتا تھا، کیا۔ جب اجلاس شروع ہوا تو میرے عزیز دوست میاں بشیر احمد مرحوم کی لاثانی نظم قائداعظم کے متعلق اس ترنم سے پڑھی گئی کہ مجمع پر ایک والہانہ کیفیت طاری ہوگئی۔

ملّت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملّت ہے جسم، جاں ہے محمد علی جناح

رکھتا ہے دل میں تاب و ناتواں توکروڑ کی
ظاہر میں ناتواں ہے محمد علی جناح
لگتا ہے ٹھیک جس کا نشانے پہ جا کے تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح

واقعی تیر نشانے پر بیٹھا۔ پاکستان ریزولیوشن پاس ہوا۔ پہلی بار مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن کا مطالبہ پیش کیا گیا اور کچھ اس شدومد سے کیا گیا کہ چند ہی دنوں میں بچے بچے کی زبان پر "لے کے رہیں گے پاکستان" کا نعرہ گونج رہا تھا۔

۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے ریزولیوشن میں کچھ الفاظ ایسے استعمال ہوئے جن سے بعد میں دو علیحدہ علیحدہ مسلم ریاستوں کے قیام کی تاویل لی گئی۔ حالانکہ منشا دو علیحدہ مسلم ریاستیں قائم کرنا نہ تھا۔ بلکہ ایک اسلامی مملکت کے دو حصوں کا ذکر تھا۔ ایک مشرق میں ایک (شمال) مغرب میں۔

بہرصورت ہر قسم کے ابہام کو دور کرنے کے واسطے کچھ عرصے کے بعد سارے ہندوستان کی قانون ساز اسمبلیوں کے ممبران کے اجتماع میں یہ بات واضح کر دی گئی کہ لاہور ریزولیوشن کا مقصد دو خود مختار مسلم ریاستیں قائم کرنا نہیں تھا۔ بلکہ ایک مسلم ملک کے دو حصوں کا ذکر کیا گیا تھا۔

اس کے علاوہ لاہور ریزولیوشن کی عملی تاویل پر اگر نظرِ غائر ڈالی جائے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ تیئیس ۲۳ سال تک اس ریزولیوشن کا یہی مفہوم لیا گیا کہ اس میں ایک اسلامی ریاست کے دو حصوں کی طرف اشارہ تھا۔ قائدِاعظم اور شہید ملت لیاقت علی خان کے زمانہ میں کسی نے یہ سوال نہ اٹھایا کہ دو آزاد اور خود مختار ریاستیں بنی چاہئیں۔

اس زمانے کو تو چھوڑیے وہ تو قرونِ اولیٰ کے لوگوں کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد تین بنگالی پاکستان کے وزیرِاعظم بنے۔ خواجہ ناظم الدین مرحوم۔ مسٹر محمد علی بوگرہ مرحوم اور

مسٹر حسین شہید سہروردی مرحوم تینوں کے دور میں ایک دفعہ بھی یہ سوال کسی جانب سے نہیں اٹھایا گیا کہ لاہور ریزولیوشن کے صحیح مفہوم (یعنی مبینہ دو آزاد و خود مختار ریاستوں کے قیام پر عمل نہیں ہوا۔

یہ شاخسانہ تو اس وقت کھڑا کیا گیا۔ جب مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کی کھچڑی پکنی شروع ہوئی اور مشرق اور مغرب میں مخصوص مفادات نے اس نئے نظریہ کو ہوا دی کہ مشرقی پاکستان کو لاہور ریزولیوشن کے مطابق ایک خود مختار ریاست بنانا چاہیئے۔

اگر آپ حقیقت حال پر نظر ڈالیں تو صاف ظاہر ہوگا کہ لاہور ریزولیوشن میں MUSLIM STATES کا ذکر تھا۔ SECULAR STATES کا ذکر نہ تھا۔ اب قابلِ غور امر تو یہ ہے کہ موجودہ پاکستان (یعنی سابقہ مغربی پاکستان) کے آئین میں اسلامک ری پبلک کا ذکر بھی ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ مملکت کا مذہب اسلام ہوگا۔

مشرقی پاکستان یعنی بنگلہ دیش میں نہ اسلام کی کوئی جھلک ہے اور نہ اس کے آئین میں مذہب اسلام کا ذکر ہے۔ بلکہ یہ ذکر ضرور ہے کہ بنگلہ دیش ایک SECULAR STATE ہوگی۔ (لادین۔ لامذہب ریاست)

ظاہر ہے کہ ایسی ریاست لاہور ریزولیوشن کی کسی بھی تاویل کے مطابق نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ وہاں "مسلم ریاست" MUSLIM STATES کا ذکر ہے اس واسطے ثابت ہوا کہ جو احباب بنگلہ دیش بناتے وقت لاہور ریزولیوشن سے تائید حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کر رہے ہیں اور اصلیت کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

بنگلہ دیش اس واسطے نہیں بنا کہ تیئس چوبیس سال بعد بعض بزرجمہروں کو پہلی دفعہ

لاہور ریزولیوشن کی صحیح تاویل سمجھ میں آئی۔ بنگلہ دیش بنا ہے۔ اپنوں کی غفلت اور لاپروائی سے اور کسی قدر غداری سے اس کے علاوہ کھلی بھارتی جارحیت کے ذریعے جو ایک بڑی عالمی طاقت SUPER WORLD POWER کے زیر سایہ پاکستان کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرنے کے ناپاک منصوبہ میں (مل کر) مشغول تھے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں پر یہ بھی واضح کر دیا جائے کہ لاہور ریزولیوشن میں اسلامک سٹیٹس کا ذکر ہے اسلامک سوشلسٹ سٹیٹس کا ذکر نہیں ہے (اور نہ ہو سکتا تھا کیونکہ سوشلسٹ اور اسلام اکٹھے نہیں رہ سکتے) یا پاکستان اسلامک سٹیٹ بنے گا یا (خدانخواستہ) سوشلسٹ۔ (یہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر نہیں رہ سکتا۔)

جو صاحبان اس اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے ملک (پاکستان کا مطلب کیا لاالہ الا اللہ) میں سوشلزم رائج کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بڑی دور کی کوڑی لاتے ہیں اور اس بات کا سہارا لیتے ہیں کہ خود بانی پاکستان نے ISLAMIC SOCIALISM کی ترکیب استعمال کی تھی۔ وہ اس بات سے "ارادۃً" اغماض کرتے ہیں کہ قائداعظم کے مبینّہ فرمان کا سیاق و سباق اور صحیح الفاظ کیا تھے۔

اس ضمن میں ذیل کے حقائق کو مدنظر رکھنا قرین انصاف ہوگا۔ (۱) کیا یہ امر واقعی نہیں ہے کہ قائداعظم کی ہزارہا تقریروں اور تحریروں میں ISLAMIC SOCIALISM کا نام صرف ایک بار آیا ہے۔

(۲) کیا یہ درست نہیں ہے کہ اس پہلی (اور آخری) بار "اسلامک سوشلزم" کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے فوراً" قائداعظمؒ نے اسی وقت یہ وضاحت کر دی تھی۔

"BY WHICH I MEAN ISLAMIC SOCIAL JUSTICE"

(جس سے میری مراد۔ اسلامی سماجی انصاف ہے۔)

(۳) کیا قائداعظمؒ نے اپنے عرصۂ اقتدار میں سوشلزم کی طرف کوئی قدم اٹھایا جس کی

طرف اب بعض اصحاب اشارہ کر رہے ہیں اور جو سائنٹیفک سوشلزم سے مختلف نہیں بلکہ کمیونزم سے ہمکنار ہے ؟ کیا ان کے دستِ راست مسٹر لیاقت علی خاں نے کوئی ایسی بات کی یا کہی۔ جس سے یہ ظاہر ہو کہ ان کے رہنما نے "سوشلزم" کی طرف جھکاؤ ظاہر کیا تھا؟ (یہاں یہ نکتہ یاد رہے کہ روس اپنے آپ کو برملا ایک کمیونسٹ ریاست ظاہر نہیں کرتا۔ بلکہ اپنا آئینی نام

UNION OF SOCIALIST SOVIET REPUBLIC

رکھا ہوا ہے۔

(۴) کیا وہ اصحاب جو "اسلامک سوشلزم" کا ذکر کر رہے ہیں۔ وہ اسلام کی برتری کے لیے ایسا کر رہے ہیں یا "سوشلزم" کی بالادستی کے لیے۔

(۵) کیا ISLAMIC SOCIAL JUSTICE (اسلامی سماجی انصاف) میں ہمیں وہ بات نہیں مل سکتی جو کسی عوامی فلاحی ریاست میں ملنی چاہیئے؟

(۶) کیا اسلام کی وسیع برکتوں میں وہ سب کچھ موجود نہیں۔ جس سے قوموں (بلکہ بنی نوع انسان) کی ہر جائز ضرورت پوری ہو سکتی ہے؟

(۷) اگر یہ واقعہ ہے کہ اسلامی معاشرہ ایک مثالی معاشرہ ہوتا ہے تو پھر اسلام کے ساتھ "سوشلزم" کی پخ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟

(۸) کیا یہ بے ہنگم اصطلاح کسی غیر ملکی اثر کے تحت تو نہیں استعمال کی جا رہی ہے؟

میری یہ حتمی رائے ہے کہ یہ ملک (جو صریحاً اللہ اور اس کے رسولؐ کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور جو دنیا کا واحد "نظریاتی" ملک ہے اور جس کے لیے ان گنت انسانوں کے گھر بار اجڑے۔ عصمتیں برباد ہوئیں۔ ان کے بچے نوکِ سنگین پر شہید کیے گئے۔ ان کو نقل مکانی پر مجبور کیا گیا اور وہ ملک جس کے لیے لاکھوں انسانوں نے اپنی

جان تک کی قربانی دی کہ انھیں ایک نیا وطن مل جاتے تاکہ یہاں وہ اپنے مذہب ، اپنے رسم و رواج ۔ اپنی روایات اور اپنی امنگوں کے مطابق ہندو اور انگریز کے اقتدار کو خیر باد کہہ کر آزاد اور اسلامی زندگی بسر کرسکیں۔ اسی صورت میں قائم رہ سکتا ہے ۔ اگر وہ اپنے موقف پر کھڑا رہے ۔ ورنہ وہ دیرپا نہیں رہ سکتا ۔ اگر آپ پاکستان کی تشکیل میں اسلام کے عنصر کو خارج (یا کمتر) کردیں ۔ پھر یہ ملک پاکستان نہیں رہ سکتا ۔ بنگلہ دیش کی طرح کوئی اور نام اختیار کرکے ایک لادین اور لامذہب خطہ ارضی میں بدل جائیگا ۔ جس کا پاکستان کے تصور سے دور کا بھی واسطہ نہ ہوگا ۔

لاہور ریزولیوشن کے بارے میں جو تیسری بات یاد رکھنے کے قابل ہے ، وہ یہ ہے کہ یہ ریزولیوشن "بنگالیوں" "پنجابیوں" "سندھیوں" "بلوچیوں" یا صوبہ سرحد کے "پٹھانوں" نے "مل کر" پاس نہیں کیا تھا ۔ بلکہ اس اسلامی ملک کے "مسلمانوں" نے "مل کر" پاس کیا تھا ۔

پاکستان کی تحریک کے ادنیٰ (مگر دیرینہ) کارکن کی حیثیت سے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ لاہور ریزولیوشن (یعنی پاکستان ریزولیوشن) پاس کرتے وقت حاضرین کے ذہن میں پنجابی ۔ سندھی ۔ بلوچی اور پٹھان کی گردان کبھی آئی ہی نہ تھی اور نہ اس وقت ان باتوں کی طرف کسی کا دھیان تھا ۔ اس وقت تو صرف ایک لگن تھی کہ "مسلمانوں" کے لیے ایک وطن حاصل کرنا ہے ۔ کسی بدبخت مسلمان کے دل میں سندھی ۔ پنجابی وغیرہ کی تفریق کا خیال تک نہ آیا تھا ۔

ہم نے اپنا مشرقی بازو اسی لیے کٹوا دیا کہ ہم بنگالی اور غیر بنگالی کی تفریق میں پڑ گئے اس غلطی کی ابتدا قائداعظم کی رحلت کے جلد بعد اس وقت ہوئی جب ہم نے اردو کے ساتھ (جس کو قائداعظم نے علی الاعلان پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دیا تھا) بنگالی کو بھی متبادل قومی زبان قرار دے دیا ۔ (میں نے اس وقت اخبارات کے ذریعہ اس

تبدیلی کی شدید مخالفت کی تھی ۔ مگر نقار خانہ میں طوطی کی کون سنتا ہے ۔) خیر مشرقی پاکستان بوجوہات بنگلہ دیش بن کر ایک علیحدہ بلکہ اجنبی ملک بن گیا ۔

اب بچے کھچے پاکستان میں وہی غلطیاں دہرائی جا رہی ہیں ، جس کی وجہ سے ہمارا مشرقی حصہ ہم سے علیحدہ ہوا ۔

صوبائی کلچر (ثقافت) ، صوبائی زبانیں ۔ صوبائی خود مختاری ۔ مرکز سے دوری و آزادی یا صوبائی تعصبات کو "ہر" جانب سے ہوا دی جا رہی ہے ۔ "سندھو دیش" میں اب طلبا پڑھانے والے قاعدہ میں ظ ۔ ظالم اور اس کے آگے قائداعظم کی تصویر چھپتی ہے ۔ اعلان ہوتا ہے کہ فلاں فلاں محکموں میں غیر سندھیوں کو بھرتی نہیں کیا جائے گا ۔ کوئی شخص سندھی نہیں قرار دیا جائے گا ۔ جب تک دادا کے وقت سے یہاں رہائش کا ثبوت نہ دے ۔ قائداعظم اور حکیم الامت کی تصاویر کی بے حرمتی کی گئی ۔ محمد بن قاسم کو لٹیرا اور غاصب قرار دیا گیا اور راجہ داہر کی اولاد ہونے پر فخر کیا گیا ۔

بلوچستان میں تو نسلی اور صوبائی تعصبات نے وہ فروغ پایا کہ بیشتر غیر بلوچی ملازمین کو اپنے صوبوں میں واپس کیا گیا ۔ قبائلی پہاڑوں میں چھپ کر انتظامیہ کے ساتھ الجھتے رہے اور ابھی تک کوئی سیاسی حل بلوچستان کے مسئلہ کا سامنے نہیں آیا ۔ اگرچہ حالات سدھرنے کی امید ہے ۔

صوبہ سرحد میں پختونستان نہ سہی ۔ پختون بلا وجہ اپنے آپ کو ایک وحدت کے طور پر پیش کر رہے ہیں ۔ ڈھکے چھپے ۔ خاموش ۔ مگر ٹھوس تعصبات پنجابیوں کے خلاف اب بھی موجود ہیں ۔ (باقی دو صوبوں میں تو کھلم کھلا ہیں ۔) ایک پنجاب ان صوبائی تعصبات سے بچا ہوا تھا ، وہاں بھی اب "سرائیکی" کا ذکر اذکار اکثر رہتا ہے ۔ (بہاولپور کو الگ صوبہ بنانے کی مذموم تحریک تو سر اٹھا چکی ہے ۔)

ہمارے ذرائع ابلاغ ۔ ٹی وی ۔ ریڈیو ۔ اخبارات خاموش تماشائی ہی نہیں ، ان

تعصبات کو دانستہ یا نادانستہ فروغ دے رہے ہیں ۔میں کئی سال سے ان رجحانات سے اپنے ہم وطنوں کو آگاہ کر تا رہا ہوں۔

لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ زمین تیزی سے ہمارے پاؤں کے نیچے سے نکل رہی ہے میں پھر دردمندانہ عرض کرناچاہتا ہوں ۔گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں ۔اگر ہم فوراً نہ سنبھلے اور سب نے مل کر ملی سطح پر ملک کو ان تعصبات کے زہر سے نہ بچایا تو خدانخواستہ ہمارا بھی وہی حشر ہوگا ، جو سپین میں مسلمانوں کا ہوا تھا۔

لاہور ریزولیوشن پاس ہوتے ہی "امتِ مسلمہ" ہند کے لیے ایک "مقام" متعین ہو گیا ۔ایک راستہ صاف نظر آگیا ۔اس لیے قوم کی تمام صلاحیتیں مجموعی طور پر ایک سمت کی طرف چلنے کے لیے وقف کر دی گئیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لاہور ریزولیوشن کے بعد ساڑھے سات سال کے عرصہ میں پاکستان بن گیا ۔حالانکہ دوست دشمن سبھی اس کے قیام میں شک رکھتے تھے ۔نصب العین اور ذرائع سفر کا فیصلہ قوموں کی زندگی میں انقلاب لاسکتا ہے ۔ چنانچہ ہم نے بھی اس انقلاب کو اپنی آنکھوں سے ظہور پذیر ہوتے دیکھا۔

اسی زمانہ کے قریب (یعنی ۱۹۴۲ء میں) ایک غیر سیاسی واقعہ ہوا جو ایک لطیفے کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔

میرے عزیز پھوپھی زاد بھائی چوہدری محمد سعید نے اپنے رفقاء کے ساتھ ، (سروس شوز کا کام شروع کیا ۔ یہ ادارہ اب ماشاءاللہ ملک کی چوٹی کی فرموں میں بہت بلند اور ممتاز ہے ۔اور دنیا کے اکثر ممالک میں معروف ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ ہم چندر بنسی راجپوت ہیں جو تلوار کے دھنی تھے ۔اب جوتوں کا کاروبار شروع کرنے پر بے ساختہ حضرت اکبر کے اشعار یاد آ گئے جو انھوں نے قریباً قریباً ایسی حالت میں لکھے تھے ۔

فرماتے ہیں :-

شو میکری شروع جو کی اک عزیز نے
جو سلسلہ ملاتے تھے بہرام گور سے
پوچھا کہ بھائی آپ تھے تلوار کے دھنی
مورث تمہارے آئے تھے غزنی و غور سے
کہنے لگے ہے اس میں بھی اک بات رمز کی!
روٹی ہم اب کماتے ہیں جوتے کے زور سے

بھائی محمد سعید نے جو روٹی جوتے کے زور سے کمائی ہے وہ ماشاءاللہ بہت نیک کاموں میں صرف کی ہے۔ "الاحیا" کے وہ سرپرست ہیں۔ اور اتحاد عالم اسلامی کی تحریک کے لیے ہمیشہ دل کھول کر مالی امداد کی ہے۔ میری کتاب "دولت مشترکہ ممالک اسلامیہ" کی تکمیل بہت حد تک ان کی امداد کی مرہون منت ہے۔ اللہ تعالے ان کو جزائے خیر دے۔ ان کے کام میں مزید برکت دے آمین۔

۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء عیسوی کا عہد افروز زمانہ ہماری زندگی کا اتنا اہم حصہ ہے کہ اس پر جتنا بھی لکھا جائے تھوڑا ہے۔ مختصر یہ کہ ہم میں سے ہر شخص نشۂ پاکستان سے سرشار تھا۔ بچہ بچہ کی زبان پر "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ" کا نعرہ تھا۔ مخالف قوتوں نے بہت زور مارا۔ لیکن اب مسلم لیگ کو (جو ملت اسلامیہ ہندوستان کی سب سے بڑی بلکہ واحد سیاسی نمائندہ جماعت تھی) ایک ایسا لیڈر مل چکا تھا جو اس وقت ایشیا کا سب سے بڑا آدمی تھا اور دنیا کے بہت بڑے آدمیوں میں اس کا شمار ہوتا تھا۔ قابل، دیانت دار۔ مخلص۔ بات کا کھرا۔ وعدے کا پکا۔ قول کا سچا۔ نڈر۔ بے لالچ۔ کسی کے دباؤ میں نہ آنے والا۔ اپنے موقف پر قائم رہنے والا اور مسلمانان ہند کا سیاسی نجات دہندہ قائداعظم محمد علی جناح۔ اس عظیم راہبر کی قیادت میں مسلم لیگ کے نعرۂ پاکستان کو روز بروز طاقت حاصل ہوتی گئی۔ تاآنکہ ۱۹۴۲ء میں قائداعظم نے کہ جب پنجاب کے وزیراعلیٰ

ملک سر خضر حیات خاں ٹوانہ کو لیگ میں شامل ہونے کی دعوت دی اور انھوں نے انکار کیا تو قائداعظم نے فرمایا ساری عمر پچھتاؤ گے۔

ملک سر خضر حیات کی قائداعظم کے حکم سے سرتابی۔ قائد کے پیروؤں کے لیے ایک ایسی سیاسی کشمکش کا آغاز تھا۔ جس میں کسی کو اپنے نفع و نقصان کا خیال نہ تھا۔

میرے ملک سر خضر حیات اور ان کے دست راست ملک سر اللہ بخش ٹوانہ سے ذاتی تعلقات تھے بلکہ سر اللہ بخش ٹوانہ کے والد سر خدا بخش ٹوانہ اور میرے والد تو سگے بھائیوں کی طرح تھے۔ اسوقت میں 'خان بہادر' تھا۔ نیشنل وار فرنٹ کا لیڈر۔ انگریز گورنر میرے ہاں کھانا کھاتے تھے۔ جنگی خدمات پر میرے لیے تین مربعوں کی اور .O.B.E کے خطاب کی سفارش ہوتی تھی۔ کاغذا آخری منظوری کے لیے سر خضر حیات کے پاس تھے۔ مجھ سے وہ وعدہ کر چکے تھے کہ میں انہی دنوں میں انھوں نے قائداعظم سے بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ اقبال کا یہ شعر تو کئی دفعہ پڑھا ہوا تھا لیکن اس وقت کے حالات میں اس کے حقیقی معنے روشن ہو گئے۔

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

ہم نے بھی ملک خضر حیات صاحب سے نجات حاصل کر لی۔ بلکہ اعلان جنگ کر دیا اور کہہ دیا اب نہ مربعوں کی پروا ہے نہ خطاب کی۔ آپ نے مسلم موقف کی مخالفت کی ہے اب ہمارا آپ کا کوئی میل جول نہیں ہو سکتا۔ سلام کلام بھی بند ہوا اور نصف صدی کے تعلقات یک قلم منقطع ہو گئے۔

میں اس وقت شملہ میں تھا کہ منٹگمری سے تار پہنچا کہ زمیندارہ لیگ کو سرکاری افسران بڑے شد و مد کے ساتھ مضبوط کر رہے ہیں کہ مسلم لیگ کا مقابلہ کرے۔ میں فوراً منٹگمری پہنچا۔ جامع مسجد میں جا کر جمعہ کے دن اعلان کیا کہ اب سے انگریز اور اس کے ساتھیوں سے عدم تعاون ہوگا۔ میں خود پنجاب اسمبلی کے لیے کھڑا نہیں ہوں گا۔ لیکن مسلم لیگی امیدوار دل

کوتن من دھن سے کامیاب کراؤں گا اور خدا کا شکر ہے کہ منٹگمری جیسے سرکار پرست ضلع میں ہم نے چاروں کی چاروں نشستیں لیگ کے لیے جیت لیں۔

میں اس زمانہ میں ڈسٹرکٹ وار کمیٹی منٹگمری کا سیکرٹری تھا۔ مسٹر این۔ ایم۔ بچ (ایک ہندو آئی۔ سی آفیسر جن کے ساتھ میرے بڑے اچھے مراسم تھے۔) ڈپٹی کمشنر تھے۔

پراونشل وار بورڈ کی تشکیل ہوئی جس میں میرا نام نہ تھا۔ مجھ سے مسٹر بچ نے کہا کہ گورنمنٹ نے آپ کو منتخب نہیں کیا۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ پراونشل وار بورڈ کے ممبر بنائے جائیں۔ میں نے منظور کیا۔ انھوں نے جولائی کے مہینہ دوپہر کے وقت مسٹر سالسبری کمشنر ملتان کو ریل کے ایرکنڈیشنڈ کمرے میں ریلوے اسٹیشن پر جگا کر میرے متعلق کہا۔ دوسرے دن مجھے تار آگیا کہ گورنر صاحب نے پراونشل وار بورڈ کا ممبر نامزد کر دیا ہے۔ ہوا یہ کہ اِدھر ڈپٹی کمشنر صاحب کی میری، اُدھر ان کی کمشنر سے بات چیت ہو رہی تھی کہ قائد اعظم کا ایک اخباری بیان چھپا کہ کوئی مسلم لیگی انگریزوں کی WAR EFFORTS میں عملی حصہ نہ لے۔ دوسرے دن سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب کا بیان چھپا کہ پنجاب کے لیگی کارکنوں کو قائد اعظم کے حکم سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے۔

میری سر سکندر کے بیان سے تشفی نہ ہوئی تھی۔ میں نے قائد اعظم کو تار دیا کہ آپ کا یہ حکم اخبارات میں چھپا ہے۔ سر سکندر حیات کی یہ وضاحت ہے۔ حقیقت حال کیا ہے؟ آپ کا کیا حکم ہے؟

تار دے کر میں پراونشل وار بورڈ کی میٹنگ میں شامل ہونے لاہور چلا گیا۔ دوسرے دن واپس آیا تو تار کا جواب آیا ہوا تھا۔ قائد اعظم کا تار تھا۔

"آپ عملی طور پر جنگی امداد میں شامل نہیں ہو سکتے۔"

فوراً مسٹر بچ کے پاس پہنچا۔ ڈسٹرکٹ وار کمیٹی کی سیکرٹری شپ۔ وار کمیٹی کی سیکرٹری شپ سے استعفیٰ دیا اور گورنر کے سیکرٹری کو تار دیا کہ پراونشل وار بورڈ کی ممبری سے مستعفی

ہوتا ہوں۔

مسٹر پچ میرا استعفا دیکھ کر بھوچکے سے رہ گئے۔ کہنے لگے ابھی چند روز ہوئے میں نے کمشنر ملتان کو خاص طور پر کہہ کر آپ کو پراونشل بورڈ کا ممبر کرایا۔ اب آپ نے استعفا دے دیا۔ میری نسبت کمشنر اور گورنر کی کیا رائے ہوگی؟

میں نے کہا۔ آج تک کسی دوست کو شکایت کا موقعہ نہیں دیا لیکن یہ معاملہ اس نوعیت کا ہے کہ اس میں میں قوم وملّت کے لیڈر کی حکم عدولی نہیں کرسکتا۔ میں اس معاملہ میں معذور ہوں۔

گورنر سر ہنری کریک میرے اچھے واقف تھے۔ میرے ہاں کھانا بھی کھا چکے ہوئے تھے۔ انھوں نے بلا کر کہا۔ آپ کی وفاداری دو طرفہ نہیں ہوسکتی۔ میں نے کہا۔ میں اتفاق کرتا ہوں کہ عام طور پر ایسا نہ ہونا چاہیئے لیکن یہاں سوال ہماری سیاسی زندگی اور موت کا ہے۔ میری پہلی اور آخری وفاداری قوم کے ساتھ ہے اور میں قوم کے قائد کی کسی صورت حکم عدولی نہیں کرسکتا۔ میں استعفا واپس نہیں لے سکتا۔

چند دن بعد قائد اعظم نے نظر بہ حالات اپنے حکم پر نظر ثانی کرلی اور ہم سب مسلم لیگی جنگی امداد میں دوبارہ شریک ہوگئے لیکن وزیر اعلیٰ ملک سر خضر حیات کی پارٹی اور ان کے خلاف مہم تیز کردی۔ وہ بہت ناراض ہوئے۔ پہلے سر اللہ بخش کی معرفت پیغام بھیجا کہ مجھے پنجاب کا ایڈووکیٹ جنرل یا جج مقرر کیا جاسکتا ہے۔ بشرطیکہ ملک خضر حیات کی مخالفت سے باز آجاؤں۔ میں نے انکار کیا۔ کچھ عرصہ بعد پھر سر اللہ بخش نے پیغام بھجوایا کہ ہمارے خاندانی تعلقات ہیں لیکن اگر ملک خضر حیات خان آپ کی شدید مخالفت کی وجہ سے آپ کے خلاف کارروائی پر مجبور ہوجائیں تو گلہ نہ ہونا چاہیئے۔ میں نے کہا چشم ما روشن دل ما شاد۔ اس پر ملک صاحب نے مجھے نیشنل وار فرنٹ کی لیڈرشپ سے موقوف کردیا (وہ پراونشل لیڈر تھے) اور سرکار انگلشیہ نے ان

کے کہنے پر میری ایک مربع اراضی ضبط کرلی۔ ان سارے واقعات کی رپورٹ میں مسٹر لیاقت علی خان کو (جو اس وقت ہندوستان کی مخلوط حکومت میں وزیر خزانہ تھے۔ اور مسلم لیگ کے سیکرٹری بھی تھے۔) برابر دیتا رہا۔ جس کی بنا پر انھوں نے یونینسٹ گورنمنٹ کے برخلاف اسمبلی میں کافی پراپیگنڈہ کیا۔

پنجاب مسلم لیگ کا طوفانی دورہ میرے مکان" بہار افشاں" منٹگمری میں پراونشل لیگ کی لیڈر شپ کے اجتماع کے فیصلوں کے مطابق شروع ہوا۔

اب انگریز یونینسٹ گورنمنٹ اور ہندو کے خلاف علانیہ کارروائی شروع ہو چکی تھی۔ ہماری طرف سے ایک قسم کا اعلان جنگ دیا جا چکا تھا۔

میں ان دنوں آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا ممبر تھا۔ غالباً ۱۹۴۵ء کے اخیر جبکہ ۱۹۳۹ء کی جنگ عظیم ثانی ختم ہو چکی تھی اور انگریز انتقال اقتدار کے طریقے سوچ رہا تھا انڈین دستور ساز اسمبلی بنانے کا فیصلہ کیا گیا۔ جس میں کانگرس اور لیگ نے ہندوستان کا آئندہ آئین تجویز کرنا تھا۔

لیگ کی کونسل کا دہلی میں جلسہ تھا۔ امپیریل ہوٹل میں مجھے نواب افتخار حسین خان ممدوٹ (جو پراونشل لیگ کے صدر اور قائد اعظم کے بہت قریب تھے۔) نے رازدارانہ لہجہ میں کہا:" قائد اعظم پوچھتے ہیں۔ نذیر احمد سے پوچھو پچیس تیس ہزار روپیہ سالانہ کا نقصان برداشت کرلے گا۔

میں نے کہا۔ بھائی صاحب! میرا ایک مربعہ ضبط ہوا ہے۔ قسم ہے وحدہ لاشریک کی جو مجھے اس کا خیال بھی آیا ہو۔ قائد اعظم کے حکم پر جو قربانی ممکن ہے۔ دینے میں خوشی ہوگی۔ بات کیا ہے؟

نواب صاحب نے کہا۔ قائد اعظم آپ کو انڈین دستور ساز اسمبلی کا لیگی امیدوار کھڑا کرنا چاہتے ہیں۔ کامیابی یقینی تو ہے۔ وہ پوچھتے ہیں کتنے مہینہ دہلی رہ کر وکالت کو

نقصان پہنچے گا۔ کیا اس کے لیے تیار ہو؟

میں نے کہا۔ بخوشی، حاضر ہوں۔ جان حاضر ہے۔

چنانچہ کچھ عرصہ بعد میں مسلم لیگ کی جانب سے انڈین دستور ساز اسمبلی کا رکن (پنجاب کی طرف سے) منتخب ہوا۔

گورنمنٹ آف انڈیا کی چٹھی آئی کہ آپ کو بطور رکن اسمبلی ایک کرائسلر۔ CHRY-SLER ۔ کار گیارہ ہزار روپے پر دی جا سکتی ہے قبل اس کے کہ میں اس پیشکش کو قبول کرتا۔ قائد اعظم کا حکم موصول ہوا کہ مسلم لیگ نے انڈین دستور ساز اسمبلی میں شرکت نہیں کرنی۔

میں نے کار کی پیشکش کو رد کر دیا۔

اب تک میں پراونشل مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر بن چکا تھا اور لیگ کی لیگل ڈیفنس کمیٹی کا بھی ممبر مقرر ہو چکا تھا۔ جب لیگ کے راہنماؤں نے تحریکِ پاکستان کے عہد ساز دور میں اپنے آپ کو گرفتاریوں کے لیے پیش کیا اور یونینیٹ گورنمنٹ کی جاری کردہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی کھلم کھلا شروع ہو گئی تو لیگ ڈیفنس کمیٹی کے تینوں ممبران کو حکم تھا کہ انھوں نے اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش نہیں کرنا۔ ہاں گورنمنٹ خود گرفتار کرے تو علیحدہ بات ہے۔

۱۹۴۷ء کے آغاز میں لیگ کے سارے لیڈر، صوبائی، ضلعی، تحصیل کے لیول کے سب ہی کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ غالباً جنوری ۱۹۴۶ء کے آخر میں یا فروری ۱۹۴۶ء شروع میں آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کا جلسہ کراچی ہو رہا تھا۔ پنجاب کے حالات سے براہِ راست آگاہی حاصل کرنے کے لیے قائد اعظم نے سربراہوں کو کراچی بلایا۔ بتایا گیا کہ وہ تو سب کے سب جیل میں ہیں۔ صرف شیخ محمد امین بیرسٹر (مرحوم) ایم ایل اے جھنگ اور میں (نذیر احمد) (دونوں ممبران لیگل ڈیفنس کمیٹی) باہر ہیں۔ دونوں فوراً کراچی

پہنچو۔ میں بھی اس وقت لاہور تھا۔ وہاں سے اکٹھے ٹرین میں بیٹھے۔ راستہ میں مجھے معلوم ہوا کہ منٹگمری کے اسٹیشن پر مجھے گرفتار کر لیا جائے گا مگر ایسا نہ ہوا۔ پولیس پلیٹ فارم پر کھڑی رہی۔ ہم بہ سلامت کراچی پہنچے۔ عجیب جذبہ تھا۔ جیسے ہوا کے گھوڑوں پر سوار ہیں۔ نہ گرفتاری کا ڈر نہ انجام کی پروا۔ بس ایک منزل (پاکستان) پیش نظر تھی اور وہاں پہنچنے کا والہانہ جوش اور یہ حالت اوپر کے درجہ کے کارکنوں کی نہ تھی۔ ہر کلہ گو پاکستان کے نشے میں سرشار تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب اسی زمانہ میں گاؤں گاؤں لیگ کا پیغام پہنچا رہا تھا تو ایک جانگلیوں کے گاؤں میں گیا۔

نوٹ :۔ ضلع منٹگمری (ساہی وال) کے پرانے باشندے عرفِ عام میں جانگلی کہلاتے تھے اور ہم باہر سے جا کر بسنے والے آباد کار کہلاتے تھے۔ جانگلی بہت پس ماندہ تھے اور افسرانِ سرکار سے سخت ڈرتے تھے۔ اور بالکل ان کے زیرِ اثر تھے۔

۱۰۰/۱۲۵ افراد کے قریب گاؤں کے باہر جمع ہو گئے۔ علاقہ کا ہندو تھانیدار بھی پستول لگائے معہ چند سپاہیوں کے موجود تھا۔ میں نے دیہاتی زبان میں مسلم لیگ کے موقف کو بیان کیا۔ انگریز اور ہندو کی ناجائز مخالفت کا ذکر کیا کہ پاکستان میں اسلام کی حکومت ہوگی۔ اسلامی معاشرہ ہوگا۔ اسلامی ماحول ہوگا۔ کیا آپ اللہ اور اس کے رسول مقبولؐ کا ساتھ دیں گے یا ان کے دشمنوں کا؟ میں ابھی اپنی دلیل کی وضاحت کر رہا تھا کہ گاؤں کا بڈھا نمبردار (جو مجھے جانتا تھا) اٹھ کھڑا ہوا۔ اور جانگلی زبان میں بولا۔

"چودھری کا ہنوں پیا سر کھپاناایں۔ اسیں کلمے دا ساتھ چھڈ سکنے آں" لاالہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ آہ تھانیدار پیا سن دا اے۔ (یہاں تک کہہ کر نمبردار نے اپنا گریبان چاک کر دیا اور چھاتی برہنہ کرتے ہوئے) آ میرے سینے وچ گولی مار دے تے انشاء اللہ مسلم لیگ دی آواز ای نکلے گی۔"

ترجمہ :- چودھری صاحب! آپ کیوں مغز ماری کر رہے ہیں۔ ہم کبھی کلمۂ طیبہ کا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں؟ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ یہ تھا بیدار من رہا ہے دگریبان چاک کرتے ہوئے نمبردار نے چھاتی برہنہ کرتے ہوئے کہا) یہ میرے سینہ میں گولی بھی مار دے تو انشاء اللہ مسلم لیگ کی آواز ہی نکلے گی (بہت سے غیر تعلیم یافتہ لوگ لیگ کو "لیک" کہتے تھے۔ یعنی لکیر۔ مطلب یہ کہ مسلمانوں کی لکیر (راستہ) کو ہم نہیں چھوڑ سکتے۔

سبحان اللہ۔ کیا ایمان افروز زمانہ تھا اور کیا روح پرور مناظر دیکھنے میں آتے تھے۔

میری رفیقۂ حیات جو اس زمانہ میں پردہ کی اتنی پابند تھیں کہ اپنی کوٹھی کے باغ میں برقعہ پہن کر جاتی تھیں۔ شہر کی زنانہ مسلم لیگ کی صدر تھیں۔ ۱۹۴۵ء کے انتخابات میں وہ (برقعہ میں ہی) مسلم لیگ کا جھنڈا لے کر گلی کوچوں میں جلوس کی رہنمائی کرتی تھیں اور پولنگ والے دن اکثر پولنگ اسٹیشنوں پر مع اپنے کارکنوں کے چکر لگاتی تھیں۔ نتیجتہً سو فی صد ووٹ مسلم لیگ کو ملے تھے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک ضعیفہ پردہ دار سیدانی بھی مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دینے آئیں۔ جنھوں نے بتایا کہ آج تک انھوں نے گھر کی دہلیز سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ صرف مسلم لیگ کو پرچی دینے وہ اپنے گھر سے نکلی ہیں۔

جب ہمارے دیہاتی بھائیوں کا اور ہماری مستورات کا یہ حال تھا تو ہم جیسے کارکنوں کے بلند حوصلوں کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہ ہونا چاہیئے۔ بس اس راہ رو کا سا حال تھا جس کو منزلِ مقصود صاف نظر آرہی ہو اور اس کو یقین ہو کہ میں اب پہنچا کہ پہنچا۔

میں اور شیخ محمد امین (مرحوم) کراچی پہنچتے ہی ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں

طلب کیے گئے۔ میرے لیے ورکنگ کمیٹی کی کارروائی دیکھنے کا یہ پہلا موقعہ تھا۔ قائدِاعظم کی فراست۔ دور رسی۔ عقابی نگاہ۔ ہمت وجرأت اور COLD LOGIC (معقول کرنے والی منطق) کا کچھ ایسا مظاہرہ دیکھا کہ وہ جو کسی نے کہا تھا۔

"HE IS A FIELD MARSHAL AMONG PRIVATES"

"وہ ایسے ہیں جیسے عام سپاہیوں کے مقابلہ میں کوئی فیلڈ مارشل ہو"
اس کا صحیح مفہوم سمجھ میں آگیا۔ میاں بشیر احمد مرحوم کے اس شعر کے معنے اچھی طرح روشن ہو گئے :۔

لگتا ہے جس کا ٹھیک نشانے پہ جا کے تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح

خیر ہم نے رپورٹ پیش کی۔ قائدِاعظم نے اس پر ممبران کے خیالات کو سنا۔ پھر اپنی رائے کا اظہار کیا۔ چند احکامات جاری کیے۔

پرہیزی کھانا انھوں نے مادرِ ملت کے ساتھ اوپر کھانا تھا۔ ہم سب نے نچلی منزل میں کھایا۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے (پنجاب کے حالات کی طرف خاموش اشارہ کرتے ہوئے) میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر فرمایا :۔

"DON'T WORRY. I AM WITH YOU, ALLAH IS WITH US."

"گھبراؤ نہیں! میں تمھارے ساتھ ہوں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہیں۔"
(قائدِاعظم) کا اللہ تعالےٰ پر پختہ ترین یقین تھا۔ قرآن حکیم کی ایک جلد آن کے بستر کے ساتھ میز پر پڑی رہتی تھی اور انھوں نے خود میاں بشیر احمد مرحوم کو (جو اس وقت آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔) فرمایا۔ "جب بھی مجھے کوئی مشکل نظر آتی ہے۔ میں اسی چشمۂ زندگی وہدایت سے سیراب ہوتا ہوں۔"

پنجاب کی حالت کا بچشمِ خود معائنہ کرنے کیلیے قائدِاعظم نے خواجہ ناظم الدین مرحوم نواب اسمعیل خان مرحوم اور نواب صدیق علی خان مرحوم کو مامور کیا۔

کچھ سال بعد جب قائدِاعظم کے بعد خواجہ صاحب مرحوم بہ حیثیت گورنر جنرل اپنے A.D.C کے ساتھ قدم ملاکر چلنے کی انتہائی کوشش کرتے ہوئے گورنر جنرل ہاؤس سے کسی تقریب میں شمولیت کے لیے باہر تشریف لاتے تو بے اختیار میرے منہ سے نقل جاتا۔ " زاغوں کے تصرّف میں عقابوں کے نشیمن " (اقبال)

کراچی میں قائدِاعظم کے فرمان کے مطابق اسی شام چند غیر ملکی نامہ نگاروں کو پاکستان کے موقف کی وضاحت کی اور رات ایک جلسۂ عام میں پنجاب میں جو جنگِ آزادی چھڑی ہوئی تھی۔ اس کے کوائف سے حاضرین کو مطلع کیا۔ یہ بات واضح کی کہ ہماری جدو جہد انگریز اور ہندو۔ دونوں سے آزادی حاصل کرنے کے لیے ہے۔ کیونکہ اب ہندو عزائم بے نقاب ہو چکے ہیں کہ انگریز کے جانے کے بعد وہ ہم پر حکمرانی کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ہم متحدہ ہندوستان میں رہے تو ہندوؤں کا غلام بننا پڑے گا۔ اور اگر ہم نے اپنا وطن بنالیا تو آزاد بھی ہوں گے۔ معزز بھی اور خوشحال بھی انشاءاللہ

منٹگمری پہنچنے کے جلد ہی بعد (اوائل فروری ۱۹۴۶ئہ) مجھے گرفتار کر کے منٹگمری جیل بھیج دیا گیا (میرا چھوٹا لڑکا نسیم جو اُن دنوں پشاور اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ مجھ پر سبقت لے گیا وہ مجھ سے پہلے گرفتار ہوا اگرچہ چند گھنٹہ بعد رہا کر دیا گیا منٹگمری جیل سیاسی قیدیوں کے لیے نہیں بنا تھا۔ یہ عادی مجرموں یا پھانسی کی سزا پانے والے لوگوں کے لیے مخصوص تھا۔ مجھے بھی ایک "کالی کوٹھڑی" یا پھانسی کی سزا پانے والے ملزم کی کوٹھڑی میں رکھا گیا۔ میرے نہایت ہی پیارے۔ بھائیوں کی طرح عزیز دوست شیخ نسیم حسن، ایڈوکیٹ (جو بعد میں پنجاب گورنمنٹ میں ایڈوائزر کے عہدہ پر متمکن ہوئے) کوٹھڑی میں میرے ساتھی تھے۔ ایک طرف ایک چکی تھی۔ جس پر ہم نے اپنی کتابیں

رکھیں۔ کنگھی برش وغیرہ رکھے۔ لوہے کی سلاخوں والا دروازہ تھا۔ جس میں سے کافی سردی آتی تھی۔ (مجھے سردی زیادہ لگتی ہے۔) جیل والوں سے پرانے کمبل لے کر اس پر رات کو ڈال لیتے تھے۔ نسیم فرش پر ایک طرف چبوترا سا تھا اس پر سوتے تھے میرے لیے چارپائی ہوتی تھی۔ ۱۵/۱۶ دن جیل میں رہے لیکن اس وقت کے سیاسی نظربندوں اور آج کے سیاسی نظربندوں کے برتاؤ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ہمیں بستر اپنا۔ کھانا گھر سے اور ایک وارڈر بطور وقتی ملازم کے ملتا تھا۔ اتنی فراغت کے دن مشکل سے نصیب ہوئے ہیں۔ پنجابی محاورہ کے مطابق "نہ فکر نہ فاقہ" سارا دن نظربند یا حوالاتی دوستوں سے خوش گپیاں۔ کبھی تاش۔ اکثر وقت نماز اور دعا اور وظائف میں گذرتا تھا۔ نہ کوئی سختی تھی نہ کوئی ناجائز فعل۔ جیل قدمی کے واسطے احاطہ سے باہر نکلتے تو باقی قیدی (یہ ایک المناک حقیقت ہے کہ اکثر قیدی مسلمان تھے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ لیکن پاکستان کے جذبہ سے وہ بھی سرشار تھے۔) ہاتھ اٹھا اٹھا کر دعا دیتے تھے۔ اللہ آپ کو فتح دے اور کامیاب کرے۔ پھر بھی جیل۔ جیل تھا۔ کوئی خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ گھٹا گھٹا ماحول۔ بید لگانے والی ٹکٹکی دیکھی۔ جس پر موٹے چمڑے کی گدی اور سب سے مضبوط قیدی اس پر بید مارنے کی مشق کرتے۔ تو اسی تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے کہ جب انسان کے جسم پر یہ بید پڑتے ہوں گے تو اس کی کیا حالت ہوگی فضا بھی صاف نہ ہوتی تھی۔ عجیب سی بدبو تھی۔ خیر یہ تمام باتیں تو ہم آئی گئی کر دیتے تھے لیکن رات کو ایک برج سے دوسرے برج تک چل کر کچھ اس کرخت آواز سے چوکیدار "سب اچھا۔ سب اچھا" کی آواز لگاتے کہ نیند خراب ہو جاتی تھی۔

ایک دن صبح اٹھے تو یہ پرلطف واقعہ سنا کہ عین اس وقت جب کہ چوکیدار بڑے جوش سے فاتحانہ انداز میں "سب اچھا" کی گردان کر رہے تھے۔ دو عادی مجرم (لمبی قید کے سزایاب) فصیل کے نیچے سے سرنگ لگا کر فرار ہو گئے۔ دراصل وہ کئی دن سے

سرنگ لگانے کے کام میں مشغول تھے۔ آج سرنگ آرپار ہوگئی۔ تو دونوں بھاگ نکلے اور اوپر "سب اچھا" کی خوشخبری سنائی جاتی رہی۔

پاکستان بننے کے بعد کچھ ایسی حالت رہی کہ بظاہر سب ٹھیک بتایا جاتا ہے اور اوپر سے "سب اچھا" کی نوید ہوتی ہے لیکن اندر سے چوربازاری۔ ذخیرہ اندوزی۔ غنڈہ پن۔ لاقانونیت۔ وطن دشمنی اور ہر قسم کی بداعمالیوں کی سرنگیں لگتی رہی ہیں۔ یہ پردہ پوشی ٹیلیویژن۔ ریڈیو اور سرکار پرست اخبارات میں تو کمال کو پہنچ گئی ہے یہاں تک کہ حقیقت اور فسانہ کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔

حکومتِ وقت اور قائداعظم میں عارضی سمجھوتا ہونے پر ہم سب رہا کر دیے گئے اور پہلے سے بھی زیادہ شدّ ومد کیساتھ پاکستان کیلیے کام میں مشغول ہو گئے۔ اب یہ وقت آگیا تھا کہ تمام اسمبلیوں میں عام انتخابات کے بعد بہت بھاری اکثریت مسلم لیگ کے ممبران کی منتخب ہو چکی تھی۔ انگریز نے دوسری جنگِ عظیم کے بعد بین الاقوامی اور اس کے اپنے ملکی حالات کے ماتحت ہندوستان چھوڑنے کا اعلان کر دیا تھا۔ ہندو اور انگریز کی ملی بھگت ظاہر ہو رہی تھی۔ عام مسلمان کو ایک بڑی اسلامی سلطنت بنتی یعنی اس کا صد سالہ خواب پورا ہوتا نظر آتا تھا۔ ہندو کی مخالفت اس مرحلہ پر اور بھی بڑھ گئی بعض لوگوں کا تو یہ کہنا ہے کہ اگر ہندو ہماری شدید مخالفت نہ کرتا تو شاید پاکستان اتنی جلدی نہ بنتا۔ انگریز کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے اس نے جو چارہ ہو سکتا تھا، کیا۔ کہ پاکستان نہ بنے۔ اس کی مسلمان کے ساتھ پرانی دشمنی اب کھلم کھلا اور صاف نظر آ رہی تھی مسلمان اس سے روز بروز زیادہ آگاہ ہوتا جاتا تھا۔ اور جس شدّ ومد سے ہندوستان پاکستان بننے کی مخالفت کرتا تھا۔ اسی طرح (بلکہ اس سے بڑھ کر) مسلمان نے پاکستان بنانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دی تھی۔

۱۹۴۶ء کی گرمیوں کی چھٹیاں میں نے ڈلہوزی میں اپنے بڑے بھائی چودھری

بشیر احمد مرحوم (جو اس وقت پنجاب ریڈکراس کے سیکرٹری تھے) کی نئی شاندار کوٹھی میں گذاریں۔ چوک میں وہ دھواں دھار تقریریں ہوتی تھیں کہ ہندو اور انگریز دنگ رہ جاتے تھے۔ انھیں ایام میں میں نے "خان بہادری" کا خطاب واپس کیا۔ سرکار انگریزی سے جتنے تمغے ملے ہوئے تھے، واپس کر دیئے۔

ایک جلسہ میں (غالباً) تیز تقریر کی۔ رات کو ایک سرکاری ملازم (ان دنوں قریباً سب مسلمان سرکاری ملازم مسلم لیگ کے حامی تھے۔) نے بتایا کہ آج ڈپٹی کمشنر پولیس کپتان اور دیگر افسران نے آپ کو گرفتار کرنے کی تجویز پر غور کیا۔ پولیس کپتان کی رائے تھی کہ فوراً گرفتار کرنا چاہیئے لیکن ڈپٹی کمشنر نے مشورہ دیا کہ چونکہ چودھری صاحب انڈین دستور ساز اسمبلی کے ممبر ہیں۔ گورنمنٹ آف انڈیا کی رائے لے لی جائے۔ یہ معاملہ ابھی زیر غور رہا کہ میں نے آخری تقریر ڈلہوزی میں مولانا ظفر علی خان (مرحوم) کی صدارت میں ایک بارونق جلسۂ عام میں کی۔ تقریر کے پہلے شعر پہ مجمع ہمہ تن تصویر شوق بن گیا:۔

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ (اقبال)

تقریر کے دوران لوگوں کا جوش و خروش دیکھنے کے قابل تھا۔ لیکن تقریر ختم نہ ہوتی تھی کہ موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ ہم کچھ آدمی فضل دین اینڈ سنز (موجودہ مشہور فرم۔ فضل دین اینڈ سنز کیمسٹس۔ لاہور) کی دکان میں چلے گئے۔ یار لوگوں نے مولانا سے شعر کی فرمائش کی۔ مولانا کا محبوب شعر ان دنوں یہ تھا:۔

تہذیبِ نو کے منہ پہ وہ تھپڑ رسید کر
جو اس حرام زادی کا حلیہ بگاڑ دے

(مولانا نے یہی شعر ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے لاہور کے تاریخی اجلاس میں قائداعظم

کی موجودگی میں پڑھا تھا۔) میں نے اس شعر کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ مجھے اس سے حرف بہ حرف اتفاق ہے۔

جب تک ہم اس "تہذیبِ نو" سے چھٹکارا حاصل نہیں کریں گے۔ ہم بھی اسی قعرِ مذلت میں گر جائیں گے جس میں اس کے مغربی پرستار گرے ہوئے ہیں۔

۱۹۴۷ء کے شروع میں ہی پاکستان بننے کے امکانات روشن ہوتے گئے اور مسلمانوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ انگریز کے چلے جانے پر ہم ہندو اکثریت کے ماتحت خواری اور ذلت کی زندگی قبول نہ کریں گے۔ سارا ہندوستان تو ہمارے قبضہ میں نہ آ سکتا تھا کہ ہم اقلیت میں تھے۔ لہٰذا لاہور ریزولیوشن کی بنا پر تقسیم ملک کی باتیں شروع ہوئیں۔ یہاں بھی ہندو نے انگریز کے ساتھ مل کر کئی رکاوٹیں ڈالیں۔ لیکن قائداعظم کی بے پناہ قابلیت اور ان کی لاجواب دلیلوں کے سامنے دشمنانِ اسلام کی کچھ پیش نہ گئی۔ ویسے بھی اس وقت تک ساری قوم قائداعظم کے ساتھ تھی۔ قوم کو وہ کشتی بان مل گیا تھا جس کی ذہانت، امانت، قابلیت اور ہمت کو اس نے ٹھونک بجا کر دیکھ لیا تھا۔ ہمارا قائد اسلامی عقیدہ کا قائل۔ شریف الطبع۔ سچا۔ بلند حوصلہ۔ بلند کردار۔ صاف گو۔ کسی قیمت پر نہ بکنے والا اور نڈر لیڈر تھا۔ ایسا دیدہ ور بڑی مشکل سے پیدا ہوتا ہے۔ قوم کی خوش قسمتی تھی کہ اس کو طوفان میں ایسا ناخدا مل گیا جو کشتی رانی کے تمام رموز سے واقف تھا اور جس پر اہلِ کشتی کو پورا بھروسا تھا۔ وہ صرف "طوفانوں پہ لچھے دار تقریریں" کرنے کے قابل نہ تھا۔ بلکہ ہمت مردانہ سے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کو سینہ سپر رہتا تھا۔

ہندو اور انگریز اب دونوں قائداعظم کے پختہ عزم اور ان کی منطق سے عاجز آ چکے تھے۔ انگریز تو خیر جا رہا تھا۔ ہندو کو البتہ یہ رنج تھا کہ کیوں قائداعظم اس وقت کے قریباً نو کروڑ مسلمانوں کو اس کے چنگل سے رہائی دلا رہا ہے۔ اس نے اپنی ریشہ دوانیاں تیز تر کر دیں قائداعظم کو ہر قسم کا لالچ دیا۔ متحدہ ہندوستان کی گورنر جنرلی کی پیشکش کی مگر وہ مردِ مجاہد

قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ دیکھی سلطاں کی درگاہ (اقبال)

نہ زاری سے۔ نہ زوری سے ہندو کے قابو میں آیا۔ بلکہ ملّت اسلامیہ ہند کو بالآخر اپنا وطن دلانے میں کامیاب ہوگیا۔

پاکستان کی قانونی حیثیت تسلیم ہوتے ہی قائداعظم نے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا انتخاب کرایا۔ مجھے بھی پنجاب کی طرف سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کا ممبر چنا گیا۔ جب ہندو نے یہ دیکھا کہ اب پاکستان بننے میں کوئی طاقت حائل نہیں ہوسکتی تو اس نے بننے والے پاکستان سے سرمایہ اور ماہرین کو نکالنا شروع کردیا کہ نئی مملکت میں نہ پیسہ ہو۔ نہ انتظام کا تجربہ۔

میرے ایک دوست غیر ملکی ڈاکٹر نے ان دنوں بتایا کہ ان کے ایک POLISH رفیقِ کار ڈاکٹر کیلیش KALISCH کو جولائی ۱۹۴۷ء میں ٹیلیفون آیا کہ آپ کب جارہے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا۔ میرا تو جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ فون کرنے والے نے کہا۔ یہ فیصلہ ہوگیا ہے کہ تمام ہندو ڈاکٹر فوراً (بننے والے) پاکستان سے نکل جائیں۔ جس پر ڈاکٹر نے کہا۔ لیکن میں تو ہندو نہیں۔ میں تو پولش ہوں۔

فون کرنے والے نے ڈاکٹر کیلیش KALISCH کو ڈاکٹر کیلاش پڑھا جو ایک ہندو نام ہے۔

۱۰ راگست ۱۹۴۷ء کو پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے قائدین بذریعہ ریل عازم کراچی ہوئے۔ ایک ہی ٹرین میں نواب افتخار حسین خان ممدوٹ (مرحوم) جو شرافت، خلوص اور انکسار کا مجسمہ تھے۔ اور قائداعظم کے دست راست۔ کم گو لیکن دُھن کے پکے ان کی ریاست ممدوٹ ساری کی ساری ہندوستان میں رہ گئی۔ لیکن نواب صاحب نے خندہ پیشانی سے سب کچھ قبول کیا۔ میاں ممتاز محمد خان دولتانہ (جو آجکل برطانیہ میں پاکستان

کے سفیر ہیں،) ملک فیروز خان نون مرحوم سابق وزیراعظم پاکستان اور میاں افتخار الدین مرحوم سب ایک ہی COACH میں تھے۔ یہ سب لاہور سے چلے۔ میں منٹگمری سے ان کے ہمراہ ہوا۔ منٹگمری اسٹیشن پر۔ اور ہر بڑے اسٹیشن پر مشتاق لوگوں کا جمگھٹا ہوتا تھا۔ پاکستان زندہ باد اور لیڈروں کے نام لے لے کر، زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج اٹھتی تھی۔ ہر اسٹیشن پر گاڑی وقت سے زیادہ ٹھہرنے پر مجبور کی جاتی تھی۔ نواب صاحب ممدوٹ نے میری اور میاں افتخار الدین مرحوم کی ڈیوٹی لگائی ہوئی تھی کہ ہم اسٹیشنوں پر تقریریں کریں آدھی رات کے بعد رحیم یار خاں پہنچے پھر یہ سلسلہ ختم ہوا۔ اس وقت ہمارے گلے بھی جواب دے چکے تھے۔ ان "فلک شگاف" زندہ باد کے نعروں پر ایک زندہ دل نے (جو ساتھ والے ڈبہ میں بیٹھے ہوئے تھے) خوب فقرہ چست کیا۔

"میاں اتنے جوش سے زندہ باد کے نعرے نہ لگاؤ۔ کل تمہی نے مردہ باد کا نعرہ بھی لگانا ہے"۔

پنجابیوں کے متعلق مشہور ہے کہ وہ سیاسی شعور سے عاری ہیں۔ بعض لوگ تو انھیں پنجابی "ڈھگے" (بیل) کہتے ہیں۔ کولھو کے بیل کی طرح آنکھوں پر پٹی بندھی ہے۔ دنیوی معاملات اور نیک و بد سمجھتے ہیں۔ باقی اہل وطن سے بہت پیچھے۔ جس کی بات وقتی طور پر پسند آگئی۔ اس کے غلام بن گئے۔ جوش اترگیا تو اسے زمین پر دے مارا۔

حکیم چراغ حسن حسرت مرحوم نے ایک طنزیہ میں۔ لاہور والوں کا دکھ (وہ پنجابیوں کا دل کہلاتا ہے۔) خوب خاکہ کھینچا ہے۔ کس طرح یہ لوگ سر پر اٹھاتے ہیں اور کس طرح نیچے پھینکتے ہیں۔

حکیم صاحب نے ایک فرضی مسافر لاہور کی کہانی بیان کی ہے جسے لاہور کے جلسے جلوسوں کے دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہ کہتا ہے میں یہ آرزو لے کر لاہور پہنچا۔

خوبئ قسمت کہ اسٹیشن پر اترتے ہی ایک جلوس نظر آیا۔ جس کی قیادت چند نوجوان کر رہے تھے اور زور زور سے چلا رہے تھے "نورالدین مردہ باد"۔ "نورالدین مردہ باد" جلوس بڑھتا گیا۔ میں بھی اس میں شامل ہو گیا۔ زیادہ تر نوجوان جلوس میں شامل تھے۔ نووارد ہونے کی حیثیت سے میں نے ایک ہمراہی سے پوچھا کہ بھائی صاحب یہ کیا معاملہ ہے۔ وہ غضب ناک ہو کر بولا۔ تمھیں پتہ ہی نہیں کیا ہوا ہے؟ میں نے نووارد ہونے کا عذر پیش کر کے اپنا پیچھا چھڑایا۔ اتنے میں جلوس کے نوجوان قائد نے اپنی ہاکی گھماتے ہوئے ایک دکان کے تختے پر کھڑے ہو کر کہا۔ حضرات آپ کو پتہ ہے۔ نورالدین لعین نے بے گناہ کلمہ گو امام دین کو شہید کر دیا ہے۔ قاتل نور دین جہنمی ہے۔ ہم سب امام الدین کی بیوہ اور بچوں سے ہمدردی کے لیے اور ان کی امداد کے واسطے شہید کے گھر جا رہے ہیں۔ میں بھی نعرہ لگاتا ہوں "نورالدین مردہ باد"۔ آپ میرا ساتھ دیں۔ بس جناب پھر کیا تھا۔ فضا "نورالدین مردہ باد" کے نعروں سے گونج اٹھی۔ مجمع کا جوش بڑھتا گیا۔ لاٹھیاں۔ ہاکیاں اینٹیں ہاتھوں میں اٹھائے آخر یہ جلوس امام دین مقتول کے گھر کے سامنے جا پہنچا۔ جو ایک تنگ گلی میں واقع تھا۔ میں بھی کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ گیا۔ گھر کے صحن میں پہنچ کر قیامت کا سماں دیکھا۔ کئی لوگ خصوصاً نوجوان دیواروں سے سر ٹکرا رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ نورالدین مردہ باد۔ نورالدین لعین ہے۔ نورالدین جہنمی ہے۔ اس کی تکا بوٹی کر دو۔ نورالدین مردہ باد۔ نورالدین مردہ باد۔ نورالدین۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جب غم و غصہ کی شدت میں کمی آئی۔ تو آنکھوں نے یہ سین دیکھا کہ امام دین مقتول کی لاش چارپائی پر پڑی ہے۔ سفید چادر جس کو خون کے دھبے لگے ہوئے ہیں اوپر ڈالی ہوئی ہے۔ دو چھوٹے بچے اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت حسرت کی تصویر بنے پاس بیٹھے ہیں۔ اور ایک نورانی شکل والا معمر شخص لاش کے سرہانے بیٹھا ہے۔ یتیم بچوں کو تسلی دے رہا ہے۔ بیوہ کو اس نے دو سو روپے کفن دفن کے لیے دیے اور کہہ رہا ہے کہ

تو میری بہن ہے۔ میں تیرا اور تیرے مظلوم بچوں کا سارا خرچ برداشت کروں گا جلوس کے لیڈر نے جب اس خضر صورت بزرگ کی ہمدردی کا یہ عالم دیکھا تو حیرت سے پوچھا۔ یہ کون صاحب ہیں؟ بتایا گیا۔ یہی نورالدین ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ نوجوانوں نے اسی نورالدین کو (تھوڑی دیر گزرے جس کے خون کے پیاسے تھے۔) کندھوں پر اٹھا لیا۔ اور نعرہ لگایا "نورالدین زندہ باد"۔ "نورالدین زندہ باد" جلوس گھر سے اسی طرح باہر نکل گیا۔ امام دین کی لاش بے گور و کفن وہیں پڑی رہی۔ اس کی سوگوار بیوہ اور معصوم بچوں کا کوئی پُرسانِ حال نہ بنا۔ لیکن جلوس نورالدین (قاتل) کو کندھے پر اٹھائے اور نورالدین زندہ باد کے نعرے لگاتا ہوا گلیوں میں منتشر ہو گیا۔

مسلم لیگ کی حکومت کے بارے میں کچھ ایسا ہی ہوا۔ قائداعظم کے وصال اور قائد ملت کی شہادت کے بعد لیگ کی قیادت اپنی عظیم ذمہ داریاں نہ پوری کر سکی خود لیگ دھڑوں میں بٹ گئی۔ شخصی اقتدار کی دوڑ نے قومی مسائل کو پس پشت ڈال دیا۔ اور مسلم لیگ زندہ باد والا دور نہ صرف ختم ہو گیا۔ بلکہ اس کے خلاف شدید رد عمل پیدا ہو گیا ہے۔

۱۱ راگست کو کراچی پہنچے۔ تین دن بعد پاکستان بننے کا آئینی اعلان ہونا تھا۔ لیکن ۱۱ راگست کو ہی میاں عبدالباری (مرحوم) صدر پنجاب مسلم لیگ کا تار قائداعظم کو ملا۔ کہ امرتسر میں ایک ہزار سے زائد مسلمان شہید ہو گئے ہیں اور باقی جگہ سے بھی مسلمانوں کو لوٹنے اور قتل کرنے کی خبریں آرہی ہیں۔

یہ خبر بالکل غیر متوقع نہ تھی لیکن اس قدر کشت و خون پر دل افسردہ ہو گیا۔ اصل میں ہندوؤں، سکھوں نے دیر سے منصوبہ بنایا ہوا تھا کہ پاکستان کو کسی صورت نہیں بننے دینا۔ جب بننا یقینی ہو گیا تو یہاں سے سرمایہ اور تجربہ کار لوگ جلدی سے ہندوستان منتقل کر دیے۔ (تاکہ پاکستان میں ریاست کا کام نہ چل سکے۔) پھر آخری حربہ استعمال کیا

کہ ہندوستان سے جو مسلمان مہاجر پاکستان میں بسنے کے لیے نقل مکانی کر کے یہاں آ رہے تھے۔ انہیں بری طرح تہ تیغ کیا۔ ان کی عورتوں کی عصمتیں لوٹیں، ہزاروں اغوا کیں۔ معصوم بچوں کو برچھی کی نوکوں سے شہید کیا۔ مال واسباب لوٹا۔ غرضیکہ ہر طریقے سے یہ انتظام کیا کہ کوئی شخص اس حالت میں پاکستان نہ پہنچ سکے کہ وہاں کام کاج میں امداد دے سکے۔

(میرا اپنا لڑکا سعید احمد جو اس وقت فوج میں لیفٹیننٹ تھا، دہلی میں تھا۔ وہاں سے ٹرین پر لاہور آتا تھا۔ کئی دن تک لاپتہ رہا۔ ہم نے ریڈیو کے ذریعہ اعلان کرائے لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ ساتویں دن وہ اللہ کی مہربانی سے بچتا بچاتا پنڈی پہنچ گیا۔ سنا ہے۔ ان کی ٹرین کے بعد دوسری ٹرین کے سارے فوجی راستہ میں شہید کر دیے گئے) ہندو کا منشا یہ تھا کہ ہر مہاجر اس نوزائیدہ مملکت کے لیے ایک نیا مسئلہ کھڑا کر دے، اور وبال جان بن جائے۔

ہندوؤں کی یہ چال بھی مکمل طور پر کامیاب نہ ہوئی۔ جن کو خدا نے جس حال پاکستان بھیجنا تھا وہ کسی صورت یہاں پہنچے۔ ادھر بھی مشرقی پنجاب کے ہولناک قتل وغارت کا کچھ بدلہ لیا گیا۔ لیکن چونکہ مسلمانوں نے پہلے سے کوئی تنظیم نہ بنائی تھی۔ (اور نہ ہی پہلے کچھ سوچا تھا) اس لیے ہندو زیادہ عافیت سے یہاں سے نکل سکے۔

ہندو کی پاکستان دشمنی ابتدا سے اسی مکاری اور اسی شدت سے جاری ہے مختلف وقتوں میں اس نے مختلف روپ دھارے لیکن منتہائے نظر ایک ہی رہا (اور ہے) کہ (خدانخواستہ) پاکستان کو ختم کرنا ہے۔ اصل میں ہندو اپنے وطن بھارت کو ماں سمجھتا ہے۔ اسی لیے بھارت ماتا کہتا ہے۔ وہ کیسے برداشت کر سکتا ہے کہ اس کی ماں کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

قائداعظم پر ان ہولناک خبروں کا بہت برا اثر پڑا۔ درحقیقت وہ یہ تصور نہیں کر رہے

تھے کہ تقسیم ہند اتنی منحوس ہوگی۔ لیکن غیر مسلموں کے دیر سے بنائے ہوئے منصوبے اور ہماری غفلت آخر رنگ لائی اور پاکستان بنتے ہی ہم پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے تاریخی دن کراچی میں دستور ساز اسمبلی نے لارڈ مونٹ بیٹن (جو اب تک گورنر جنرل و وائسرائے ہند تھے) کی موجودگی میں پاکستان کے قیام کا حسبِ ضابطہ اعلان ہوا۔

للہ الحمد ہر آں چیز کہ خاطر می خواست
آخر آمد زپسِ پردۂ تقدیر پدید

انگریزی پرچم اتار گیا۔ پاکستانی جھنڈا بلند ہوا اور انگریز کا اقتدار ختم ہوا۔ پاکستان بننے کے سبب اگر بیان کرنے لگوں تو بہت وقت درکار ہوگا۔ مختصر یہ کہ۔

(۱) مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد جو حالتِ زار مسلمانوں کی ہوگئی تھی۔ وہ اگر کچھ عرصہ اور جاری رہتی تو مسلمان من حیث القوم ہندوستان میں ختم ہو گئے ہوتے لیکن اللہ تعالےٰ کو منظور تھا کہ اس کے دین کا نور اس کے دشمنوں کی سازشوں کے باوجود ختم نہ ہو۔ بارہا یہ دیکھا گیا ہے کہ جب مسلمانوں کی پستی انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو باری تعالےٰ ان کے پنپنے کے اسباب مہیا کر دیتا ہے۔ قرآنی آیت کا ترجمہ ہے۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

(مولانا ظفر علی خان)

ہندوستان میں بھی اللہ کی رحمت جوش میں آئی۔ شاہ ولی اللہ۔ سید اسمٰعیل شہید سید احمد بریلوی کی قربانیوں سے مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پھر زندہ ہوا لیکن نظریہ حالات یہ تعلیمی میدان تک محدود رہا۔ چنانچہ علی گڑھ کالج قائم ہوا۔ مسلمانوں میں تعلیم جدید کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن اتنا زمانہ گذرنے کے بعد اب بھی مسلمان میں یہ جذبۂ جہاد اسی طرح زندہ

ہے۔ جس طرح اسلام کے روزِ اوّل سے تھا اور وہ اللہ کے رسولؐ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کرنے کو بخوشی تیار ہیں۔ شوقِ شہادت سے بڑھ کر مسلمان کی کوئی بڑی آرزو نہیں ہے۔!

(۲) سر سیدؒ کے بعد کے حالات نے اکثر مسلمان، زعما پر ثابت کر دیا کہ مسلمان کی فوجی روایات سے خائف ہو کر۔ انگریز حاکم ہندو کی ناجائز سرپرستی کر رہا ہے۔ ادھر مسلمانوں کا کچھ حصہ تعلیمِ جدید کے خلاف تھا۔ ان وجوہات کے باعث مسلمان۔ ملازمت تجارت۔ صنعت و حرفت۔ تعلیم۔ وکالت۔ ڈاکٹری۔ انجینئرنگ اور اسی قبیل کے دیگر پیشوں میں بہت پیچھے رہتے جا رہے تھے۔ لہٰذا مسلمانوں نے سب سے زیادہ توجہ تعلیم کی طرف دی۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۳۰ء تک مسلمان لیڈروں نے صرف اعلیٰ تعلیم کو اپنا نصب العین بنالیا۔

(۳) اسی زمانہ میں حسرت و مولانا ظفر علی خاں کے علاوہ وہ مفکرِ اعظم قوم میں پیدا ہو گئے۔ جنھوں نے مغرب کی نقالی کی مذمت کی۔ ان میں جذبۂ خود اعتمادی پیدا کیا۔ اور ملکی معاملات میں ہندوؤں سے جدا رہنے کی تلقین کی۔

شبلی، ظفر علی خاں و حضرت اکبر اس صف میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔ ان بزرگوں نے قوم کے ذہن کی تربیت کی۔ سیاسی معاملات کی ابجد سے واقف کرایا۔ تا آنکہ مفکرِ ملت۔ ترجمانِ حقیقت۔ حکیم الامت علامہ اقبال کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت دی کہ جو زمین اب تیار ہو رہی تھی، اس میں آبیاری کریں۔ تخم ریزی کریں اور امت کے سوکھے باغ میں پھر بہار کا رنگ پیدا کریں۔

RECONSTRUCTION OF ISLAMIC THOUGHT اقبال نے

بالِ جبریل۔ ضربِ کلیم۔ ارمغانِ حجاز۔ جاوید نامہ۔ اسرارِ خودی۔ رموزِ بے خودی۔ مسافر (پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق) لکھ کر ملت کی صحیح رہنمائی کی۔ اس سے پہلے ان کی

"بانگِ درا" دلوں کو ٹٹول چکی تھی۔ دل گداز ہو چکے تھے۔ حکیم الامت کے تازہ فلسفۂ خودی کی تازہ تشریح نے حوصلے بڑھا دیئے۔ نجات کی راہ دکھا دی۔ اس راہِ نجات کا سیاسی پہلو وہ تھا۔ جو اقبال کے خط بنامِ قائدِ اعظم اور ان کے خطبۂ صدارت مسلم لیگ (۱۹۳۷ء) سے واضح ہوتا تھا۔ جس کا خلاصہ یہ تھا۔

(ا) قائدِ اعظم قیادت کی ذمہ داری قبول کریں۔

(ب) مسلمان ایک جدا قوم ہیں۔

(ج) ان کے پنپنے کے لیے ایک علیحدہ خطۂ زمین کی ضرورت ہے۔

(۳) ہندو اور انگریز (اور بیرونی دنیا) کی مخالفت۔ سب ہی تو ہمارے خلاف تھے۔ صرف اللہ تعالےٰ اور اس کا رسولِ مقبول ہمارے ساتھ تھا۔ غیر مسلم جتنی زیادہ مخالفت پاکستان کی کرتے تھے۔ اتنا ہی مسلمانوں کو یقین ہوتا تھا کہ پاکستان کوئی اچھی چیز ہوگی جس کی اتنی مخالفت ہو رہی ہے۔

(۴) قوم کو قائدِ اعظم محمد علی جناح جیسا تجربہ کار۔ سلجھا ہوا۔ بے لوث۔ مخلص۔ قابل دور بیں۔ نڈر۔ معقول۔ ایمان دار۔ دن رات ملّت کے کاموں میں غرق رہنے والا۔ جری۔ دیانت دار۔ سچا۔ قول کا پکا۔ غرضیکہ ہر لحاظ سے اقبالؒ کے "مردِ مومن" کے معیار پر صحیح اترنے والا عظیم انسان بطور رہبر اللہ تعالےٰ نے دے دیا۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم!
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ پاکستان کے حصول میں بہت بڑا حصہ قائدِ اعظم کی

ACROSS THE TABLE

دلیلوں کا ہے۔ جس نے پاکستان کے موقف کو لاجواب بنا دیا۔ اور تمام غیر مسلم (بہ اکراہ سہی) اس بات پر متفق ہو گئے کہ اب پاکستان بنے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ یہ

ایک اٹل حقیقت کی صورت سامنے آیا ہے۔

(۵) قوم میں اتحاد۔ یقین اور تنظیم کا وہ جذبہ پیدا ہوا کہ قائد اعظم کو ایک DISCIPLINED ARMY مل گئی۔ جس نے شرافت سے، قابلیت سے۔ بہادری سے ہر محاذ پر اپنے محبوب قائد اعظم کی ہدایت کے مطابق سیاسی جنگ لڑی۔

(۶) اور اخیر میں (لیکن نہایت ہی اہم بات) یہ کہ نصب العین اتنا پاک۔ بلند اور نیک تھا کہ ملت کا ہر فرد دن رات اسی کوشش میں رہتا کہ ایسی مملکت بنانے میں مدد دے۔ جہاں اللہ تعالےٰ اور اس کے پیارے رسولؐ کے احکام کی مطابقت میں ایک اسلامی ریاست قائم ہوگی۔ اسلامی قوانین رائج ہوں گے۔ اسلامی معاشرہ ہوگا۔ اسلامی ماحول ہوگا۔ اسلام کی سربلندی ہوگی۔ اسلام کا نام دنیا میں روشن ہوگا اور پاکستان دوسرے مسلمانوں کے لیے مشعلِ ہدایت بنے گا۔

سبق پڑھ پھر صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (اقبالؒ)

قائد اعظم کا ایمان تھا کہ پاکستان ساری دنیا ئے اسلام کی خدمت کرے گا۔

یہ ایک دلخراش داستان ہے کہ کس طرح اور کتنی جلدی یہ حسین خواب ایک خواب پریشاں کی شکل اختیار کرگیا۔ اور ہم نے کیا کیا غلطیاں کیں (اور کر رہے ہیں) جن سے پاکستان کا صحیح مقصد ہی فوت ہوتا نظر آتا ہے۔

ہم میں اکثر کام کرنے والوں کا یہ خیال تھا (کم از کم میری تو یہ پختہ آرزو تھی) کہ چودہ، پندرہ اگست ۱۹۴۷ء کی درمیانی رات گزرنے پر ہماری ماہیتِ قلب ہوجائے گی۔ ہم سوکر اٹھیں گے تو ایک نئی ملت ہوں گے۔ جس میں اسلامی اقدار کا رنگ نمایاں ہوگا۔ ہم کل سے بہتر لوگ ہوں گے۔ ہر لحاظ سے۔ خصوصاً کردار میں۔

ہوا یہ کہ پاکستان بنتے ہی ہم کچھ ایسی مشکلات میں گھر گئے۔ جن سب کے لیے

ہم خود ذمہ دار نہ تھے۔ مثلاً مہاجرین کا بے پناہ سیلاب کچھ اس طرح آیا اور وہ بیچارے کچھ اس بے سروسامانی کے عالم میں یہاں پہنچے کہ ڈیڑھ دو کروڑ انسانوں کی آبادکاری ایک نئی ریاست کے لیے وبالِ جان بن گئی۔ پھر معاملہ اس حد تک محدود نہیں رہا۔ خود مہاجرین نے (اور ان سے بڑھ کر "مقامی مہاجرین نے) ایسے مسائل پیش کیے کہ ان سے نمٹنے کے لیے کئی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

تقسیم ہند سے پہلے اس خطہ میں (جو پاکستان بنا) تجارت۔ صنعت وحرفت، سرمایہ کاری۔ بنکنگ۔ جائدادیں وغیرہ تمام کی تمام ہندوؤں کے ہاتھ میں تھیں۔ مشرقی پاکستان میں تو مسلمان اس طرح پر ہندو کا اقتصادی غلام تھا جس طرح اب پھر "بنگلہ دیش" بن جانے پر ہوگیا ہے۔ پاکستان بنتے ہی جائیداد، کاروبار اور دولت کی لوٹ کھسوٹ نے قوم کے کردار کو وہ ٹھیس لگائی کہ اس کے مضر اثرات تادیر مزید معاشرتی خرابیوں کا باعث بنے۔ اس کے علاوہ جو اثاثہ اور دولت ہندو چھوڑ گئے تھے، اس کی لوٹ مار نے ملت کے اخلاق کو پست سے پست تر کر دیا۔ پھر عین تقسیم کے دنوں (بدلہ کے طور پر) ہندوؤں کو قتل کرنے کی افتاد نے قوم کے بعض سرکش اور گندے عناصر کو اس طرح اکسا دیا کہ ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد انھوں نے "اپنوں" پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ جس سے نظم ونسق اور امنِ عامہ کو سخت دھچکا لگا۔ پھر ان تمام مشکلات اور مصائب کے باوجود پاکستان کی بنیادوں کو کوئی خاص نقصان نہ پہنچا۔ ابھی بانیان پاکستان و کارکنان پاکستان میں کام کی اور خدمت کی لگن اسی طرح موجود تھی، اس لیے باوجودیکہ ہر طرف سے یہ کہا جارہا تھا کہ پاکستان چھ ماہ سے زیادہ نہیں چل سکے گا۔ ساری دنیا نے یہ معجزہ دیکھا کہ قائداعظم کی راہبری نے ملت کو سنبھالا دیا۔ نہ صرف پاکستان اس وقت کے دور ابتلا میں قائم رہا۔ اور گو اب ہمارا آدھے سے زیادہ حصہ (بوجوہات) ہم سے کٹ چکا ہے۔ انشاءاللہ نہ صرف بقیہ پاکستان سلامت رہے گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی

کسی دن اپنی غلطی محسوس کرلیں کہ کیوں وہ ہندوؤں کے آلہ کار بنتے۔ اور اس طرح پھر ہمارے پاکستان کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں سیاسی الحاق کرلیں۔ جس کی ایک صورت کنفیڈریشن CONFEDRATION ہو سکتی ہے یا کوئی اور ممکن العمل صورت نکل سکتی ہے۔ اگرچہ بھارت ہر طرح سے ایسے قرب کی مخالفت کرے گا۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے تاریخی اجلاس دستور آئین ساز اسمبلی کے بعد منٹگمری پہنچا تو جلدی فیصلہ کیا کہ لاہور منتقل ہو جاؤں چنانچہ اکتوبر ۱۹۴۷ء کے شروع میں نقل مکانی کرلی۔ منٹگمری کے قیام کے دوران میں نے زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں حصہ لیا۔ وکالت۔ تعلیم۔ خدمتِ اسلام۔ سیاست۔ شہری معاملات۔ ضلعی معاملات۔ غرضیکہ سب طرف کام کیا۔ ۷ سال میونسپل کمیٹی کا ممبر رہا۔ قائم مقام صدر بھی رہا۔ انجمن اسلامیہ کا صدر۔ اخبار "اصلاح" کا ایڈیٹر رہا۔ نیشنل دار فرنٹ کا لیڈر۔ ڈسٹرکٹ جنگی کمیٹی کا سیکرٹری رہا۔ کرکٹ میں، ٹینس میں نام پیدا کیا۔ مسلم لیگ کا کام تو فرض منصبی تھا۔ مختصر یہ کہ نہایت مصروف زندگی رہی اور اچھا وقت گذرا۔ میری زندگی کا یہ بہترین زمانہ شمار ہو سکتا ہے

۹ جنوری ۱۹۶۱ء کو والدہ مرحومہ کا انتقال ہو گیا اور میں بے لوث اور مخلص دعاؤں کے ایک بے بہا خزینہ سے محروم ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میں نے اتنے شفیق والدین کے سایہ میں پرورش پائی کہ بہت کم لوگوں کو یہ دولت خداداد نصیب ہوتی ہے۔ ہر رات سونے سے پہلے دونوں کے واسطے دعائے مغفرت کرتا ہوں۔ یہ معمول ہے ورنہ ہر نماز کے بعد اور جب بھی ان کی یاد آتی ہے۔ ان کے لیے اللہ کی بخشش اور رحمت مانگتا ہوں۔ اللہ تعالےٰ ان کو جنت میں جگہ دے۔ آمین۔

بھائی عنایت اللہ خان اور بھائی بشیر احمد خان کے متعلق بھی میرا یہی معمول ہے۔ ایسے مخلص، ہمدرد دوست اور بھائی دنیا میں کم ملتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ ان دونوں کو مغفرت اور رحمت سے نوازے۔ آمین۔

منٹگمری میں قیام کا اختتام

۱۹۴۷ء

منٹگمری میں چوتھائی صدی کے قریب سینکڑوں واقعات ایسے پیش آئے کہ ایک سے ایک بڑھ کر دلچسپ اور سبق آموز تھا۔ میں صرف دو واقعات کا ذکر کروں گا۔ جن سے اپنے مقام پر قائم رہنے کی برکات کا درس ملتا ہے اور جو زندگی میں مشعلِ ہدایت ثابت ہو سکتے ہیں۔

ابھی مجھے قتل کے مقدمات میں لوگ سیشن جج کی عدالت کے واسطے وکیل مقرر کرنے میں ذرا ہچکچاتے تھے کہ میں نوآموز تھا (صرف ۳۔۴ سال کی پریکٹس تھی) تجربہ نہ تھا۔ لیکن ہوا یہ کہ شہر کے ایک تانگہ بان پر قتلِ عمد کا مقدمہ زیر دفعہ ۳۰۲ ت پ بن گیا۔ وہ غریب اونچے درجے کا وکیل نہ رکھ سکتا تھا۔ مجھے تھوڑی فیس پر مقرر کر لیا۔ مقدمہ مسٹر ایچ۔ اے۔ سی بلیکر MR. H.A.C. BLACKER آئی۔ سی۔ ایس سیشن جج کے پاس ۲۲ دسمبر ۱۹۲۷ء کو پیش ہونا تھا۔ وہ طبیعت کے ذرا سخت تھے۔ زود رنج تھے اور جلدی اکتا جاتے۔ میں نے انگریزی ذہنیت کو زیادہ اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس وقت کے مشہور فوجداری برطانوی وکیل سر ایڈورڈ مارشل ہال SIR EDWARD MARSHAL HALL کے مشہور مقدمات کا بغور مطالعہ کیا۔ اور اپنے زعم میں ان کے طریق کار پر چل رہا تھا کہ مسٹر بلیکر نے اکتا کر کہا: "مجھے وکیل اور گواہ کے درمیان کانا پھوسی پسند نہیں۔ آپ اونچا بولیں۔" میں کچھ گھبرایا اور آواز کو بلند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد جج صاحب نے کہا۔

کہ "آپ کا یہ سوال غیر متعلقہ ہے ۔ میں اس کے پوچھنے کی اجازت نہیں دیتا۔" ۲۲ر دسمبر سخت سردی کا دن ۔ لیکن پریشانی سے میرے ماتھے پر پسینہ نمودار ۔ ابھی میں نے چند ہی سوال اور کیے تھے کہ جج صاحب نے کہا ۔ "آپ میرا وقت ضائع کر رہے ہیں ۔ کوئی معقول سوال پوچھنا ہو تو پوچھیں ورنہ میں آپ کو مزید جرح کی اجازت نہیں دوں گا۔"

میری تو اب بالکل بری حالت تھی ۔ سردی کے باوجود سارا بدن پسینہ میں ڈوبا ہوا تھا ۔ شہر کے کئی لوگ میری گت بنتی دیکھ کر خوش ہو رہے تھے ۔ میری اب یہ حالت تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں ۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا آتا تھا ۔ پھر بھی سنبھلنے کی کوشش کی لیکن قسمت نے یاوری نہ کی ۔ جج صاحب سخت ترش روئی سے بولے "مسٹر نذیر احمد وکیل ایک حد تک جا سکتا ہے ۔ لیکن اگر وہ عدالت کا قیمتی وقت ضائع کرنے پر مُصر ہو ۔ تو عدالت کا فرض ہے کہ اس کو متنبہ کر دے کہ مزید وقت ضائع کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی ۔" اب تو میں نہ رک سکا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا ۔ "جناب والا ۔ اگر آپ اپنے کو میری جگہ تصور کریں تو شاید آپ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ میں اپنی محدود قابلیت سے اپنے موکل کے کیس کی پیروی کر رہا ہوں ۔ وقت ضائع کرنے کی نہ میری نیت ہے نہ میں کر رہا ہوں ۔ یہ پہلی دفعہ ہے کہ کسی فاضل عدالت نے مجھے اس طرح سے خطاب کیا ہے ۔ میں اس پر مودبانہ احتجاج کرتا ہوں ۔" اس پر تو جج صاحب بھنا اٹھے ۔ سختی سے کہا ۔ میں کسی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا ۔ اگر آپ نے کوئی کام کا سوال پوچھنا ہے تو پوچھیں ورنہ جرح ختم کریں ۔" میں نے جرح ختم تو کی ۔ اور چند ایک سوالات جو میں ضروری سمجھتا تھا ۔ پوچھے ۔ عدالت کا وقت ختم ہوا ۔ میں گھر پہنچا تو پہلا تاثر یہ تھا کہ استرے سے اپنا گلا کاٹ لوں ۔ خیال آیا خودکشی حرام ہے پھر سوچا اب کسی جگہ چل کر وکالت شروع کرو ۔ منٹگمری میں تو اتنی بدنامی ہو چکی ہے کہ اب یہاں دکانِ وکالت نہیں چلے گی ۔ بالآخر اس نتیجہ پر پہنچا کہ کلب چل کر خوب زور

سے ٹینس کھیلو اور اپنا غصہ گیند پر نکالو۔

اس زمانہ میں منٹگمری میں ایک ہی کلب تھا FERGUSON CLUB میرا شمار ٹینس کے بہت اچھے کھلاڑیوں میں ہوتا تھا۔ میں کلب پہنچا تو خان بہادر ملک زمان مہدی خاں، ڈپٹی کمشنر، مسٹر پرائس MR. PRICE۔ کپتان پولیس اور سیشن جج صاحب مسٹر بلیکر (تینوں) چوتھے کھلاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر ملک صاحب (جن سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے) بولے لو نذیر احمد آگیا۔ اب خوب کھیل رہے گا۔ میں نے جھوٹ کہا کہ میں تو کھیلنا نہیں چاہتا۔ ملک صاحب نازک طبیعت تھے۔ ناراض ہو کر بولے۔ تو پھر آئے کیوں ہو۔ خیر انھوں نے کسی اور کو چوتھا کھلاڑی منتخب کر لیا۔ جس سے ان کا کھیل بدمزہ ہوا۔ SET (کھیل) ختم ہوتے ہی مسٹر پرائس نے مجھے بازو سے پکڑا۔ کہنے لگے۔ بھلے آدمی کس سے لڑ کر آئے ہو۔ سب کو بدمزہ کر رہے ہو۔ آؤ ایک اچھا چوکا بنائیں۔ کھیل کا لطف آجائے۔ میں نے انکار کیا۔ میں نہیں کھیلوں گا۔ وہ بھی ناراض ہو کر علیحدہ ہو گئے۔ اس زمانہ میں ڈپٹی کمشنر اور کپتان پولیس (نعوذ باللہ) ضلع کے مجازی خدا ہوتے تھے۔ میں نے دونوں کو ناراض کیا اور پھر یہ پتہ نہیں کہ انگریز سیشن جج کو میری حرکت کی وجہ معلوم ہو سکی یا نہ۔ خیر انھی خیالات میں اس طرف چلا۔ جہاں کھونٹیوں پر جرسی۔ مفلر اور کوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ سب ہی کھلاڑی اس طرف جا رہے تھے۔ میں اور مسٹر بلیکر بہ یک وقت کھونٹیوں کے قریب پہنچے۔ مسٹر بلیکر نے مجھے GOOD EVENING کہی۔ میں نے بھی GOOD EVENING سے جواب دیا۔ وہ پوچھنے لگے کہ آپ آج اس واسطے نہیں کھیلے کہ آپ "میرے" ساتھ کھیلنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے بلا تامل جواب دیا۔ "میں آپ کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔" فرمانے لگے۔ "اس واسطے کہ عدالت میں میں نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے۔" میں نے کہا۔ "جی ہاں" فرمانے لگے۔ "دیکھیے" اگر

میں آپ سے کہوں کہ میں نے اپنے آپ کو آپ کی جگہ رکھا اور میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے وہ لفظ نہیں کہنے چاہئیں تھے جو میں نے عدالت میں کہے۔ اور کہ میں وہ تمام الفاظ واپس لینے کو تیار ہوں۔ تو کیا آپ سب کچھ بھول کر میرے ساتھ دوستانہ مصافحہ کریں گے۔" میں نے گرمجوشی سے جواب دیا۔"بخوشی"۔ پھر مصافحہ کیا اور رخصت ہوا۔

دوسرا دن کچہری کا آخری دن تھا۔ کرسمس کی چھٹیاں شروع ہو رہی تھیں۔ ہم جنوری کو عدالت پھر کھلنی تھی۔ مسٹر بلیکر نے کراچی میل پر واپس لاہور جانا تھا۔ جو غالباً ۳ بجے منٹگمری سے ان دنوں گذرتی تھی، لنچ کے قریب مقدمہ ختم ہوا تو فرمانے لگے۔ میں اس مقدمہ میں آج وقت کی قلت کے باعث فیصلہ نہیں سنا سکتا۔ پھر کچہری چار جنوری کو کھلے گی۔ لیکن مسٹر نذیر احمد اگر آپ کا مؤکل ۵۰۰/- روپے کا ذاتی مچلکہ داخل کرے تو میں اسے ضمانت پر رہا کرنے کو تیار ہوں۔ فیصلہ چار جنوری کو سنایا جائے گا۔

میں ابھی ناتجربہ کار وکیل تھا۔ پہلے تو مجھے سمجھ ہی نہ آئی کہ ۳۰۲ قتلِ عمد کا ملزم ذاتی مچلکہ پر بھی رہا ہو سکتا ہے۔ لیکن جب کچہری میں لوگ مبارک سلامت کی صدائیں کرنے لگے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہ تو میرے ملزم کو یقیناً بری کرنے کا پیش خیمہ ہے۔ میں کچہری سے باہر نکلا تو ہر طرف سے مبارک مبارک کی صدائیں اٹھیں۔ کل والا سین لوگ بھول بھال گئے۔ وہ تو نتیجہ کو دیکھتے ہیں۔ مسٹر بلیکر نے اپنے ریمارکس کی تلافی نہ صرف دوستانہ مصافحہ سے کی بلکہ عدالتی کارروائی کے ذریعہ بھی اس کی توثیق کر دی۔

وہ بعد میں ہائی کورٹ کے جج ہو گئے اور کچھ سال بعد انتقال کر گئے۔ لیکن آخری وقت تک میرے بہترین دوست ثابت ہوئے۔ یہاں تک کہ جب میرے برادر نسبتی (بیوی کے بھائی)، مسٹر عبدالعزیز خاں (جو بعد میں مغربی پاکستان ہائیکورٹ کے چیف جسٹس ہوئے) نے سرکاری وکالت کے لیے دوسرے ججوں کی طرح مسٹر بلیکر سے

سرٹیفکیٹ لیا تو انھوں نے عزیز (مرحوم) کے نام کی تعریف کرنے کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا "مزید یہ کہ وہ "خان صاحب" چودھری نذیر احمد خاں ایڈوکیٹ منٹگمری کے برادرِ نسبتی ہیں"۔

مسٹر بلیکر کی رائے میرے متعلق محض اس واسطے بھی ہوئی اور رہی کہ میں اپنے "مقام" پر کھڑا رہا۔ اور نہایت صاف گوئی سے انھیں کہہ دیا کہ میں آپ کے ساتھ نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔

زندگی کا یہ اہم سبق۔ اپنے مقام پر قائم رہنا۔ ہر ایک ذی عزت انسان کو یاد رکھنا چاہیئے اور اس پر سختی سے عمل کرنا چاہیئے۔

دوسرا واقعہ سکھ ڈپٹی کمشنر اور انگریز کپتان پولیس منٹگمری کے متعلق ہے جو پاکستان بننے سے پہلے انتخابات میں یونینسٹ امیدواران کی اس طرح کھلم کھلا امداد کر رہے تھے کہ ان دونوں نے یونینسٹ امیدوار کو اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھا کر شہر میں اس کا جلوس نکالا۔

میں نے جمعہ کی نماز کے بعد لوگوں سے کہا کہ اگر آج غداران قوم کے جلوس دشمنانِ پاکستان ہاتھی پر نکالتے ہیں تو کل قوم ان کو گدھے پر سوار کرنے کی توفیق رکھتی ہے۔

عین انھیں دنوں مسٹر عزیز الحق کامرس ممبر گورنمنٹ آف انڈیا منٹگمری دورے پر آئے تھے۔ میرے وہ پرانے دوست تھے (دو سال پہلے وہ بطور وزیر تعلیم مشرقی بنگال پاک پتن جاتے ہوئے منٹگمری میں میرے مہمان تھے۔) اس دفعہ وہ اپنے سیلون میں صرف تا ٹھہرے۔ میں نے انھیں عصرانہ پر بلوایا۔ ۵۰ معززین شہر و افسران دعوت میں شریک ہوئے۔ لیکن سکھ ڈپٹی کمشنر اور انگریز کپتان پولیس کو نہ بلایا جو صاحبان ضلعوں کے حالات سے واقف ہیں، وہ اس واقعہ کی اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ سب نے اس بات کو نوٹ کیا۔ کسی صاحب نے فرمایا: "سب" موجود ہیں۔ لیکن ضلع کے

حاکمان ڈپٹی کمشنر اور کپتان پولیس موجود نہیں۔ کیا یہ "دانستہ ہے یا نادانستہ"۔ میں نے بآوازِ بلند سر عزیز الحق کو سنا کر کہا۔ بالکل دانستہ طور پر ان کو نہیں بلایا گیا۔ کیونکہ وہ اپنے عہدے سے انصاف نہیں کر رہے۔ وہ سرکاری ملازم کسی سیاسی پارٹی ڈیوٹنیٹ پارٹی) کے نوکر نہیں ہیں۔ وہ انتخابات میں ناجائز حرکات کر رہے ہیں۔ ایسے افسران کو میں کامرس ممبر صاحب کی پارٹی میں پسند نہیں کرتا۔"

انگریز کپتان پولیس جب ٹینس کے لیے ساحی وال انگریزی کلب جاتا (میں ابھی اس کلب کا ممبر تھا) اگر میرے ساتھ کھیلنے کا موقعہ آتا تو میں کھیل چھوڑ کر باہر نکل جاتا کہ میں آپ کے ساتھ کھیلنے کو تیار نہیں۔ آپ کا رویہ سیاسی طور پر مجھے ناپسند ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد یہ انگریز افسر کینیڈا میں مقیم ہو گیا۔ ہر سال اس کا سال نو کا کارڈ آتا۔ پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اس کے بعد بھی کئی سال تک دونوں میاں بیوی سالِ نو کی تہنیت کا پیغام بھیجتے رہے۔ اب چند سال سے یہ سلسلہ بند ہے خدا جانے کون کہاں ہے کہاں نہیں۔

اس واقعہ سے یہی سبق حاصل ہوتا ہے کہ اپنے جائز موقف پر قائم رہنے سے دنیا میں معقول لوگوں میں آپ کی عزت ہوتی ہے۔ عزتِ نفس بڑی چیز ہے یہ قائم رہے تو سب کچھ قائم ہے ۔:۔

لاہور میں وکالت کا دورِ اوّل

لاہور میں میں نے براہ راست ہائی کورٹ میں وکالت شروع کر دی۔ اپنا مکان ابھی لاہور میں نہیں تھا۔ ۱۰ کوئینز روڈ کرایہ پر لی۔ وقار انبالوی صاحب جو آج کل نوائے وقت میں کام کرتے ہیں اور میرے ساتھ (غالباً) ۱۹۴۰ء میں پنجاب گورنمنٹ کے ایک وفد کے ممبر کی حیثیت سے ہندوستان میں متعدد فوجی تربیت گاہوں کا معاینہ کرنے گئے تھے۔ ایک دن بے تعلقی سے فرمانے لگے۔ چودھری صاحب نمبر دس کو کیوں انتخاب کیا۔ (پولیس والوں کی اصطلاح میں نمبر دس بدمعاشوں۔ بدقماشوں کے متعلق استعمال کیا جاتا ہے۔) میں نے بے ساختہ جواب دیا۔ دس ڈاؤننگ سٹریٹ 10-DOWNING STREET (وزیراعظم برطانیہ کی سرکاری اقامت گاہ)۔ ۱۰ اورنگ زیب روڈ دہلی (قائداعظم کی رہائش گاہ) ۱۰ وکٹوریہ روڈ کراچی (وزیراعظم پاکستان نواب زادہ لیاقت علی خاں کی رہائش گاہ) کی رعایت سے۔

سفرِ دہلی

کیش بیلنس کی واپسی کے متعلق

لاہور پہنچے ابھی چند دن ہی ہوئے تھے کہ گورنمنٹ آف پاکستان (وزارتِ مالیات) کی طرف سے تار آیا کہ آپ کو ریزرو بنک آف انڈیا کا ڈائریکٹر نامزد کیا جاتا ہے۔ نئی دہلی جانے کے لیے تیار رہیں۔ ممتاز حسن کل آپ کے پاس پہنچ رہے ہیں۔ ممتاز حسن مرحوم۔ شیخ نسیم حسن کے بڑے بھائی (بعد میں سٹیٹ بنک کے گورنر مقرر ہوئے اور اس وقت ڈپٹی سیکرٹری مالیات تھے۔) میں حیران کہ ریزرو بنک آف انڈیا سے میرا کیا تعلق۔ مجھے تو بنکنگ کی الف۔ بے سے واقفیت نہیں ہے۔ خیال کیا غلطی سے تار بھیج دیا گیا ہے۔ دوسرے دن ممتاز حسن مرحوم آئے کہنے لگے ملک کی INSTRUMENT OF PARTITION کے مطابق کچھ عرصہ تک جب تک ہمارا اسٹیٹ بنک قائم نہیں ہو جاتا۔ پاکستان کے دو ڈائریکٹر ریزرو بنک آف انڈیا کے بورڈ پر مقرر کیے جائیں گے۔ ایک آپ کو اور دوسرے سر مراتب علی شاہ (مرحوم) جو میرے بڑے بھائیوں کی طرح تھے اور پہلے بھی ریزرو بنک آف انڈیا کے ڈائریکٹر چلے آتے تھے۔) کو حکومت پاکستان نے ڈائریکٹر مقرر کیا ہے۔

میں نے ممتاز حسن صاحب سے کہا۔ شاہ صاحب تو پرانے ڈائریکٹر۔ بڑے صنعت کار۔ تاجر اور بنکنگ کے ماہر ہیں۔ بھلا مجھے کس جرم کی پاداش میں ڈائریکٹر نامزد کیا گیا ہے۔ ممتاز حسن صاحب نے واضح کیا بھارت نے خلاف قانون ہمارے حصے

کے پچپن کروڑ روپے ہمارے CASH BALANCES روک لیے ہیں۔ ہمیں ایک ایک قابل وکیل کی ضرورت ہے۔ جس کو پاکستان کا درد بھی ہو اور جو اپنا موقف دلائل سے موثر طور پر پیش کر سکتا ہو۔ اس واسطے وزیر خزانہ و مالیات (مسٹر غلام محمد صاحب مرحوم جو لبعد میں پاکستان کے گورنر جنرل بنے) نے آپ کو منتخب کیا ہے۔

میری مسٹر غلام محمد صاحب مرحوم سے ذاتی واقفیت نہ تھی۔ میں نے مؤکل سے ہدایات لینے کے واسطے ان کو فون کیا اور پوچھا کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ انھوں نے اپنی مخصوص زبان میں کہا۔ ہندو کی بے ایمانی کو عیاں کرنا ہے۔ اس کی لنگوٹی اتارنی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ کام بخوشی مجھے منظور ہے۔ چنانچہ میں اور سر مراتب علی شاہ مرحوم اکتوبر ۱۹۴۷ء کے وسط میں نئی دہلی گئے۔ میرے محترم دوست مسٹر زاھد حسین مرحوم ہائی کمشنر کے ہاں ٹھہرے (جو لبعد میں سٹیٹ بنک پاکستان کے پہلے گورنر ہوئے) دوسرے دن بورڈ آف ڈائریکٹران ریزرو بنک آف انڈیا کا اجلاس ہوا۔ سر چنتامنی دیش مکھ CHINTAMANI DESHMUKH جو کہ گورنر تھے۔ سر پرشوتم داس۔ ٹھاکر داس مسٹر گھنشیام داس برلا (اور اب یاد نہیں اور کون کون جغادری ہندو) دیگر ڈائریکٹران میری طرف ایسے دیکھ رہے تھے، جیسے کھا جائیں گے۔ پاکستان بننے سے پہلے یہ لوگ میرے جیسے عامیوں کی نظر میں راون نظر آتے تھے۔ (ہندو کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے بڑوں کی بڑی قدر کرتا تھا بلکہ بانسوں پر چڑھاتا۔ مسلمان اس کے برعکس اوپر چڑھنے والے کی ٹانگ کھینچتا تھا۔) لیکن آج ایک پاکستانی کی حیثیت سے میں اپنے خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے وہ سب معمولی انسان نظر آتے تھے۔ جن کی نہ صرف مجھے کوئی پروا نہ تھی۔ بلکہ میں سب کا مقابلہ کرنے کے لیے بالکل تیار بلکہ بے چین تھا۔ یوں گھنٹہ تو مختلف طرف سے میری موجودگی پر فضول، اعتراضات ہوتے رہے (یاد رہے کہ ہندو درجہ اوّل کا حیلہ جُو۔ مکار اور تنگ دل دشمن ہے۔) جب گورنر نے سب

اعتراضات سن کر رولنگ (فیصلہ) دیا کہ چودھری نذیر احمد خان بالکل بجا اور قانونی طور پر اس بورڈ کے ممبر ہیں تو اب پچپن کروڑ روپے کو ناجائز طور پر روکنے کے حیلے بہانے تراشنے شروع ہوئے۔ جن کا جواب میں نے پہلے دن ۱½ گھنٹہ کی مسکت تقریر سے دیا کیونکہ پاکستان کا موقف انصاف پر مبنی تھا اور بالکل درست تھا لہٰذا نہایت مضبوط تھا۔ اور مضبوطی سے پیش کیا گیا۔ رات سر وکٹر ٹرنر SIR, VICTOR TURNER پاکستانی وزارت مالیات کے سیکرٹری خاص طیارہ سے دہلی پہنچے۔ ہمارے پاس ہی ٹھہرے اور مجھے گورنمنٹ آف پاکستان کی طرف سے ایک خاص قانونی دلیل پیش کرنے کو کہا۔ میں نے ان کو سن کر کہا۔ اگر معاملہ مجھ پر چھوڑا جائے تو میں یہ دلیل پیش نہیں کرنا چاہتا کہ میری رائے میں یہ PURAILE ہے۔ PUR-AILE۔ کا مطلب ہے CHILDISH یعنی طفلانہ دلیل ہے۔ سر وکٹر نے اصرار کیا۔ میں نے کہا وزیر مالیات سے مشورہ کر لیتے ہیں۔ مسٹر غلام محمد صاحب کو فون کیا۔ سارا معاملہ واضح کیا۔ انھوں نے کہا۔ آپ ہمارے وکیل کی حیثیت سے ہیں۔ آپ کو اختیار ہے جو روش چاہیں اختیار کریں۔ سر وکٹر کہنے لگا۔ یہ معاملہ ابھی بالکل ختم نہیں ہوا۔ کیونکہ میں نے بھی کل بورڈ کے سامنے پیش ہونا ہے اور یہ دلیل پیش کرنے کے واسطے ان کو لکھا ہوا ہے اس کی نقل بھی بھیجی ہوئی ہے۔ میں نے کہا یہ تو اچھا نہ ہوا۔ خیر آپ کل اس طرح کریں کہ عین میری کرسی کے ساتھ لگ کر بیٹھیں۔ میں جس وقت اپنے پیر سے آپ کا پیر دبا دوں آپ فوراً خاموش ہو جائیں۔ معاملہ کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہیں۔ دوسرے دن میں نے پھر دو گھنٹہ تک مخالفوں کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ان کو بھی سمجھ تو آ رہی تھی کہ پاکستان کا کیس بلے پناہ طور پر مضبوط ہے۔ مگر باطنی خباثت سے مجبور تھے۔ نیت بد تھی۔ کئی دفعہ مجھے ٹوکا۔ میں نے پروا نہ کی اور مسکت جواب دیے۔

جب میری تقریر ختم ہوئی۔ تو مسٹر چنتامنی گورنر نے جن کا رویہ سارے وقت معقول رہا سر وکٹر کو کہا کہ آپ نے گورنمنٹ آف پاکستان کی طرف سے کچھ نکات پیش کیے ہیں آپ ان کے متعلق کچھ کہنا چاہتے ہیں؟

میں نے ذرا سر وکٹر کا پاؤں زور سے دبایا۔ وہ چونک کر بولے۔ "نہیں جناب! میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔"

سر چنتامنی دیش مکھ بولے کہ آپ نے اچھا رویہ اختیار کیا ہے۔ کیونکہ اگر آپ معاف فرمائیں تو میں کہوں گا کہ آپ کی گورنمنٹ کی دلیل PU E RAILE ہے۔ عین وہی لفظ جو میں نے ایک دن پہلے استعمال کیا تھا۔ رات کھانے پر سر وکٹر ہنس کر کہنے لگے کہ چودھری صاحب تو غیب دان ہیں۔ وہ بات جو گورنر نے آج کہی انھوں نے پہلے ہی کہہ دی تھی۔ صبح ہمیں ہوائی اڈہ پر پاکستان واپس آتے ہوئے پتہ چلا کہ مسلم دشمن مسٹر پٹیل PATEL اور ڈائرکٹران کی رائے یہ تھی کہ پاکستان کا یہ پچپن کروڑ روپیہ ہضم کر لیا جائے لیکن مسٹر گاندھی نے اصرار کیا کہ ایسا نہ ہونا چاہیئے ورنہ دنیا بھر میں ابتدا سے ہی بدنام ہو جائیں گے۔ چنانچہ بورڈ نے روپیہ پاکستان کو واپس کرنا منظور کر لیا۔

پہلے بھی مجھے ذاتی تجربے سے اس کا ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول کریمؐ کے نام پر حاصل کیے ہوئے پاکستان کے لیے اگر صدق دل سے کام کیا جائے تو اللہ تعالیٰ خود کامیابی کا ضامن ہو جاتا ہے۔ اس واقعہ کے بعد یہ یقین اور پختہ ہو گیا۔

اپریل ۱۹۴۸ء میں ہم دستور آئین ساز اسمبلی کے اجلاس کے لیے کراچی آئے۔ میرا دوسرا لڑکا نسیم احمد (جو اس وقت ماشاء اللہ گرنڈلے بنک کے لندن آفس کا جنرل مینجر اور پہلا غیر ملکی ہے جو اس بلند ترین مرتبہ پر پہنچا ہے۔) کراچی میں بنکنگ کا کام سیکھ رہا تھا۔ ایک دن کھانے پر کہنے لگا۔ لائیے میں آپ کا ہاتھ دیکھ کر آپ کو کچھ آیندہ کے متعلق

بتاؤں۔ میں نے کہا میرا اس پر یقین نہیں۔ کہنے لگا۔ تفریح طبع کے لیے کیا حرج ہے ؟
میں نے پوچھا۔ آپ نے کوئی کتاب وغیرہ دست شناسی کے متعلق پڑھی ہے؟
بولا کچھ دیکھا ہی ہے۔

خیر میرے ہاتھوں کی لکیریں وغیرہ دیکھ کر کہنے لگا۔ آپ جلدی سمندر پار جا رہے ہیں۔ میں نے زور سے طنزاً قہقہہ لگایا۔ واہ نسیم میاں! آپ کے علم کی داد دیتے ہیں۔ جس چیز کا کوئی امکان تک نہیں، اس کی آپ کو خبر ہو گئی۔

خیر بات آئی گئی ہو گئی۔
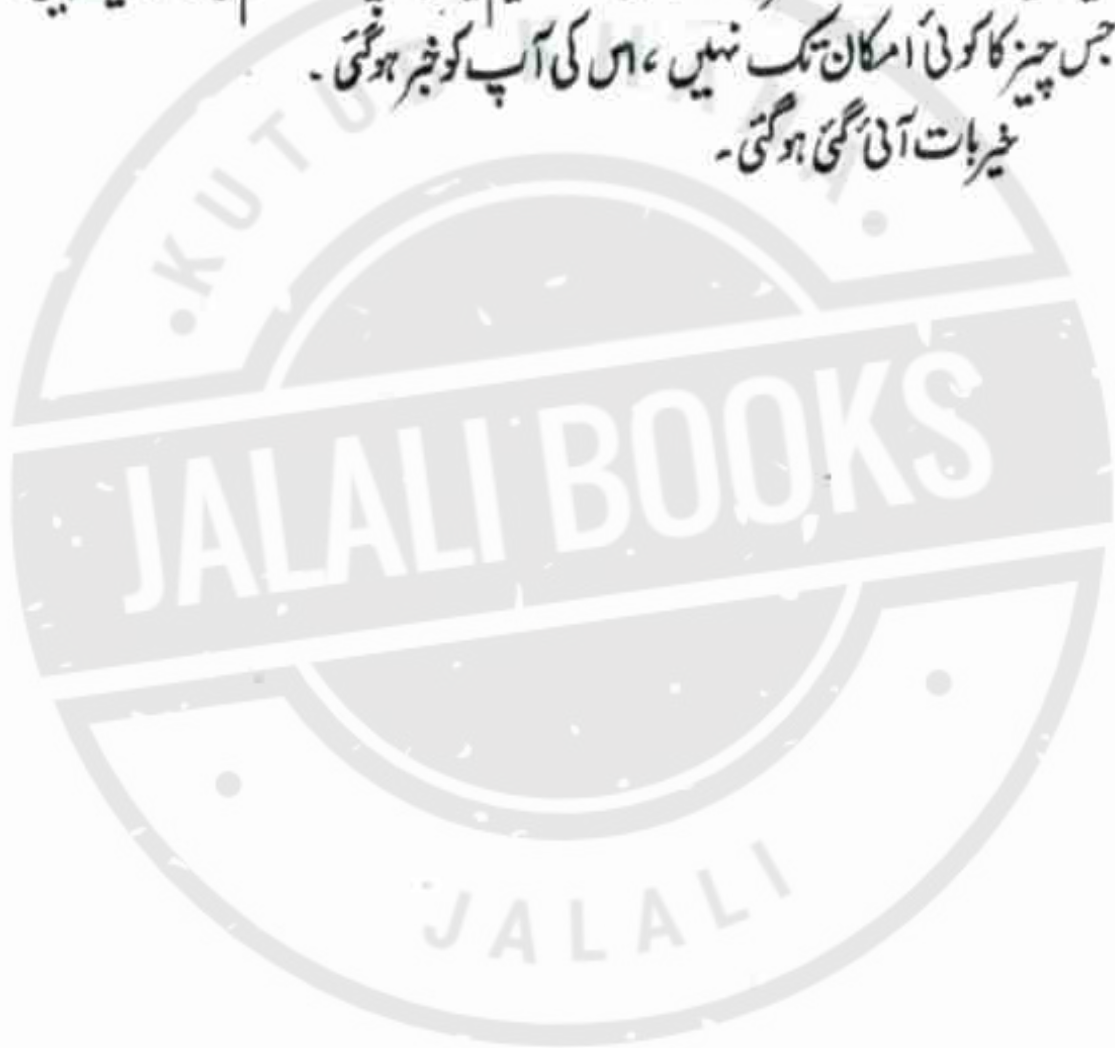
سفرِ انگلستان

بسلسلہ سٹرلنگ بیلنسز

دوسرے دن میں مسٹر غلام محمد وزیر مالیات کی بیمار پرسی کے لیے گیا۔ ان کی طبیعت ناساز تھی۔ وہ اب بہتر تھے۔ مجھے اپنے کمرے میں بلالیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں کرکے کہنے لگے۔ میاں انگلستان چلوگے۔ میں نے کہا۔ کیا معاملہ ہے؟ کہنے لگے۔ پاکستان کے سٹرلنگ STERLING BALANCES کا حکومت برطانیہ سے معاملہ طے کرنا ہے۔ سرکاری اور غیر سرکاری وفد جارہا ہے۔ تم نے چلنا ہے تو چلو۔ ان کی اس غیر متوقع اور اچانک دعوت پر میں نے پوچھا۔ آپ کی اس معاملہ میں میرے لڑکے نسیم احمد سے کوئی بات چیت ہوئی ہے۔ کہنے لگے میں تو نسیم کو جانتا بھی نہیں اور نہ اس بات کا ذکر کسی اور سے کیا ہے۔ خیر کچھ مزید معلومات حاصل کرنے کے بعد میں نے آمادگی ظاہر کی۔ چنانچہ مئی ۱۹۴۸ء کے وسط میں FLYING BOAT کے ذریعے کراچی سے انگلستان ڈاکٹر محمود حسین صاحب (جو ۱۰ اپریل ۷۵ء کو بطور وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی وفات پاگئے) مسٹر حاتم علوی (کراچی کی مشہور شخصیت) اور ایک پارسی مسٹر ڈنشا وفد کے غیر سرکاری ممبران تھے۔ بیرون ملک اور سمندر پار میرا یہ پہلا سفر تھا اور حیران تھا کہ نسیم میاں نے کیسے مجھے پہلے سے بتا دیا کہ آپ سمندر پار جارہے ہیں۔

انگلستان میں ہمارا قیام ایک ماہ دس دن رہا۔ اس عرصہ میں سٹرلنگ

BALANCES کے حساب کے کام کے علاوہ میں نے انگلستان کے مشہور اداروں کے کام کو بغور دیکھا۔ ہاؤس آف کامنز۔ ہاؤس آف لارڈز کے ممبران کے ساتھ چائے پی۔ ان کے اجلاس دیکھے۔ سکاٹ لینڈ یارڈ دیکھا۔ برٹش میوزیم دیکھا (جہاں ان کا اپنا کچھ نہ تھا۔ ساری دُنیا سے لوٹ کھسوٹ کا مال جمع کیا ہوا تھا۔ اپنے صرف STANFHENDGE کے پتھر تھے۔) برٹش لائبریری دیکھی۔ جہاں "ہماری" کتابیں بھی ان کی الماریوں کو زینت دے رہی تھیں۔

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی!
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارہ (اقبالؒ)

INNS OF COURTS میں گیا۔ ہائی کورٹ کا اجلاس دیکھا۔ میٹروپولیٹن کے دفاتر کو بغور دیکھا اور ایسے کئی ادارے اور محکمے دیکھے جن کا ملکی نظم ونسق اور معیشت میں ضروری حصہ ہے۔ ان کے علاوہ اسی عرصہ میں (مئی جون کہ یہ لندن کا بہترین موسم ہوتا ہے۔) (WIMCHIDON) میں عالمی لان ٹینس کے سب سے اونچے درجے کے مقابلے دیکھے۔

انگریز دوسری جنگ عظیم کے بعد قومی کردار میں کافی نیچے گر گیا تھا۔ پھر بھی نظم و ضبط کا یہ عالم تھا کہ جب ٹینس میچ ہو رہا ہو، آپ سٹیڈیم کی پچھلی طرف کی سیڑھیوں پر قدم نہیں اٹھاتے تھے۔ جب تک پوائنٹ POINT ختم نہ ہو جاتے۔ حالانکہ کھیلنے والے آپ سے کم از کم ایک سو پچاس گز کے فاصلے پر تھے۔ یہ احتیاط اس واسطے کہ کہیں ان کی توجہ کھیل سے ہٹ کر آواز کی طرف یا کسی متحرک چیز کی طرف مبذول نہ ہو جائے۔

یہی تنظیم ہم نے ان کے دوسرے کاموں میں بھی دیکھی۔ ہم شاہی مہمان تھے۔ ہمیں ایک خالص انڈہ روز ملتا تھا جو خود بادشاہ کو نہ ملتا تھا۔ ہر خاص و عام کو

چینی کی ایک ٹکیہ ملتی تھی۔ لیکن ہم پر ہماری قیام گاہ پر کوئی پابندی نہ تھی۔ البتہ باہر ہم پر بھی اسی قانون کا اطلاق ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ہاؤس آف لارڈز کے ایک ممبر کے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ وہی ایک ٹکیہ چینی کی ملی۔ میں نے میزبان سے کہا کہ میں میٹھے کا بہت شوقین ہوں۔ ایک ٹکیہ سے تسکین نہیں ہوتی، اس لیے آدھی پیالی بغیر ٹکیہ حل کیے پھیکی پیتا ہوں۔ باقی میں اسے حل کر کے عادت پوری کرتا ہوں۔ بہت ہنسے۔ کہنے لگے میں بھی ایسا ہی کیا کروں گا۔ آپ نے اچھا نسخہ بتادیا ہے۔

دورانِ قیامِ لندن۔ لارڈز کرکٹ گراؤنڈ پر آسٹریلیا اور انگلستان کا ٹیسٹ میچ دیکھا۔ اس زمانے کے سب سے بڑے کرکیٹر سر ڈان بریڈمین (آسٹریلین) SIR DON BRADMAN کو کھیلتے دیکھا۔ کشتیوں کی مشہور دوڑ HENLY REGATTA دیکھی۔ جس موقعہ پر انگلستان کا شاہی خاندان اور امراء بہترین لباس میں شامل ہوتے ہیں۔ جیسے ASCAT کی نیشنل ایبل گھوڑ دوڑ دیکھی۔ مشہور ڈربی ریس بھی دیکھی۔ آکسفورڈ میں شکسپیئر تھیٹر بھی دیکھا۔ سالسبری میں زراعتی نمائش بھی دیکھی۔ لندن میں تھیٹر، سینما، نائٹ کلب دیکھے۔ UNDERGROUND TUBE میں سیر کی۔ B.B.C. سے براڈ کاسٹ کیا۔ بہترین کلبوں میں کھانا کھایا۔ کالج دیکھے۔ انتظامی معاملات کے متعلق جو دیکھتا وہ اور اپنے تاثرات مسٹر لیاقت علی کو بھیجتا رہتا۔

ہمارے وفد کے ممبر مسٹر انور علی (مرحوم) بھی تھے۔ جو اس وقت وزارتِ مالیات میں ڈپٹی سکریٹری تھے (اور وفد کے ممبر تھے) ان سے گہری دوستی ہو گئی جو ان کے بے وقت انتقال تک قائم رہی۔ وہ بعد میں سعودی عرب کی MONETARY AGENCY کے گورنر مقرر ہوئے اور مالی معاملات میں شاہ فیصل شہید کے دستِ راست بنے۔ انھوں نے سعودی ریال کو دنیا کے سکوں میں اعلیٰ مقام دلایا۔ اور سعودی عرب کی بے پناہ دولت کے انبار کی ٹھوس بنیاد قائم کی۔ لندن کے

ECONOMIST نے چند سال پہلے ان کے متعلق لکھا تھا۔ (وہ عجیب صلاحیتوں والا پاکستانی THAT REMARKABLE PAKISTANI جس نے سعودی عرب کی مالیات کو اس طرح سنبھالا ہے کہ دنیا میں اس کا مقام بلند تر ہو گیا ہے۔ ۱۹۶۳ء سے لے کر ۱۹۷۳ء تک جب بھی حج یا عمرہ کے لیے جانے کی سعادت نصیب ہوئی (اور خدا کا شکر ہے کہ کئی بار ہوئی) میں اور میری بیوی اکثر انور علی مرحوم کے ہاں ٹھہرے یا ان کی معرفت کسی دوست کے پاس ٹھہرے یا اگر سرکاری مہمان داری کی وجہ سے ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا تو انور علی مرحوم سے اکثر ملاقات رہتی۔ پہلی بار ۱۹۶۳ء میں انھوں نے وزیراعظم فیصل سے ملاقات کرائی جو اس وقت سربراہِ مملکت تھے۔ وہ خود ساتھ موجود تھے پھر چند سال بعد جب فیصل بادشاہ ہو گئے، انور علی مرحوم کی معرفت (اور ان کی موجودگی میں ان سے کئی بار ملاقات ہوئی۔

انور علی مرحوم کا انتقال اکتوبر ۱۹۷۴ء میں واشنگٹن میں ہوا اور وہ مدینہ منورہ میں دفن ہوئے۔ وہ ایک درویش صفت ہنس مکھ۔ نہایت ہی لیق و فہیم انسان تھے۔ بہت عظیم شخصیت۔ عالم اسلام کے خدمت گذار۔ سعودی عرب کے بادشاہ کے جانثار گورے چٹے (حج کے دنوں میں عربوں والی لمبی قمیض پہنتے جس کو ثوب کہتے ہیں تو بالکل عرب معلوم ہوتے) میں نے اتنی خوبیوں والا انسان بہت کم دیکھا ہے۔ دیار پاک کی دید کی تڑپ تو ہمیشہ دل میں رہتی ہے۔ لیکن جب یہ خیال آتا ہے کہ انور علی کی پیاری شکل اب پھر نظر نہیں آئے گی تو دل میں عجیب اداسی اور اضطراب کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔

قیام لندن کے دوران "انگریز بے وفا" کی موقع پرستی۔ طوطا چشمی اور بدعہدی دیکھنے کے دو نادر موقعے ہاتھ آئے۔ داستان طویل تو ہو رہی ہے لیکن سبق آموز باتوں کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

جب "انصاف پسند"، "امن پسند"، "مہذب" اور مغرب کی آنکھ کا تارا۔ ہندوستان (اب بھارت) کشمیر کو ہڑپ کر چکا تو حیدر آباد دکن پر پولیس ایکشن کے بہانہ ہاتھ صاف کر کے اسے اپنا ایک صوبہ بنالیا تو اکثر لوگوں نے اس کھلی جارحیت پر صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن ہندو اور انگریز کی ملی بھگت نے لارڈ لوئی مونٹ بیٹن۔ مسلمانوں کے سخت دشمن اور پنڈت جواہر لال نہرو کے عزیز دوست، بھارت کے پہلے گورنر جنرل نے) کسی کی کچھ پیش نہ چلنے دی۔ سقوطِ حیدر آباد ایک حقیقت بن گیا۔

ہمارے وفد کے لیڈر مسٹر غلام محمد مرحوم فنانس منسٹر حیدر آباد میں وزیر مالیات رہ چکے تھے۔ نظام حیدر آباد کے حق میں لندن کے اخباروں میں مجھ سے انھوں نے کئی چٹھیاں لکھائیں۔ ایک دن انھوں نے SIR STAFFORD CRIPPS چانسلر آف EXCHEQUER کو لنچ پر بلایا۔ مجھے ساتھ بٹھایا کہ نظام کے حق میں کچھ کہوں۔ یہ وہی سر سٹیفورڈ کرپس تھے جو دورانِ جنگ عظیم ثانی نظام حیدر آباد کو (ان کی شاندار جنگی خدمات کے عوض۔ جب انھوں نے ایک ہوائی سکواڈرن کے لیے رقم دی تھی،) خاص طیارہ کے ذریعہ حیدر آباد گئے اور نظام کو "فرزندِ دلبند سرکار انگلیشیہ" کا خاص خطاب بادشاہ کی جانب سے عطا کیا۔

جب میں نے موقعہ پا کر نظام کا ذکر چھیڑا کہ وہ تو سرکار انگلیشیہ کے بڑے وفادار تھے۔ تو میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولے "میرا بس چلے تو میں نظام کو قریب ترین درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دوں"۔

میں نے غلام محمد صاحب کو لنچ کے بعد ان کے "معزز" مہمانِ خصوصی کے خیالات سے آگاہ کر دیا۔

پھر مسٹر غلام محمد نے مسٹر اٹیلی ATTLEE وزیر اعظم انگلستان کو بلایا اور مجھے ساتھ بٹھایا کہ نظام کے ساتھ جو ظلم ہوا ہے، اس کے متعلق کچھ بات چلاؤں۔ چنانچہ میں نے

موقعہ پاکر نظام کا نام لیا ہی تھا کہ مسٹر ایٹلی نے خالص انگریزی انداز میں 'اونہہ UMPH' کہہ کر مزید گفتگو کا دروازہ بند کر دیا۔

میں نے اس کی رپورٹ بھی غلام محمد صاحب کو دے دی۔

جو کچھ انھوں نے اپنی خاص زبان میں ارشاد فرمایا، وہ میں یہاں لکھ نہیں سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندو کی طرح انگریز بھی مسلمان کا ازلی دشمن ہے۔ اگر پاکستان نے زندہ رہنا ہے تو اُسے ایسا اسلوب اختیار کرنا ہوگا۔ کہ کہیں پھر ہندو اور انگریز کی چال میں نہ آ جائے۔

مئی کے اواخر میں لندن سے واپسی ہوئی۔ ڈاکٹر محمود حسین ہمراہ تھے۔ ان کے برادر بزرگ ڈاکٹر ذاکر حسین (مرحوم) جو بعد میں بھارت کے صدر ہوتے۔ جینوا سوئٹزرلینڈ میں آنکھوں کے علاج کے لیے مقیم تھے۔ تین دن ان کے ساتھ رہے۔ اس عرصہ میں SWISS قوم کے DISCIPLINE نظم و ضبط کو دیکھ کر دل سے دعا نکلی کہ اللہ کرے پاکستانیوں میں بھی یہی صفت آ جائے لیکن عاشق کی دعا کی طرح یہ دعا بھی کچھ الٹی ہی پڑتی رہی ہے۔

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر تو دشمنی ہے دعا کو اثر کے ساتھ

ایک دن میں اور دونوں مرحومین پیدل جا رہے تھے ایک ZEBRA کراسنگ پر (جہاں سے پیدل سڑک پار کرتے ہیں) پہنچے تو میں رکا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین فرمانے لگے "چودھری صاحب آنکھیں بند کر کے بے دھڑک جایئے۔ میاں موت آئی تو شہادت کا درجہ نصیب ہوگا۔ کیونکہ ذمہ داری ہر موٹر ڈرائیور کی ہے۔ پیدل مسافر کی نہیں۔ واقعی دیکھا بھی یہی کہ ہر ڈرائیور فوراً اس بات کا خاص خیال رکھتا ہے۔ سوئٹزرلینڈ کا ہر شہر

سیاح کے واسطے دوسروں سے بہتر اور آرام دہ انتظام کرتا ہے اور سڑکوں اور دکانوں کو زیادہ اچھے طریقے پر سجاتا ہے۔ سبحان اللہ عجیب منظم معاشرہ ہے۔

قیام لندن کے دوران میں نے لندن مسلم لیگ کے دو دھڑوں میں صلح کرائی۔ پاکستان بنتے ہی بعض لوگ فردعات میں جلنے شروع ہوئے اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلاف سے عظیم مقصد حاصل ہونے کے بعد اب خیالات بکھرنے لگے۔ اس افتادگی میں ذاتیات کا پہلو سب سے نمایاں تھا۔

۱۹۶۷ء کے بعد پھر لندن جانے یا ادھر سے گزرنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن ۱۹۵۶ء سے ۱۹۶۷ء تک جب بھی وہاں گئے اپنے عزیز دوست ڈاکٹر اے۔ کے عظیم کے ہاں ٹھہرے۔ وہ اصل میں بھوپال کے رہنے والے تھے۔ انھوں نے لندن میں ڈاکٹری شروع کی۔ عظیم بھائی اب ہارلے سٹریٹ میں پریکٹس کرتے تھے۔ ان کی بیوی اطالوی تھی۔ شرافت اور اخلاق کا مجسمہ۔ لندن کے مضافات میں انھوں نے اپنے خوب صورت مکان میں ہمارے لیے ایک کمرہ مخصوص کیا ہوا تھا۔ جب جائیں کمرہ ہمارے لیے تیار رہتا تھا اور عظیم بھائی وہ خاطر داری کرتے تھے کہ انسان حیران ہوتا تھا۔ اتنا مصروف شخص کس طرح مہمانوں کے لیے اتنا وقت نکال سکتا ہے۔ سب کے ساتھ مروت کا سلوک۔ دوستوں کے عاشق۔ اپنے آرام سے غافل۔ یہ بے نظیر ہستی ان ہی مصروفیات میں دب کر ۱۹۷۱ء کے اوایل میں آنکھوں سے ہمیشہ کیلئے پوشیدہ ہوگئی۔ اِنا للہ و اِنا الیہ راجعون۔ میں نے آج تک اِتنا مہمان نواز اور مخلص دوست کم دیکھا ہے ہمارے لیے لندن عظیم بھائی کے بغیر سُونا نظر آتا ہے اللہ تعالےٰ انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ آمین!

سفرِ انگلستان

بسلسلہ شمولیت کامن ویلتھ پارلیمنٹری کانفرنس

لندن کے قیام کے دنوں میں ہی کامن ویلتھ آف برٹش نیشنز کی پاکستانی شاخ کی تحریک کی۔ جون کے اوائل میں وطن واپس پہنچا۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء میں اڑتیس ۳۸ ملکوں کی کامن ویلتھ پارلیمنٹری کانفرنس لندن میں منعقد ہونی قرار پائی۔ اس وقت ہم نے یہاں مجوّزہ شاخ قائم کرلی تھی۔ پاکستان کو بھی شمولیت کی دعوت آئی۔ مسٹر لیاقت علی خاں (مرحوم) نے مجھے کہا کہ آپ اس پارلیمانی وفد میں شریک ہوں۔ میں نے کہا۔ آگے دو ماہ سے میں نے وکالت کا کام چھوڑا ہوا ہے۔ اب پھر ڈیڑھ ماہ کے لیے کام سے غیر حاضر نہیں ہو سکتا۔ دوسرے حال ہی میں انگلستان ہو آیا ہوں۔ انھوں نے اصرار کیا اور کہا کہ آپ نے تو شاخ قائم کرنے کی تحریک کی تھی۔ اب شاخ قائم ہو چکی ہے تو آپ کو کام کو آگے بڑھانے میں عملی مدد کرنی چاہیئے۔ میں نے کہا وکالت میرا واحد ذریعۂ آمدنی ہے۔ حال ہی میں منٹگری سے لاہور منتقل ہوا ہوں۔ کثیر المیعاد غیر حاضری سے مجھے سخت مالی نقصان ہوگا۔ مجھے مجبور نہ کیا جائے۔

میں سمجھا تھا کہ بات ختم ہوگئی لیکن ملک فیروز خان نون (مرحوم) اور بعض دیگر احباب سے پتہ چلا کہ وزیرِاعظم میرے انکار سے کبیدہ خاطر ہیں۔ لیکن میں مجبور تھا۔ وکیل کے لیے مدت تک پیشے کو چھوڑنا مشکل ہوتا ہے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء کو اچانک یہ روح فرسا خبر سنی کہ بانیٔ پاکستان، بابائے ملت ہمارے پیارے اور برگزیدہ رہنما، اقبال کے مردِ مومن، قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ ہمیں دائمی مفارقت دے کر ایسے وقت

میں ہم سے جدا کر لیے گئے جب ہم پوری طرح پاؤں پر کھڑے بھی نہ ہوئے تھے۔ اِنّا لِلّٰہِ و اِنّا اِلیہِ راجِعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے اور ان کی یادگار (پاکستان) کو ہمیشہ زندہ اور پائندہ رکھے آمین۔

جب اس اچانک اور عظیم صدمہ کے اثرات سے پہلی بار سنبھلا تو مسٹر لیاقت علی خاں کو تار دیا۔

"REDEDICATE MYSELF TO THE SERVICE

OF PAKISTAN."

"پاکستان کی ہمہ تن خدمت کے لیے دوبارہ اپنے آپ کو وقف کرتا ہوں"۔

اب جب کہ پاکستان کے لیے کام کرنے کا بوجھ ہمارے کندھوں پر براہِ راست آپڑا تھا' وکالت وغیرہ کی پرواہ سے بے نیاز ہونا پڑا اور اپنی زندگی پھر سے پاکستان کی خدمت کے لیے وقف کردی۔

چند دن بعد وزیراعظم صاحب کا تار آیا۔

"PROCEED TO LONDON AS MEMBER OF

COMMON WEALTH PARLIAMENTARY

DELEGATIONS."

میں نے فوراً ہاں کردی۔ اب "نہ" کا تو سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اس دفعہ میری بیوی میرے ساتھ گئیں (اور پھر تمام عرصہ جب میں دنیا کے مختلف ممالک میں گیا، وہ میرے ہمراہ رہیں) انھیں سفر کا تو شوق تھا لیکن ہماری سب سے چھوٹی لڑکی (ایک ہی لڑکی) کو اکیلا چھوڑنے کا خیال بار بار یہ سوچنے پر مجبور کرتا تھا۔ اُدھر نصرت ماشاءاللہ سیانی تو تھی۔ ماں سے پہلی بار ڈیڑھ ماہ کے لیے جدا ہونے پر پریشان ہوگئی (اس کے بعد تو وہ خود ماشاءاللہ نصف یورپ پھر آئی اور حج بھی کیا) لیکن پہلی بار بچی کو اکیلا چھوڑنے پر ضرور دونوں طرف سے کچھ خوشی کا اظہار نہ کیا گیا۔

بہرحال ہم لندن پہنچے۔ مسٹر تمیزالدین خاں مرحوم ڈپٹی سپیکر دستور ساز اسمبلی ہمارے لیڈر

تھے۔ برٹش کامن ویلتھ کے ۳۸ ممالک اس کانفرنس میں حصہ لے رہے تھے۔ نہ معلوم تمیز الدین خاں صاحب کے اندرونی جذبات کیا تھے۔ میں نے تو دل میں فیصلہ کیا کہ بھارت کے پول، اس کی جارحیت اور اس کی مکارانہ پالیسی کو ظاہر کرنے کا اگر کوئی موقعہ آیا تو اسے ہاتھ سے نہ جانے دوں گا اور پاکستان کے موقف، اس کی وجہِ تسمیہ اور اس کے عزائم سے کانفرنس کے ممبروں کو آگاہ کر دوں گا۔

ہم نے کانفرنس کے دوران انگلستان کے کئی شہروں کا دورہ کیا۔ شروع ایڈنبرا سے ہوئے۔ جہاں سو سال بعد قلعہ کے تاریخی کھانے والے کمرہ میں تمام مندوبین کے ڈنر کا انتظام تھا۔ مجھے کہا گیا کہ میں نے دوسرے کی پہلی تقریر کرنی ہے اور پاکستان اور سکاٹ لینڈ کا ٹوسٹ TOAST پیش کرنا ہے (یعنی ان کے تعلقات وغیرہ پر روشنی ڈالنی ہے۔) میں نے سکاٹ لینڈ والوں کے کئی لطیفے بیان کیے (جن کے واسطے وہ بہت مشہور ہیں۔) جو بے حد پسند کیے گئے۔ یہ بھی کہا کہ ہمارے پہاڑی علاقوں میں آپ کی سی صفات رکھنے والے (پٹھان) ہیں۔ جو ہر دشمن کی سرکوبی کرنے کو تیار ہیں۔ چنانچہ کسی کو جرأت نہ ہونی چاہیئے کہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ تقریر ماشاء اللہ بے حد پسند کی گئی۔ بعض مندوبین نے کہا۔ ہم کہتے تھے کہ اس شخص کی شکل ابراہیم لنکن (مشہور صدر امریکہ) سے ملتی ہے، اب پتہ چلا کہ تقریر کرنے کی صلاحیت بھی اس جیسی ہے۔ تقریب کے اختتام پر تمیز الدین خاں صاحب (مرحوم) فرمانے لگے۔ سکاٹ لینڈ کے اٹارنی جنرل میرے پاس بیٹھے تھے۔ آپ کی تقریر کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی رازدارانہ لہجے میں کہا۔ ہندو کو اس طرح عریاں نہ کریں۔ انگریز کہیں اس روش کو ناپسند نہ کریں۔

میں نے کہا۔ ہم انگریز سے آزاد ہو چکے ہیں اور اب ہمیں ان کی کوئی پروا نہ ہونی چاہیئے اور میں تو آپ کے وفد میں شامل ہی اس نیت سے ہوا ہوں کہ پاکستان کو دنیا سے روشناس کراؤں اور بتاؤں کون ہمارا حاسد ہے اور ہم اسلامی ریاست ہوتے ہوئے بھی اقلیتوں کی زیادہ محافظت کرتے ہیں، بہ نسبت متعصب ہندوؤں کے۔ جو سیواجی کے پیرو ہیں۔ بغل گیر بھی ہونا اور پیٹھ میں خنجر گھونپنا۔ میں تو اپنی روش پر قائم رہوں گا۔ انشاء اللہ میں نے تو پاکستان کو

PROJECT (پیش) کرنا ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اکثر لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ پاکستان کوئی علیحدہ ملک ہے۔ وہ اس کو ہندوستان کا حصہ سمجھتے ہیں اور بعض کی نظر میں پاکستان اور فلسطین PALESTINE میں کوئی تمیز کرنی مشکل تھی (یوں تو بدقسمتی سے اب تک بھی پاکستان کو دنیا بھر سے باقی دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جا رہا۔ ہماری بین الاقوامی ساکھ اونچی نہیں گئی، گر رہی ہے۔) اس ڈیڑھ ماہ کے دورۂ انگلستان میں کئی مفید سبق حاصل کیے :-

(اوّل) انگریز اتنی سیاسی قوم ہے کہ اپنے مفاد کے لیے وہ ہر حالت کو قبول کر لیتی ہے اور یہ بڑی مفید عملی صفت ہے۔ کل تک انگریز ان ۳۸ ملکوں پر حاکم تھا۔ بالجبر۔ اب طاقت نہ رہی تو ان کو آزاد کرنا پڑا۔ لیکن تجارتی اور اقتصادی تعلقات کو برقرار رکھنے کی روش کو قائم رکھا کہ انگلستان کو ان ملکوں سے خام مال کی ضرورت ہے۔ ان سے برٹش کامن ویلتھ میں مساویہ حیثیت کے نئے تعلق کا فائدہ اٹھایا جائے۔

یہ بات یاد رہے کہ اس برٹش دولت مشترکہ کی نہ کوئی قانونی یا آئینی حیثیت ہے، نہ خاص سیاسی مقام حاصل ہے۔ صرف ایک عملی صورت تعلق قائم رکھنے کی وضع کی گئی ہے جس میں حسبِ سابق انگلستان کو زیادہ فائدہ ہے دیگر ممبران کو کم۔

(دوم) کسی بنیادی یا بڑی صنعت کو ایک خاص مقام تک محدود نہیں رکھنا چاہیئے۔ بلکہ اسے ملک میں پھیلا دینا چاہیئے۔ انگلستان اور سکاٹ لینڈ کے مختلف حصوں کا دورہ کرنے پر اس بات کا انکشاف ہوا۔

مثلاً جہاز سازی کا مرکز گلاسگو تھا۔ ہٹلر HITLER نے پہلے ہی حملہ میں اس کا صفایا کر دیا اگر یہ سارے ملک میں پھیلا ہوتا تو تباہی آسان نہ تھی۔

(سوم) ترقی کرنے والے ملکوں کو باہر سے ماہرین کے بلانے میں بہت احتیاط کرنی چاہیئے کیونکہ ان میں سے اکثر مقامی حالات سے واقف نہیں ہوتے۔

(چہارم) کئی پُرلطف باتیں بھی کانفرنس کے دوران ہوئیں (۱) سر طفاوا بلیوا۔ مُسلم وزیراعظم نائیجیریا (جن کو بعد میں غیر مسلموں نے شہید کر کے نر ۴، مسلمان ملک پر عیسائی حکومت کرلی ہوئی ہے۔) سے میرے خاص مراسم ہو گئے، وہ بڑے پکّے اور دین دار مسلمان تھے۔ (شاید اسی لیے ان کو جان کی قربانی دینی پڑی۔) (۲) کیمبرج میں ایک کالج میں ہمارا لنچ تھا۔ مسٹر مولنکر MOUL - ENKAR - بھارتی لوک سبھا کے صدر (جو ایک برہمن تھے۔)، اس دن کے مقررِ خصوصی تھے۔ انھوں نے خالص مہاتما گاندھی کے انداز میں انسانیت کی برابری پر وعظ کیا اور یونیورسٹی میں کالے گورے، چھوٹے بڑے، اونچے نیچے کی تفریق کے خلاف دریا کھیان دیا۔ حاضرین یقیناً ان کی وسیع النظری سے متاثر ہو رہے تھے۔ میرے پاس کالج کے ایک ماسٹر بیٹھے ہوئے تھے۔ جو ہندوستان کافی عرصہ رہ چکے تھے (انگریز بڑے کایاں ہوتے ہیں۔ مساوات کے بھرپور جذبات کی تشریح ایک برہمن کی زبان سے جو چھوت چھات کا یہاں تک قائل ہے کہ اگر شودر کا سایہ برہمن پر پڑ جائے تو وہ واجب سزا ہے۔) سن کر جھک کر میرے کان میں کہنے لگے "CHAUDRI SAHIB, IS IT NOT THE DEVIL-QUOTING THE SCRIPTURE"

"چودھری صاحب! کیا یہ شیطان کے انجیل سے حوالہ جات دینے کی مثال نہیں ہے؟" انگریز نے ہم جیسے نادانوں کو اپنی ظاہری شان و شوکت کے ذریعہ بہت متاثر کرنے کی کوشش کی جو رسماً ان کے لیے جائز تھی لیکن اپنی گھریلو زندگی میں ابھی تک AUSTERITY (انتہائی سادہ) زندگی کے قائل تھے (ان اسباق کا وقت آنے پر میں نے کافی فائدہ یا نقصان اٹھایا)

(۳) لندن میں کانفرنس کے دوران ایک بھارتی مندوب نے جنوبی افریقہ کی نسلی پالیسی کی سخت مذمت کر کے ایسا نقشہ پیش کیا اور کہا کہ بھارت نسلی یا مذہبی امتیازات کو ہرگز اہمیت

نہیں دیتا۔ میں نے تمیز الدین خاں صاحب کو کہا۔ اٹھ کر اصل حقیقتِ حال بیان کرو۔ وہ خاموش رہے۔ پھر میں نے اپنے سیکرٹری مسٹر ایم۔بی۔ احمد (جو اب سابق مسٹر جسٹس ایم۔بی۔ احمد ہیں) سے کہا کہ میرا نام چیئرمین کے پاس بھیجو۔ تین سے پانچ منٹ تک تقریر کرنے والوں میں۔ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ میں نے (کانفرنس کے عملہ کے آدمی کو) خود چٹ CHIT دی کر چیئرمین کو دو۔ تھوڑی دیر بعد مجھے بلایا گیا۔ میں نے ہندوستانی مندوب کے نیک اور پُر تر خیالات کی بھرپور حمایت کی کہ نسل، رنگ اور مذہب کی بنا پر کوئی امتیاز نہیں ہونا چاہیئے۔ جنوبی افریقہ والوں پر تو جیسے اوس پڑ گئی۔ یک نہ شد دو شد بھارت تو تھا ہی۔ اب پاکستان بھی اس کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ بیچارے خفیف ہو کر بیٹھے ہوئے تھے جو میں نے باآواز بلند کہا۔

مسٹر چیئرمین۔" جہاں میں ان جذبات کی تعریف کرتا ہوں، وہاں میں اپنے ہندوستانی دوست سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ خود ان سنہری اصولوں پر اپنے ملک میں بھی عمل درآمد کر رہے ہیں ؟"

چار ماہ ہوئے۔ اسی لندن میں دو سٹرلنگ بیلنس STERLING BALANCES ڈیلیگیشن آئے۔ ایک پاکستانی۔ ایک بھارتی۔ غیر سرکاری پاکستانی وفد کے چار ممبران تھے جن میں ایک پارسی تھے۔ حالانکہ پاکستان کے (اس وقت کے دس کروڑ باشندوں میں) وہ رائی کے دانے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بھارتی وفد کے ۳۵ ممبران تھے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان میں کتنے مسلمان تھے ؟ یہ حقیقت ہے کہ ایک بھی مسلمان نہ تھا۔ حالانکہ مسلمان بھارت کی آبادی کا کم از کم آٹھواں حصہ ہیں۔

مسٹر چیئرمین! اور کیوں جایئے۔ اسی وفد کی موجودہ تشکیل پر نظر ڈالیے۔ ہم پانچ ہیں جن میں سے ایک ہندو (اقلیت کے نمائندے) مسٹر چٹوپادھیا (پاکستان نیشنل کانگریس کے صدر ہیں۔) ہمیں اپنی اقلیتوں پر اعتماد ہے۔ ان کو ہم پر ہے۔ بھارتی وفد کے ۳۴ ممبران میں سے ایک بھی مسلمان نہیں ہے۔ میں پوچھتا ہوں۔ کیوں ؟ کیا سب بھارتی مسلمان ملک باغی ہیں یا ہندو حکومت کو ان پر اعتماد نہیں ؟

وعظ و پند و نصیحت تو بڑی اچھی بات ہے لیکن اگر کہنے والا خود اس پر عمل نہ کرے تو محض تو ضیعِ اوقات ہے!

بس جناب! میں تو اپنی کرسی پر واپس آ بیٹھا۔ لیکن جنوبی افریقہ کے مندوبین نے اٹھ کر پرجوش تالیاں بجائیں کر کیا ٹھکانا۔ شاباش پاکستان PAKISTAN WELLDONE کے نعرے لگائے اور ان کے وفد کے کئی ممبران نے مجھے کہا کہ آپ پاکستانی وفد کے لیڈر کیوں نہ بنے؟ آپ کو بننا چاہیئے تھا۔

(۴) دورانِ قیامِ لندن بہت سے لندنی پاکستانی مسلمان میرے پاس آئے اور کہا کہ پاکستان ایک اسلامی ملک ہے۔ اس کی سرکاری تقریبات میں کھلم کھلا شراب پی اور پلائی جاتی ہے ہندوستان ایک غیر مذہبی ریاست ہے۔ ان کی سرکاری تقریبات میں شراب ہرگز استعمال نہیں ہوتی۔ آپ ہمارے ممبر پارلمینٹ ہیں۔ آپ وزیراعظم کے پاس ہمارے ساتھ چلیں (جو لندن میں ہیں) اور سخت احتجاج کریں۔ چنانچہ ہم ایک وفد کی صورت میں مسٹر لیاقت علی کی خدمت میں پہنچے۔ سر ظفر اللہ وزیر خارجہ اور مسٹر ابراہیم رحمت اللہ ہمارے ہائی کمشنر بھی موجود تھے۔ ہم نے شکایت پیش کی۔ اُدھر سے کچھ عذرات سنے۔ ہم نے زور دیا۔ انھوں نے کہا۔ غور کریں گے۔ چنانچہ آج تک معاملہ زیرِ غور ہی نہیں۔ اب تو فارن سروس میں داخل ہونے والوں کو خاص ماہرین (سب ماشاءاللہ مسلمان) لیکچر دیتے ہیں کہ فلاں شراب فلاں وقت دی جاتی ہے۔ فلاں شراب فلاں وقت۔ اس شراب کے لیے اس قسم کے گلاس ہوتے ہیں۔ دوسری کے لیے دوسرے اور اسی قسم کی خرافات پڑھائی جاتی ہیں۔

انا للہ وانا الیہ راجعون!

ایک (المناک) لطیفہ بھی سن لیجیے۔ فروری ۱۹۷۴ء میں جو چوٹی کی کانفرنس مسلم سربراہوں کی لاہور میں ہوئی تھی، اس کی تیاریوں کے دنوں میں لاہور کی ایک مقامی کلب کے نوٹس بورڈ پر یہ خوشخبری دی گئی کہ بحکم پنجاب گورنمنٹ فلاں فلاں قسم کی اعلیٰ شراب اب ممبران کو نہیں دی

جائے گی۔ کیونکہ وہ سب اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقعہ پر استعمال ہوتی ہے!!

لندن میں قیام کے دوران مسٹر لیاقت علی خان نے بیان دیا کہ ہم تو ہمیشہ انگریز سے دوستی رکھیں گے۔ روس اور ہمارے درمیان کوئی قدرِ مشترک نہیں ہے۔ میں نے ان کو کہلا بھیجا آپ نے یہ بیان اچھا نہیں دیا۔ میں خود تو بوجہ بیماری نہ مل سکا۔ پیرس میں جہاں ہم سب لوگ جمع تھے۔ چودھری محمد علی صاحب کو جو اس وقت سیکرٹری جنرل تھے (اور بعد میں وزیراعظم ہوئے) جناب لیاقت علی نے میرے پاس بھیجا۔ میں نے ان سے کہا پاکستان جیسے نوزائیدہ (فی الحال کمزور) ملک کو ابھی اس طرح دوستی دشمنی کا اعلان نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں تو ابھی سب کو دوست بنانا چاہیئے۔ اپنا خام مال اچھے داموں بیچنا چاہیئے۔ پھر کچھ سال بعد جب طاقت اور سکت آجائے گی، دوست دشمن کا بھی تعین کرلیا جائے گا۔

لات دنیا پہ نہ مارو ابھی اے حضرتِ شیخ
بیٹھکیں کرلو ذرا زور تو کچھ ران میں ہو (اکبرؔ)

(۵) مجھے رہ رہ کر دل میں خیال آتا رہا کہ جب اس قسم کی مصنوعی دولتِ مشترکہ چل سکتی ہے تو مسلمان ممالک کی دولتِ مشترکہ کیوں قائم نہیں ہوسکتی۔ جس کی بنیاد قدرتی اور ٹھوس ہو گی۔ ایک خدا۔ ایک رسولؐ۔ ایک کتاب۔ ایک نظریۂ زندگی۔ ایک تاریخ۔ ایک مستقبل!! میں روز بروز اس خیال کا اور جمعیتِ حرم PAN ISLAMISM یعنی اتحادِ عالمِ اسلامی کا قائل ہوتا گیا۔

لندن سے واپسی پھر FLYING BOAT "اڑن کشتی" کے ذریعہ ہوئی۔ میری طبیعت ناساز تھی۔ ہلکا سا بخار آتا تھا۔ ۶ نومبر ۱۹۴۸ء کو لندن سے ساؤتھ ہیمپٹن پہنچے۔ میرے پھوپھی زاد بھائی محمد اختر خان (موجودہ پرنسپل کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور اور پاکستان کے ممتاز ڈاکٹر) جو اس وقت لندن میں زیرِ تعلیم تھے، میری دیکھ بھال کے لیے ساتھ آئے۔ موسم بہت خراب تھا۔ ٹھنڈ اور دھند میرے لیے تکلیف دہ تھیں۔ خدا خدا کر کے ۷ نومبر ۱۹۴۸ء کو ۱۱ بجے ہماری فلائنگ بوٹ کی پرواز کا اعلان ہوا۔ بھائی اختر سے رخصت ہوئے اور کوئی ایک گھنٹہ کی پرواز کے بعد فرانس

پرسے گزر رہے تھے۔ موسم بہتر ہوا STEWARD لنچ کے لیے میز لگا رہا تھا کہ جہاز نے ایک بڑا چکر کاٹا جو معمول کے مطابق غیر ضروری تھا۔ سب حیران تھے کہ کیا بات ہوئی۔ اتنی دیر میں جہاز کے کپتان کی آواز آئی کہ ایک انجن میں خرابی ہوگئی ہے۔ میرا سفر بہت لمبا ہے (آسے سڈنی آسٹریلیا جانا تھا) میں احتیاطاً واپس ساؤتھمپٹن SOUTHAMPTON جا رہا ہوں۔ کوئی خطرہ کی بات نہیں لیکن احتیاط لازمی ہے۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ STEWARD نے جلدی سے میزوں کے برتن وغیرہ سمیٹ لیے۔ کپتان کے اعلان پر سبھی مسافر پژمردہ سے ہوگئے کہ پھر وہی تکلیف دہ موسم۔ (اور پھر ڈاکٹر اختر بھی واپس لندن چلے گئے ہوں گے) پھر کپتان کے اعلان کے باوجود کچھ خطرہ کا بھی احساس ضرور تھا۔ پاکستان سے چلتے وقت ایک دوست نے چند دعائیں لکھ کر دی تھیں۔ پرواز کرتے وقت (بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا) پرواز میں (یا حفیظ یا عزیز یا رفیق) اترتے وقت الحمد للہ اور اگر کوئی خطرہ محسوس ہو تو حضورِ قلب سے یا رحمٰن کا ورد کرنا) چنانچہ ہم دونوں میاں بیوی نے پورے یقین اور توجہ سے "یا رحمٰن" پڑھنا شروع کیا۔ قلب پر ایک عجیب کیفیت طاری تھی۔ یا رحمٰن کا ورد سب خطروں سے نجات دینے والا ثابت ہوا۔ کوئی پندرہ بیس منٹ کے بعد جہاز نے ایک اور بڑا چکر کاٹنا شروع کیا۔ کچھ سمجھ نہ آئی کہ یہ کیوں ہوا؟ کیا ہو رہا ہے؟ اچانک کپتان کی پھر آواز آئی۔ خواتین و حضرات! ایسا معلوم ہوتا ہے کوئی معجزہ ہوا ہے۔ انجن بالکل درست چل رہا ہے۔ کسی خرابی کے آثار نہیں اور ہم اپنے راستہ پر مارسیلز کی طرف جا رہے ہیں۔ اطمینان سے کھانا کھائیے اور قطعاً کوئی فکر نہ کیجیے اگر کہیں پہلے اترنے کی ضرورت پڑی تو ہم فوراً اتر سکتے ہیں (کراچی تک ایسی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔)

اللہ کے پاک کلام میں بڑی برکت ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے یہ معجزہ دیکھا اور اس بات کا اور زیادہ یقین ہوگیا کہ وہ دل سے پکارنے والوں کی سنتا ہے۔ آپ کو بے نظیر وارثی کا شعر یاد آیا ہوگا۔

گلہ بے نظیر اس کی رحمت کا کیا ہے   کبھی تو نے دل سے دعا کی تو ہوتی

ہماری یہ دعا تو ایسے قبول ہوئی کہ ہم خود حیران رہ گئے کہ اسے قبولیت میں ذرا دیر بھی نہیں لگی۔ سبحان اللہ۔ سبحان اللہ۔

وطن پہنچتے ہی میں نے اس مہم کا آغاز کیا کہ ہم برطانوی دولت مشترکہ سے الگ ہو جائیں اور تمام مسلمان مل کر اپنی علیحدہ دولت مشترکہ قائم کریں۔

چنانچہ پہلی بار ۱۴ر نومبر ۱۹۴۶ء گورنمنٹ کالج لاہور میں تقریر کرتے ہوئے دولت مشترکہ ممالک اسلامیہ کی تجویز پیش کی۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس تاریخ سے لے کر آج تک میں نے ہر وقت اسی مقصد عظیم کو پیش نظر رکھا اور جو کچھ مجھ سے ہو سکا، اُس کے واسطے کیا۔

غالباً ۱۹۴۸ء کے اواخر میں مجھے پنجاب گورنمنٹ ایکشن انکوائری کمیٹی کا ممبر مقرر کیا گیا۔ دوسرے ممبر میر غلام بھیک نیرنگ (مرحوم) تھے جو میری طرح دستور ساز اسمبلی کے ممبر تھے۔ صدر شیخ فیض محمد مرحوم تھے جو پنجاب اسمبلی کے صدر تھے لیکن چونکہ پنجاب اسمبلی معطل ہو چکی تھی اور صوبہ میں گورنری راج تھا، شیخ صاحب اسمبلی کے کام سے فارغ تھے۔ اس انکوائری کمیٹی کے سپرد دو کام تھے۔

(اوّل) یہ رپورٹ کرنا کہ انتخابات میں بنیادی شرط ووٹ کی کیا ہو؟

(دوسرے) پنجاب میں انتخاب کے لیے حلقہ بندی تجویز کرنا۔

پہلا سوال BASIS OF FRANCHISE کیا ہو؟ (ووٹ کی بنیادی شرط کیا ہو۔) نہایت اہم تھا لیکن کسی بھی جماعت یا سیاسی لیڈر نے اس پر ہماری مدد نہ کی۔ ہم نے خود ہی یونیورسل ایڈلٹ فرنچائز UNIVERSAL ADULT FRANCHISE کی سفارش کا خیال کیا کہ ہر بالغ کو غیر مشروط طور پر حق رائے دیا جائے۔ ہماری تحقیقات کے دوران ایک دفعہ مسٹر لیاقت علیخان نے دریافت کیا کہ آپ کا کیا خیال ہے؟ میں نے کہا غالباً بالغ رائے دہندگی کی سفارش کریں گے۔ اگرچہ معاملہ ابھی زیر بحث ہے۔ فرمانے لگے۔ اچھی طرح سوچ لیں کہیں آپ جلدی تو نہیں کر رہے؟ میں نے کہا اگر آج ہم خود بالغوں کو ووٹ کا حق نہیں دیں گے۔ تو کل وہ ہم سے جبراً چھین لیں گے۔ بالآخر ہم نے بالغ حق رائے دہندگی کی سفارش پیش کی جو منظور ہو گئی۔ چنانچہ دستور ساز اسمبلی میں میں

نے اس کا بل پیش کیا جو منظور ہوکر "DELIMITATION OF CONSTITUENCIES"

(ADULT FRANCHISE ACT 1951)" کی صورت میں ہمارے آئین کا حصہ ہے جو ۲۱ اپریل ۱۹۵۱ء کو منظور ہو کر نافذ ہوا ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اسی معیار کو سارے پاکستان کے لیے انتخابات کی بنیاد قرار دیا جائے گا۔ اس کی طرف تو کسی نے توجہ نہ کی۔ البتہ حلقہ بندی کے وقت سب سیاسی لیڈروں کو ہماری کمیٹی میں فوری دلچسپی پیدا ہو گئی۔ کئی طالع آزمایانِ میدانِ سیاست مکھیوں کی طرح ہمارے گرد بھنبھنانے لگے کہ ایسا حلقہ انتخاب تجویز ہو۔ جہاں سے ان کی کامیابی کا امکان زیادہ ہو۔

بات دراصل یہ ہے کہ قوموں کے کردار میں خوشگوار تبدیلی کے لیے وقت لگتا ہے اور پاکستان میں تو یہ تبدیلی کچھ ناگوار صورت ہی اختیار کرتی چلی جارہی ہے۔

ایک دفعہ مسٹر لیاقت علی خاں ہمارے ہاں، ارکوئنز روڈ میں کھانا کھا رہے تھے۔ سر فرانسس موڈی گورنر پنجاب بھی شریک تھے۔ ہم ولایت سے ابھی واپس آئے تھے۔ سر فرانسس نے میری بیوی سے پوچھا۔ فرمایئے۔ بیگم صاحبہ! ہمارا ملک آپ کو پسند آیا۔ انھوں نے کہا بعض باتوں سے اختلاف ہے۔ لیکن آپ کے جذبۂ حبُ الوطنی اور عمومی طور پر نظم و نسق کا خیال بہت پسند آیا۔ دعا ہے کہ پاکستان کی فضا بھی انہی جذبات سے معمور ہو۔ سر فرانسس بولے وقت درکار ہے۔ بیگم صاحبہ! کافی وقت درکار ہے۔ ہمیں ایک ہزار سال لگے اس حالت پر پہنچنے کے لیے۔

واقعہ یہ ہے کہ پاکستان میں ہندوؤں کی جائدادوں کی لوٹ مار۔ مہاجروں اور لوکل مہاجروں کا لالچ اور ان سب کی دیکھا دیکھی انتظامیہ میں ڈھیلا پن اور سیاست میں خود غرضی پیدا ہوئی۔ جس سے پاکستان بننے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا اور حالات جلد ہی اس مقام پر آ گئے کہ "زندہ باد" کے ساتھ "مردہ باد" بھی سننے میں آنا شروع ہو گیا۔

ہائی کورٹ کی ججی کی پیش کش

۲۶ مارچ ۱۹۴۹ء کو مجھے میاں سر عبدالرشید صاحب چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ نے یاد فرمایا اور کہا کہ ہائی کورٹ کی ججی کے لیے آپ کا نام زیرِ غور تھا۔ اب ایک ایڈیشنل جج کی منظوری ہوئی ہے۔ میں نے گورنر سے اور دیگر جج صاحبان سے بات کر لی ہے آپ یہ عہدہ قبول کریں۔ ہم سب بہت خوش ہوں گے۔

میں نے سر عبدالرشید کا مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا لیکن عرض کیا کہ "انگریز کے زمانے میں میں یہ بلند اور قابلِ عزت عہدہ بڑی خوشی سے قبول کرتا لیکن اب کہ ہم آزاد ہو چکے ہیں، کئی مسائل ہمارے سامنے اتنے اہم ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ججی منظور کر کے میں خدمتِ پاکستان کے جذبہ کو محدود کر لوں گا، اس لیے معذرت خواہ ہوں۔"

میاں صاحب نے فرمایا۔ "مجھے اس نکتہ سے آگاہی نہیں تھی لیکن چونکہ آپ زیادہ آزاد فضا میں کام کرنا چاہتے ہیں، ہمیں آپ کے جذبات کا احترام ہے۔"

اگست ۱۹۴۹ء میں مجھے ممدوٹ انکوائری میں گورنمنٹ کی طرف سے سینئر کونسل مقرر کیا گیا۔ میں نے پروگرام بنایا کہ کاغذات ساتھ لے جا کر ستمبر کا مہینہ کوہ مری میں رہ کر مقدمہ کی تیاری کروں۔ غالباً اگست کے وسط میں ایک رات (جبکہ میں سو چکا تھا) کچھ اخباری نامہ نگار میرے ہاں آئے۔ بہ اصرار مجھے جگایا۔ رمضان کا مہینہ تھا مجھے ان کی حرکت پسند نہ آئی۔ باہر آیا۔ ترش روئی سے پوچھا۔ فرمائیے کس طرح تشریف لائے۔ انھوں نے کہا۔ سردار عبدالرب نشتر پنجاب کے گورنر مقرر

ہُوئے ہیں۔ آپ کا رد عمل دریافت کرنے آئے ہیں۔ میں نے ان کو ٹالتے ہُوئے خشک لہجہ میں کہا "میں بہت خوش ہوں" اُنھوں نے کہا کہ بیزار تو ہم نے آپ کو کر دیا ہے۔ نیند بھی آپ کی اُچاٹ ہو گئی ہے۔ اب ہمیں مایوس نہ کریں۔ میں نے کہا اچھا۔ مجھے دو منٹ سوچ لینے دو۔ پھر میں نے جو بیان دیا وہ غالباً اس مضمون کا تھا:

"پنجاب میں قانون ساز اسمبلی معطل ہے۔ گورنری راج ہے۔ پنجاب بے پناہ مسائل سے دوچار ہے۔ سرحدی صوبہ ہونے سے اس کی ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں۔ مہاجرین کے سیلاب کا سارا زور پنجاب پر پڑ رہا ہے۔ ایسی صُورت میں بہتر ہوتا کہ کسی پنجابی کو، جو حالات سے زیادہ تفصیل سے واقف ہو، گورنر مقرر کیا جاتا۔ میری رائے میں سنٹرل گورنمنٹ نے ایک اچھا موقعہ پنجاب کے متعلق ہاتھ سے کھو دیا ہے۔

لیکن چونکہ سردار عبدالرّب نشتر مسلم لیگ کے مخلص اور آزمودہ کار لیڈر ہیں، انھیں پنجاب کے حالات سے بھی گہری دلچسپی ہے، اس لیے میں اپنے پنجابی بھائیوں کو مشورہ دوں گا کہ اپنے مشکل مسائل حل کرنے کے واسطے وہ سردار عبدالرب نشتر صاحب (نئے گورنر) سے پُورا تعاون کریں۔ انھیں ہر قسم کی امداد دیں تاکہ جو مشکل وقت ہم پر آیا ہے، وہ بخوبی ٹل سکے۔"

ایک صحافی بولے۔ "یہاں بھی ہم گئے، پرائیویٹ طور پر سب نے ہی ان خیالات کا اظہار کیا لیکن اخبار میں چھاپنے کی اجازت نہ دی۔ آپ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے خیالات کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں لگائی۔ دوسرے دن اخبارات میں میرا بیان چھپا۔

تیسرے دن مجھے بتایا گیا کہ وزیراعظم صاحب نے آپ کے بیان کو بہت ناپسند کیا ہے۔ مجھے بعض عزیزوں نے کراچی سے ٹیلی فون بھیے کہ آپ نے بڑے غلط موقع پر بیان دیا ہے۔ یہاں یہ افواہ بہت گرم تھی کہ آپ حکومت پاکستان میں وزیر بن رہے ہیں۔ ایک عزیز جو ایک بڑے سرکاری عہدہ دار تھے، نے تو کہا کہ یہ بات یہاں تک آگے بڑھ چکی تھی کہ آپ کے لیے مکان کی بھی

تلاش ہو رہی ہے۔ اب سُنا ہے کہ وزیر اعظم صاحب کبیدہ خاطر ہیں آپ نے یہ بیان دے کر اپنی وزارت کے CHANCES (مواقع) کو خطرہ میں ڈال دیا ہے۔

میں نے ان عزیزوں کو جواب دیا کہ جو کچھ میرے دل میں آیا میں نے نیک نیتی سے اس کا اظہار کر دیا ہے میں نے صوبائی تعصب کو ہوا نہیں دی بلکہ ایک حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ باقی رہی وزارت، تو میں ضمیر فروشی اور مصلحتِ تبدیلیِ خیالات کے ذریعے حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے۔ میں پاکستان کی خدمت ہر حیثیت سے کرتا رہوں گا آپ اللہ پر بھروسا رکھیں اور دعا کریں کہ پاکستان خوشحال اور مضبوط ہو۔

اکثر دوستوں کا خیال تھا کہ خواہ مخواہ آپس میں غلط فہمی نہیں رہنی چاہیے۔ آپ کو وزیر اعظم صاحب سے مل کر اپنی بات کی وضاحت کر دینی چاہیے۔ میں اگست ۱۹۴۹ء کے آخر میں لاہور میں ملا۔ انھوں نے میرے بیان پر اظہارِ ناخوشی کیا کہ اس سے صوبائی تعصب کی بُو آتی ہے۔ آپ کی نیت خواہ کچھ ہو، لوگوں کے دلوں میں غلط تاثر پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ میں نے کہا۔ میں اور صوبائی تعصب کو بھڑکاؤں؟ حاشا وکلّا! نہ یہ میری غرض تھی نہ کبھی ہوگی۔ میں نے تو پنجاب کی مشکلات کے مدِ نظر زیادہ واقف آدمی کی تجویز پیش کی تھی۔ پھر میرے بیان کا آخری حصہ تو پڑھیں اس میں نئے گورنر سے پورے تعاون کی پُرزور اپیل کی گئی ہے۔ ہو سکتا ہے میرا اندازِ بیان آپ سے مختلف ہوا ہو لیکن میری نیت پر شبہ نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے فرمایا: آئندہ ذرا احتیاط سے کام لیا کریں۔ بات ختم ہوئی۔

تقرر بطورِ وزیرِ صنعت
(قیام کراچی)

ممدوٹ کیس کی تیاری کے لیے ایک ماہ کے قیام کے لیے کوہ مری پہنچا ہی تھا کہ لاہور بُلا یا گیا۔ گورنر صاحب (سردار عبدالرب نشتر مرحوم) کا پیغام تھا ضروری لاہور پہنچو۔ میں نے بہت ٹال مٹول کی۔ اُدھر سے جواب ملا۔ معاملہ نہایت اہم ہے۔ آپ کا لاہور واپس آنا اور فوراً واپس آنا ضروری ہے۔ خیر طوعاً کرہاً دوسرے دن لاہور روانہ ہوا۔ نشتر صاحب مرحوم سے ملا۔ ہنس کر بولے جس وقت آپ کوہ مری جانے کا ذکر کر رہے تھے میں کہنے ہی والا تھا 'نہ جائیے'، کیونکہ آپ کی ملاقات کے بعد وزیرِ اعظم صاحب نے رات کھانے پر مجھ سے کہہ دیا تھا کہ میں نے چودھری نذیر احمد خاں کو وزارت میں لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

سردار صاحب نے فرمایا۔ لیکن بات ابھی سرکاری طور پر طے نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے میں نے آپ کو کوئی اشارہ نہ دیا۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۹ء کو میں نے کراچی پہنچ کر اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ مجھے وزارتِ صنعت کا قلمدان سُپرد کیا گیا۔

میں نے نواب زادہ صاحب سے کہا۔ یہ وہ محکمہ ہے جس کے متعلق مجھے براہِ راست کچھ تجربہ نہیں۔ فرمانے لگے۔ عام تجربہ، معاملہ فہمی، فراست اور وسیع النظری کی ضرورت ہے۔ آپ جیسا نیا آدمی (بغیر کسی سابقہ تعصبات یا رُجحانات کے) ملک کی تمام صنعتی ترقی اور خوش حالی کے لیے زیادہ بہتر سوچ سکتا ہے، بہ نسبت اس شخص کے جس کی رائے پر پہلے ہی سے خارجی اثرات کی وجہ سے

دباؤ پڑ چکا ہو۔

پھر سُنانے لگے کہ ایک مشہور برطانوی سیاست دان (مجھے اب اس کا نام بھول گیا ہے) کو نوآبادیات کا سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر) مقرر کیا گیا تو وہ پہلے دن دفتر میں جاکر کہنے لگے۔ نقشہ لاؤ۔ میں دیکھوں تو سہی یہ ہماری نوآبادیات ہیں کہاں! بعد میں وہ بہت کامیاب وزیر ثابت ہوئے۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۷ء سے ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۱ء تک جو جو کچھ میں نے بطور وزیر صنعت کیا اس کا مختصر ذکر ضروری سمجھتا ہوں اس سے شاید آپ کو مسٹر لیاقت علی خاں کے نقطۂ نگاہ کی صحت یا عدمِ صحت کے متعلق رائے قائم کرنے کا موقعہ بھی مل سکے۔

۱۔ سب سے اوّل PATRONIZE PAKISTANI PRODUCTS پاکستانی مصنوعات کی سرپرستی کا SLOGAN (پیغام) قوم کو دیا کہ ان کے دل سے غیر ملکی مصنوعات کی چاہت کم ہو۔ ملکی مال کی طرف رغبت زیادہ ہو۔ اس کے استعمال سے عزتِ نفس کا جذبہ بلند ہو۔ ملکی مصنوعات میں ترقی ہو کر ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہو بے روزگاری کم ہو۔ درآمد کم ہو، برآمد بڑھے۔ پیداوار اور بڑھے، حُبّ الوطنی کا مظاہرہ ہو۔ اقوامِ عالم میں ہماری عزت ہو۔ جو زرِمبادلہ اشیائے صرف پر خرچ آتا ہے وہ زیادہ مُفید کاموں کے لیے وقف ہو۔ ہمارے ملکی مال کی زیادہ کھپت اپنے ہی ملک میں ہو اور عوام کو نسبتاً کم قیمت پر اشیائے زندگی آسانی سے دستیاب ہو سکیں۔ میری یہ بھی رائے تھی کہ اگر ہم کوشش کریں تو پاکستانی مال بھی اپنی قدر و قیمت پیدا کرلے گا۔

حضرت اکبرؒ کا وہ شعر تو غالباً آپ نے سُنا ہوگا:

بخدا ہند کے پُرزے بھی غضب ڈھلتے ہیں
یہ غلط ہے کہ ولایت ہی کا مال اچھا ہے

ہند کے پُرزوں کی بجائے پاکستانی مصنوعات کا تصوّر کرلیجیے۔ بہرحال میری رائے تھی کہ

ہماری مصنوعات کی ترقی و بہتری میں THREE P'S یا P.P.P. کا بڑا حصّہ ہوسکتا ہے۔ اخبارات، ریڈیو اور فلم کے ذریعہ اس پیغام کو بہت فروغ دیا گیا۔ میں نے خود بھی سر سے پاؤں تک پاکستانی لباس پہنا۔ گھر میں اکثر اشیا پاکستانی تھیں۔ غرضکہ اپنی مثال بھی قوم کے سامنے پیش کی اور ویسے بھی وعظ و نصیحت سے شروع شروع میں پاکستان کو اس پیغام سے بہت فائدہ پہنچا۔ میں جگہ جگہ گیا۔ پاکستان (جس میں مشرقی پاکستان بھی شامل تھا) کے کونہ کونہ میں گیا۔ ہر قسم کی مصنوعات کو بچشم خود دیکھا۔ کاریگروں کے مسائل اور مشکلات کا موقعہ پر جائزہ لیا اور "کھلی کچہری" تو نہ لگی مگر موقع پر احکام جاری کرنے کی رسم کی ابتدا کی۔

۲:۔ PATRONIZE PAKISTANI PRODUCTS کے ساتھ SMALL SCALE INDUSTRIES گھریلو یا چھوٹی مصنوعات کا فروغ ایک لازم بات تھی۔ چنانچہ پہلی بار سنٹرل گورنمنٹ میں (تقریباً تقریباً لڑ جھگڑ کر) اس وقت گیارہ لاکھ روپے کی رقم مخصوص کرائی جس سے مختلف مقامات میں گھریلو مصنوعات کے SALES AND DISPLAY CENTRES (گھریلو صنعتوں کی نمائش گاہیں اور فروخت گاہیں) قائم کرائیں اور مشہور بیرونی ہوائی اڈوں پر پاکستان کی مصنوعات کی نمائش کا اہتمام کیا۔ مثلاً: نیویارک، لندن، پیرس وغیرہ میں۔ یاد رہے کہ اس وقت تک پاکستان کا نام بھی اکثر بیرونی ممالک نہیں جانتے تھے اور جیسا کہ میں پیچھے عرض کر چکا ہوں جاننے والے بھی PALESTINIAN خیال کرتے تھے۔ یہ بھی ملحوظ نظر رہے کہ چھوٹی صنعتوں کا براہ راست صوبائی حکومت سے تعلق تھا لیکن اس وقت ہمیں ایک ہی دُھن تھی کہ پاکستان جلد سے جلد مضبوط اور خوش حال ہو۔ دفتری بندشوں کی بنا پر لکیر کے فقیر ہونا ضروری نہیں۔

چونکہ سرمایہ کاری کی طرف اور صنعت کاری کی طرف لوگوں کا رُجحان کم تھا (تجربہ بھی پُرانا نہ تھا صرف تجارت کی طرف رغبت تھی) ادھر کپڑے کی ملک میں سخت قلت تھی (تقسیم ملک کے وقت صرف دو کپڑے کے کارخانے پاکستان کے حصّے میں آئے تھے دونوں ہندوستانی سرمایہ سے لگے

تھے اور ان کے ہیڈ آفس بھارت میں تھے۔ اوکاڑہ ستلج کاٹن ملز، مسٹر برلا کا اور لائل پور کاٹن ملز، سُر سری رام کا) کھڈیاں البتہ جگہ جگہ لگنا شروع ہو گئی تھیں یا رُوئی بیلنے کے کچھ کارخانے مسلمانوں کے پاس تھے۔ یعنی جننگ فیکٹریاں (GINNING FACTORIES) میں اور چودھری محمد علی صاحب نے جو اس وقت حکومت پاکستان کے سیکرٹری جنرل تھے حکومت سے صلاح مشورہ کر کے سنٹرل گورنمنٹ کے سرمایہ سے سات کروڑ رُوپے کے خرچ سے سات کارخانے کپڑا اور سُوت بُننے کے جاپان اور برطانیہ سے خرید کیے اور سب صوبوں میں تقسیم کرنے کو کہا۔ خیال یہ تھا کہ سنٹرل گورنمنٹ کارخانے لگائے گی اور چالو کر کے پرائیویٹ کارخانہ داروں کو اچھے داموں بیچ دے گی گویا کہ ملی جُلی معیشت کی ابتدا رکھی گئی جس میں کچھ حصّہ حکومت کا ہو اور کچھ نجی سرمایہ کار کا۔

جہلم کا فوجی ٹیکسٹائل ملز اور بورے والا کے ٹیکسٹائل ملز ان، کارخانوں میں ہیں جو ہم نے منگوائے تھے۔ اس طرح ملک میں کپڑے کی پیداوار میں اضافہ ہو گیا اور ماشاءاللہ یہاں تک اضافہ ہُوا کہ مجھے کراچی میں مزید ٹیکسٹائل ملز لگانے پر سخت پابندی لگانی پڑی (اس کا کچھ ذکر آگے آئے گا)

۳۔ ملک میں ملی جُلی معیشت کو فروغ دینے کے واسطے میں نے اور مسٹر غلام محمد صاحب وزیرِ مال نے P.I.D.C.

PAKISTAN INDUSTRIAL DEVELOPMENT CORPORATION

کی تجویز سوچی۔ ہم دونوں نے مجوزہ بل تیار کیا جو میں نے اسمبلی میں پیش کیا اور وہاں سے آسانی سے پاس ہُوا۔

P.I.D.C. بعد میں دو علیٰحدہ حصّوں میں بٹ گئی۔ لیکن دونوں نے ملک میں صنعت کو فروغ دینے میں اور ملی جُلی معیشت کے خیال کو عملاً مقبول بنانے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ہر پڑھے لکھے کو معلوم ہے (یا معلوم ہونا چاہیے)

پروگرام یہ تھا کہ پہلے گورنمنٹ صنعتی ادارے قائم کرے اور پھر چالو ہونے پر وہ پرائیویٹ سیکٹر

کی تحویل میں دے دے (یعنی نجی سرمایہ کاروں کو یا صنعت کاروں کو دے دے) یاد رہے کہ اُس وقت صنعتوں کے فروغ کے واسطے روپیہ ملنا دُشوار تھا جسے انگریزی میں کہتے ہیں PRIVATE CAPITAL WAS SHY نجی سرمایہ آسانی سے مہیا نہیں ہو رہا تھا۔ P.I.D.C. کے قیام کا خیال بڑا ائیڈیٹھا۔

آج P.I.D.C. کی کارگزاری مُنہ بولتی تصویر ہے۔ اس ایک ادارہ کے قیام سے اور کارگزاری سے (آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں) کہ بانیانِ پاکستان یا اوّل معمارانِ پاکستان نے اپنا فرضِ منصبی نہایت دیانت داری سے (حالات کے تقاضے کے مطابق) انجام دیا۔ ملکی ترقی میں کسی قسم کی غفلت نہیں برتی گئی۔

یہ درست ہے کہ اس عمل میں اصلاح کی بڑی گنجائش تھی۔ وہ کہاں نہیں ہوتی ؟ کیا اب نہیں ہے ؟ کیا اب باوجود "سب اچھا" کی پکار کے واقعی سب کچھ اچھا ہے ؟

۴:۔ P.I.D.C. کے قیام کے ساتھ ہی مجھے ۱۹۵۱ء میں آسٹریلیا کے دورے کے بعد اور وہاں کے صنعتی ڈھانچے کے مطالعہ کے بعد خیال آیا کہ یہاں C.S.I.R

COUNCIL OF SCIENTIFIC AND INDUSTRIES RESEARCH

قائم کی جائے تاکہ موجودہ تکنیک کے مطابق ہماری سائنسی ترقی میں بھی مدد مل سکے کیونکہ ریسرچ (تحقیقات) کے بغیر مصنوعات کی QUALITY (معیار) میں اضافہ نہیں ہو سکتا۔ آپ کے بڑے شہروں میں C.S.I.R. کی مشینی (صنعتی تحقیقاتی رسدگاہیں INDUSTRIAL RESEARCH LABORATORIES) کام کر رہی ہیں وہ اسی ناچیز کے پیش کردہ C.S.I.R. ہی کی منظوری کا نتیجہ ہیں جن کی وجہ سے آپ کی مصنوعات کو عالمی اعلیٰ سطح پر لانے میں بڑی مدد مل رہی ہے۔

۵:۔ میرے چارج لیتے ہی مجھ پر زور ڈالا گیا کہ ہمارے زمینی تیل کی تلاش کے لیے سابقہ انگریزی کمپنی کو اجازت دی جائے میں عموماً (بالخصوص) تیل کی تلاش کے معاملہ میں ایک ہی

غیر ملک پر انحصار نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ ایران میں ڈاکٹر مصدق صاحب کا قصہ ابھی تازہ تھا اور میں چوکنا ہو چکا تھا۔ اس لیے باوجود اس کے کہ مجھ پر کئی دباؤ ڈالے گئے (جن میں ہمارے گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین مرحوم اور برٹش ہائی کمشنر شامل تھے) کہ جلدی تیل کی تلاش کا لائسنس پرانی انگریز کمپنی کو دیا جائے' میں نے کئی مہینے اس معاملہ کو طے کرنے میں صرف کر دیے اور انگریز کے علاوہ امریکی۔ اور ڈچ DUTCH کمپنیوں سے خط و کتابت شروع کی۔ آخر میں صرف سوئی کا ۱۴۸ مربع میل رقبہ پرانی کمپنی کو دیا۔ مری بگٹی کا ۴۸۰۰ مربع میل علاقہ دینے سے صاف انکار کر دیا اور وہ دوسری کمپنیوں کو دینے کی کوشش شروع کر دی۔

جو کچھ میں نے اس وقت دیکھا اور جو حالات بعد میں ظاہر ہوئے' ان کی بنا پر میرا یقین تھا (اور اب بھی ہے) کہ پاکستان میں خدا کے فضل سے کافی تیل ہے۔ صرف حب الوطنی اور جانفشانی سے اس کو تلاش اور حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ہمارے نوجوان جو تیل کی صنعت میں مشغول ہیں' جلدی تیل کی تلاش میں لگ جائیں گے۔ اللہ تعالےٰ ان کی کوششوں کو کامیاب کرے گا۔ بلوچستان اور پوٹھوہار کے علاقہ میں تیل کی تلاش مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ سمندر کے ساحل کے ساتھ ساتھ بھی تیل ملنے کے امکانات موجود ہیں۔

۶:۔ مجھے گاسکر سے حاصل کیے ہوئے سبق کے علاوہ اپنے مشاہدہ کی بنا پر پختہ یقین تھا کہ ملک کے ہر حصے کو یکساں ترقی کے مواقع فراہم کیے جانے چاہئیں اور خصوصاً ان علاقوں میں (جن کو انگریز نے اپنی اغراض کے لیے پسماندہ رکھا ہوا تھا تاکہ ان کی فوج میں وہ لوگ بھرتی ہو کر چند روپوں کی خاطر اپنا خون بہائیں) چھوٹی بڑی صنعتیں قائم کی جائیں تاکہ وہ لوگ بھی خوش حال ہو سکیں۔ چنانچہ کپڑے کے ۱۲ کارخانوں کو جن میں تین لاکھ تکلے لگنے تھے' میں نے کراچی میں قائم ہونے کی اجازت نہ دی (ایک دفعہ میرے ایک ہم عصر وزیر صاحب ایک صاحب کی سفارش لے کر آئے کہ کراچی میں کپڑے کا کارخانہ لگائیں گے مگر میں نے معذوری ظاہر کی اور اجازت نہ دی) برعکس اس کے فوجی ٹیکسٹائل ملز جہلم۔ کوہ نور ملز۔ راولپنڈی میں۔ اسی

طرح حیدرآباد، سکھر وغیرہ ملک کے دوسرے حصوں میں صنعتی ترقی کو فروغ دے کر توازن قائم کرنے کی کوشش کی' داؤد خیل میں ولایتی کھاد کا کارخانہ قائم کروایا۔

۷:۔ ملک کے بڑے بڑے کارخانوں کا خود موقعہ پر جا کر جائزہ لیا اور ان کے کام کی رفتار تیز کی۔ وارسک کو (جو اس وقت) بلا معقول وجوہات صوبائی حکومت کے زیر اہتمام تھا مرکزی حکومت کے زیر اہتمام کیا۔ مشرقی پاکستان کرنا فلی (بجلی کے کارخانہ کا مرکز) اور چندر اگونہ جہاں کاغذ کا کارخانہ لگا کا خود جائزہ لیا اور اس طرح سے ہر ممکن کوشش کی کہ ملک کا کوئی حصہ زیادہ ترقی یافتہ اور کوئی بالکل پس ماندہ نہ ہو جائے بلکہ متوازن ترقی ہو تاکہ دولت کی تقسیم مساویانہ اصول پر ہو سکے۔

۸:۔ ملک کے کونہ کونہ میں خود گیا۔ مشرقی پاکستان کی آخری سرحد ہرمنی پور کی پہاڑیوں میں گیا۔ وہاں پہاڑی عورتیں بڑا خوب صورت رنگین کپڑا بُنتی تھیں۔ ان کو رنگوں کی ضرورت تھی موقعہ پر ہی رنگ مہیا کرنے کا حکم دیا۔ اُدھر گیا اور بلوچستان میں ہرنائی کے مقام پر گیا۔ ہرنائی کے اُونی کارخانے کا افتتاح کیا۔ قصہ مختصر جو کچھ پاکستان میں تھوڑا بہت بنتا تھا اُسے قوم کی امانت سمجھا اور پھر ہر کاریگر اور مزدور کی اس طرح سرپرستی کی کہ گویا میرا ذاتی کاروبار ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ایک آئیل کمپنی کا کام دیکھنے (مورگا MORGA) راولپنڈی گیا۔ بیادہ تر انگریز (مینیجر وغیرہ) ساتھ تھے۔ ایک طرف چند مزدور ایک جنگلہ کے اندر کام کر رہے تھے۔ میں راستہ چھوڑ کر ان کی طرف گیا۔ انھیں السلام علیکم کہا اور ان سے مصافحہ کے لیے جنگلہ کے اندر ہاتھ بڑھایا۔ ان کے ہاتھ تیل سے چکنے ہُوئے ہوئے تھے' وہ ہچکچائے۔ میں نے کہا جو ہاتھ پاکستان کے واسطے کام کر رہے ہیں وہ چُومنے کے قابل ہیں۔ نیک بختو! میرے ساتھ ہاتھ ملاؤ' انھوں نے بڑے تپاک سے ہاتھ ملائے۔

جس صنعتی ادارہ میں میں جاتا تھا پہلے ان کے مزدوروں کے رہنے کے WELFARE COLONY انتظام کو دیکھتا تھا۔ ان کی FARE PRICE SHOP

ہسپتال، سکول، کھیلنے کے گراؤنڈ وغیرہ دیکھتا۔ جب یہ سب دیکھ لیتا تو پھر فیکٹری میں جاتا۔

پاکستان کے ابتدائی ایام میں ہماری کوشش یہ تھی کہ سرمایہ اور محنت کے باہمی تعلقات خوشگوار رہیں، متوازن ہوں اور ایک دوسرے کے ممد و معاون ہوں۔

اس وقت صورت یہ تھی کہ سرمایہ دار سب بھارت چلے گئے تھے۔ صنعت کاری کا تجربہ رکھنے والے سب پاکستان کو (بزعمِ خود) کھوکھلا کر کے ہندوستان جا پہنچے تھے۔ یہاں نہ پیسہ تھا، نہ تجربہ اور نہ مواقع۔ مزدور تو موجود تھا لیکن سرمایہ کار اور سرمایہ کی کمی تھی۔

ایسی حالت میں مناسب یہی معلوم ہوتا تھا کہ سرمایہ دار کا حوصلہ بڑھایا جائے۔ اس کو ملکی پیداوار بڑھانے کے لیے ترغیب دینے کے زیادہ مواقع فراہم کیے جائیں تاکہ ملک میں اقتصادی استحکام جلد از جلد پیدا ہو سکے۔ یاد رہے کہ یہ وہ وقت تھا جب ہمارے پاس پیسہ نہ تھا، دفتروں کی عمارات نہ تھیں۔ شیڈوں میں کام ہوتا تھا، وہ بھی بغیر میز کرسی کے (اور بعض دفعہ تو قلم دوات بھی کئی دفتری مل کر استعمال کرتے تھے) کپڑا ملک میں پیدا نہ ہونے کے برابر، اور باقی درمیانہ سطح کی صنعتیں تو قطعاً مفقود تھیں۔ اس واسطے مصلحت کا تقاضا تھا کہ سرمایہ دار کو سہولتیں مہیا کی جائیں۔ تاکہ جلد از جلد ضروریاتِ زندگی ملک میں دستیاب ہونی شروع ہو جائیں۔

سرمایہ دار کو جائز سہولتیں یقیناً دی گئیں مگر اسے سر نہیں چڑھایا گیا۔ اسے حکومت کی جانب سے ناجائز منافع کمانے کا کم از کم موقع دیا گیا لیکن اتنے وسیع پیمانے پر صنعت کاری کا کام ابتدائی سطح سے شروع ہونے کی صورت میں یہ بات بھی ماننا پڑتی ہے کہ بعض لوگوں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور بعض نے تو کئی صنعتوں کو اپنی تحویل میں لے کر اجارہ داری شروع کر دی (اگرچہ میرے زمانۂ وزارت میں ابھی اس کا موقعہ ہی نہ آیا تھا)۔

بہرحال جہاں میں نے صنعت کار کی جائز حوصلہ افزائی کی، وہیں محنت کش کے مفاد کا پورا پورا خیال کیا۔

مجھے یقین ہے کہ اگر یہ مناسب اور متوازن پالیسی بعد میں بھی جاری رہتی تو سرمایہ اور محنت کش

کی وہ آویزش پیدا نہ ہوتی جس سے آج ملک دوچار ہے۔ میں نے متعدد جلسوں میں مزدور اور محنت کشوں کے جائز حقوق کے تحفظ پر زور دیا۔ اس ضمن میں میں نے INDUSTRIES FEDERAL CONTROL ACT خود وضع کر کے اسمبلی سے پاس کرایا تاکہ وفاقی حکومت کے پاس قانونی اختیار ہو' وہ ملک میں صنعتی ترقی کی منصفانہ' متوازن اور جائز پالیسی پر چلا سکے یہ پہلا قانون تھا جو میں نے اسمبلی سے ملکی معیشت کو مستحکم اور ہموار بنانے کے لیے خود ہی وضع کر کے پاس کرایا۔

میں شروع سے غیر ملکی امداد (FOREIGN AID) کا قائل نہ تھا۔ اس وقت کی وزارت میں بعض صاحبان ایسے تھے جو پاکستان کی ترقی غیر ملکی امداد سے متعلق رکھنا چاہتے تھے لیکن میں بہ صد ادب اس روش کے خلاف تھا۔ میں حکیم الامت کے اس قول کی عملی تفسیر پاکستان میں پیش کرنا چاہتا تھا۔ ؎

آنچہ از خاکِ تو است اے مردِ حُر آں فروش و آں بنوش و آں بخور

آں نکو بیناں کہ خود را دیدہ اند خود گلیم خویش را بافیدہ اند

باقی وزارتوں پر تو میرا زور نہ چلتا تھا لیکن وزارتِ صنعت جو میرے متعلق تھی اس میں میں نے غیر ملکی سرمایہ کا عنصر کم سے کم رکھنے کی کوشش کی اور اس میں بفضل خدا ایک حد تک کامیاب ہوا۔ اس ضمن میں غیر ملکی ماہرین کا شمار آتا ہے۔ میں نے عملی زندگی میں یہ سبق سیکھا تھا کہ اول تو ماہرین اس کام کے ماہر نہیں ہوتے جو ہم نے اپنے مخصوص حالات میں ان سے لینا ہے دوسرے زیادہ تر بھاڑے کے ٹٹو ہوتے ہیں اور ان میں اپنے ملک کے مفادات کا زیادہ احساس رہتا ہے بہ نسبت پاکستان کی حقیقی خدمت کرنے کے خیال کا۔

اللہ کا شکر ہے کہ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اپنے دورانِ وزارت ایک غیر ملکی ماہر کو بھی وزارتِ صنعت میں جگہ نہ دی اس کے ساتھ ہی میری یہ کوشش تھی کہ ہم اپنے نوجوانوں

کو مختلف تعمیری صلاحیتوں میں تربیت دیں تاکہ غیر ملکی امداد کے چکر سے بھی نجات مل جائے اور ملک ترقی کی شاہراہ پر بھی چلتا رہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے خود (اپنے ہاتھ سے) ایک نقشہ تیار کیا تھا جس کے مطابق ان غیر ملکی صنعتی فرموں کے لیے (جو پہلے سے موجود تھیں) یہ لازم قرار دیا گیا تھا کہ وہ چھ ماہ بعد براہِ راست وزیرِ صنعت کو اطلاع دیں کہ اس نقشہ کے مطابق کتنے پاکستانیوں کو انھوں نے اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجا ہے۔ اُونچی اسامیوں میں پاکستانیوں کی کیا شرح ہے۔ ٹریننگ کا آئندہ پروگرام کیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستانی نوجوانوں کو جلد از جلد ملک کی تعمیری اور بڑے پیمانے کی خدمت کا موقعہ مل سکے۔

میرا معمول روزانہ ۱۴ گھنٹے کے قریب کام کرنے کا تھا۔ سارے گھر کا عملہ اور میرا سرکاری عملہ مجھ سے سخت بیزار تھے کہ یہ بھی کوئی طریقہ ہے کہ "نہ آپ آرام کرو اور کسی کو آرام کرنے دو" اور اس پر طرّہ یہ کہ نجی ملازمین تو بہت ہی بدمزہ ہو رہے تھے۔ "بازار سے کوئی چیز اُدھار لی تو باز پُرس ہوگی کوئی تحفہ گھر میں آیا اور لیا گیا تو نوکری سے جواب وغیرہ"۔ یہ لوگ مدت سے میرے ساتھ تھے۔ منٹگمری میں آزادی کی زندگی بسر کرتے تھے۔ یہاں پابندیاں اور کڑی پابندیاں۔ ان میں ایک صاحب (ذرا خشک مزاج) اور اب بھی ماشاءاللہ صحیح سلامت میرے پاس ہیں۔ وہ برملا دُعا کرتے تھے کہ یہ وزارت ٹوٹے اور ہم واپس منٹگمری جائیں۔

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا، اپنی خوشی سے جانا

یہ تو تھا مختصر سا تذکرہ فرضِ منصبی کی ادائیگی کا۔ ایک سبق جو میں نے سکاٹ لینڈ یارڈ کے ایک آفیسر سے ۱۹۴۶ء میں لندن میں سیکھا تھا، اس پر پوری طرح عمل کیا "اپنی ذمہ داری آپ نبھاؤ"۔ پاکستان میں اس اصول پر کم ہی عمل ہوتا ہے۔ لیکن میں نے خدا کے فضل سے جو کام کیا، اس کی ذمہ داری پوری طرح اپنے اُوپر لی۔ کوئی میرے فیصلے سے خوش ہو یا نہ، اس سے غرض نہ تھی۔ اور نہ

ہی بقول شخصے "دوسرے کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی"۔

بعد میں مجھے پتہ چلا کہ میرا طرزِ عمل پاکستانی روایات کے مطابق نہ تھا' اس واسطے خفیہ طور پر میری مخالفت شروع ہو گئی۔

خدا گواہ ہے کہ مجھے اپنے کیے پر ذرا بھی افسوس نہیں ہے بلکہ میری اب بھی یہی دُعا ہے کہ اپنے کام کی ذمہ داری آپ لی جائے' دوسروں کا سہارا نہ لیا جائے۔ یہی روش تھی جس سے مہینوں میں نپٹنے والے کام میں ہفتوں میں نپٹا لیتا تھا اور ہفتوں والے دنوں میں۔ خود فیصلہ کرتا تھا اور پُوری طرح اس فیصلے کی ذمہ داری قبول کرتا تھا۔ جو معاملات سامنے آتے تھے انھیں ٹالتا نہ تھا' جلد سے جلد کم وقت میں اعلیٰ سطح پر خود فیصلہ کرتا تھا۔ یہ جملہ معترضہ نہیں ارادۃً میں نے لکھا ہے تاکہ پاکستان کی سرکاری مشینری میں اصلاحِ احوال ہو سکے۔

ایک دفعہ مسٹر محمد علی بوگرہ (جو اُس وقت کینیڈا میں پاکستان کے ہائی کمشنر تھے) کراچی میں خاص طور پر مجھے ملنے آئے' اور بتایا کہ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہُوں کہ وہ کون صاحب وزیر ہیں جو میرے خطوط کا فوری جواب اپنے دستخطوں سے دیتے ہیں' ورنہ باقی وزارتوں سے تو لمبی خط و کتابت کے بعد کسی ڈپٹی سیکرٹری کا جواب بھی شاذ و نادر ہی موصول ہوتا ہے۔

سرکاری کام کے علاوہ کراچی کے سوا دو سال کے قیام میں وہاں کی ادبی' ثقافتی اور سماجی زندگی میں بھرپُور حصہ لیا۔

میں سمجھتا ہوں کہ جس کام کے کرنے کی مجھے سب سے زیادہ خوشی ہُوئی اور جسے میں ابھی سعادت کا باعث سمجھتا ہوں وہ بزمِ اکبر الٰہ آبادی کی تشکیل تھی۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ شروع سے مجھے اقبال کے پیرومُرشد "اکبرؒ" سے بے حد عقیدت تھی۔ ان کے کلام' ان کے پیغام' ان کی دینداری اور ان کے خلوص کا میرے دل پر خاص اثر ہُوا۔ عمر بھر میں نے کوشش کی کہ اکبرؒ کی تعلیمات کی پیروی کروں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ کم از کم ایک معاملہ میں (یعنی مغربیت سے تنفر میں) میں اکبرؒ کا سچا مُرید ہونے کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اس

طرزِ تخیل کو حکیم الامّت کی رُوح پرور تعلیم نے اور بھی جلا دی اور یہ ان دونوں بزرگوں کی طفیل تھا (اور کچھ ذاتی مشاہدے کی بدولت) کہ میں نے اپنی وزارت کے زمانے میں فرنگیوں کے متعلق وہ روش سختی سے اختیار کی جس کا میں اشارہ اُوپر کر چکا ہوں۔

افسوس ہے کہ پاکستان نے اکبرؒ کے صحیح مقام کو ابھی تک نہیں پہچانا۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ اکبرؒ ان چند برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جن کو رحمتِ الٰہی نے مسلمانانِ ہندوستان کی نجات کے واسطے ایسے وقت بھیجا تھا جب ان کی تقدیر پلٹا کھا رہی تھی۔ انگریز کی حکومت کے ناسُور کو جس انوکھی طرز میں اکبرؒ نے بیان کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ مغربیت، تعلّی، خوشہ چینی کے برخلاف جیسے دلپذیر طریقے سے انھوں نے تعلیم دی اور کوئی نہ دے سکا۔ مشرق کی حقیقی غایت کو پہلے اکبرؒ اور پھر اقبالؔ نے جس طرح دلوں پر نقش کرنے کی کوشش کی وہ اور کسی کو شاید ہی نصیب ہوئی ہو۔ یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے پاکستان بننے کے لیے سنگلاخ زمین کو تیار کیا اور ہمارے ذہنوں کی تعمیر کر کے ہمارے دلوں کو تسخیر کیا تاکہ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کا خواب پورا ہو سکے۔

یہ بات بھی یاد رہے کہ مشرقی اقدار کی بنیاد مذہب پر قائم ہے اور ہمارا مذہب اسلام ماشاء اللہ سب مذاہب سے اچھا، مکمل، قابلِ عمل اور فطری ہے۔ اکبرؔ اور اقبالؔ کا کلام درحقیقت صحیح اسلام کی تعلیم کا درس دیتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے پڑھنے والے اللہ کی طرف رجوع کرنے پر زیادہ مائل ہوتے ہیں۔

اکبرؔ نے خودداری کا سبق دیا تو اقبالؔ نے خودی کا درس دیا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو انہی دونوں کی برکت سے قومیں عروج پاتی ہیں (اسی روش پر چل کر ہم بھی ایک بار کامیابی سے ہمکنار ہوئے تھے)

اکبرؒ کی یاد اور اس کے رُوح پرور پیغام کو تازہ کرنے کے لیے (بزمِ اکبر الٰہ آبادی) کی طرح ڈالی گئی۔ حُسنِ اتفاق سے اس وقت اکبرؒ کے خاندان کے قریباً سبھی لوگ کراچی میں پناہ گزیں ہوئے۔ مجھ سے جو خدمت ان کی بھلائی کے لیے ممکن ہو سکتی تھی وہ میں نے اپنے لیے سعادت

بھی۔ مشتاق احمد صاحب (جو اکبرؔ کے اکلوتے فرزند عشرت حسین صاحب مرحوم کے داماد ہیں)، اُن دنوں غالباً فنانس منسٹری میں تھے (بعد میں وہ پاکستان کے آڈیٹر جنرل مقرر ہو گئے۔ اب ایک دلچسپ کتاب "ہنگاموں میں زندگی" انھوں نے حال ہی میں شائع کی ہے) ان کو بزم اکبرؔ کا سیکرٹری مقرر کیا گیا۔ میں صدر منتخب ہوا اور گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین مرحوم بزم کے مُربّی مقرر ہوئے۔ بزم کی خوش قسمتی سے ملا واحدی صاحب دہلوی نے بزم کی کتابوں کی اشاعت کا ذمہ سنبھالا، اور ان کی تن دہی سے "کلیاتِ اکبرؔ" جو قریباً قریباً نایاب ہو چلی تھی، اس کو پھر بڑے اہتمام سے چھاپا گیا۔ کچھ ایڈیشن اس کے بہت دیدہ زیب اور بڑھیا تھے، لیکن عام ایڈیشن بھی بہت معقول تھے۔ بعض لوگوں کی رائے میں بزم کا یہ کام ایسا تھا کہ اس کی وجہ سے یہ ملک و قوم کی ایک لازوال خدمت انجام دے سکی۔ جن لوگوں کو اکبرؔ کے کلام کے مقام سے ذرا بھی آشنائی ہے، وہ تسلیم کریں گے کہ اس کو جمع کر کے پھر سے صحت اور خوشنمائی سے شائع کرنا واقعی ایک کارنامہ تھا۔

لیکن بزم کا کام "کلیات" کی اشاعت کے ساتھ ختم نہیں ہوا بلکہ چند اور مفید اور دلپذیر کتابیں بھی اکبرؔ کے متعلق بزم نے چھپوائیں مثلاً رباعیاتِ اکبرؔ، اکبرؔ اس دور میں، اکبرؔ دوسروں کی نظر میں، ان میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بزم کے کام میں خواجہ حسن نظامی صاحب (مرحوم) کو بھی شامل کر لیا گیا۔ وہ ایک بار کراچی تشریف لائے اور چونکہ اکبرؔ سے قریب ترین تعلق رکھنے والے اور ہندوستان کے مشہور ادیب اور مصنّف تھے، میری ذاتی درخواست پر انھوں نے بزم کی راہ نمائی کی۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی سے بھی خط و کتابت کے ذریعے مفید معلومات اور مشورے حاصل کیے۔ غرضکہ میری دیرینہ آرزو پوری ہوئی کہ میں اکبرؔ جیسے عالی مقام بزرگ کو خراجِ عقیدت پیش کر سکوں۔ بزمِ اکبرؔ کے کام کو میں یقیناً اپنی زندگی کے بڑے اور مفید کاموں میں شمار کرتا ہوں۔

یہ بزم اب بھی موجود ہے لیکن محض کاغذ پر۔ میں اب بھی اس کا صدر ہوں۔ مشتاق احمد صاحب اب بھی اس کے سیکرٹری ہیں لیکن زمانہ میں بدذوقی اور بے راہ روی نے وہ اُدھم مچایا ہے کہ کوئی اب کسی اچھی بات کو (خواہ نئی ہو خواہ پرانی) سُننے کو آمادہ نہیں ہے۔

ہماری نئی پود کو تو حالیؒ، شبلیؒ، حسرتؒ اور اکبرؒ کے نام سے بھی کم آگاہی ہے۔ اقبالؒ کا نام انھوں نے ضرور سُنا ہے لیکن ان کے متعلق بھی ان کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ در حقیقت بڑے سوشلسٹ شاعر تھے۔ دیکھیے نا انھوں نے کہا ہے:

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو

کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

باقی جو کچھ اقبالؔ نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولِ پاک (جن کے وہ عاشق تھے) کے متعلق کہا ہے اور اسلام کے متعلق کہا ہے، اس کی عظمت، اس کی پاکیزگی، اس کی حُرمت کے متعلق کہا ہے اور وہ جو انھوں نے ملّت کے متعلق کہا ہے اور اس ملت میں جذبۂ وحدت کے متعلق کہا ہے اور مسلمانوں کو پہلی بار پاکستان کی ایک تصویر (دُھندلی ہی سہی) پیش کی ہے اور اسلامیوں کے گیت گائے ہیں۔ خواہ وہ کالے ہوں یا گورے، مشرقی ہوں یا مغربی، غریب ہوں یا امیر اور وہ جو انھوں نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے ایمان سے ہمیں اپنے اشعار کی معرفت متعارف کرایا ہے۔

اُمتے بودی اُمم گردیدہ ۔   بزم خود را خود زہم پاشیدہ

عطا اسلاف کا جذبِ دروں کر

شریکِ زمرہ لا یحزنوں کر

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست

اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

عصرِ ما ؛ مارا ز ما بیگانہ کرد   از جمالِ مصطفےٰ بیگانہ کرد

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کل جس نے

غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

ان باتوں سے نئی نسل کو بے خبر رکھا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ ایک سازش کے تحت ہو

رہا ہے، جس میں کئی اور غیر ملکی ہاتھ ہیں۔ جو اب پاکستانی مسلمان کو راہِ راست سے بھی بھٹکا رہے ہیں اور "مزاجِ خانقاہی" میں پختہ تر کر رہے ہیں۔

میں یہ بات پہلے واضح طور پر کہہ چکا ہوں کہ اگر سرسید، حالی، شبلی، اکبر اور اقبال نہ آتے تو قائد اعظم کی بات "مسلمانوں کے لیے علیحدہ وطن" کسی کی سمجھ میں ہی نہ آتی۔ کیا یہ ہماری بدقسمتی نہیں کہ پاکستان کی نئی نسل کو نہ صرف معمارانِ پاکستان سے روشناس نہیں کرایا جا رہا بلکہ ارادۃً گمراہ کیا جا رہا ہے تاکہ وہ بھٹکنے لگیں اور یہ بھٹکنا ایک خاص نظریۂ حیات نے ایجاد کیا ہے کہ وہ اپنی عمارت ایسی ہی بھٹکی ہوئی قوتوں پر کھڑی کرتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کو قائد اعظم نے کمیونسٹ COMMUNIST ففتھ کالمسٹ، بھارتی ایجنٹ، تخریب کار کہا تھا اور ان کی ناپاک سازشوں سے بچنے کی تلقین کی تھی۔ مگر اب یہی لوگ سرکاری کمین گاہوں میں بیٹھے اپنی ناپاک سرگرمیوں میں مصروف ہیں اور کوئی ان کا محاسبہ کرنے والا نہیں۔ ہمارے ذرائع ابلاغ تو خاص طور پر ان وطن دشمنوں کے زیرِ اثر ہیں۔

میں یہ دعویٰ سے کہتا ہوں کہ اگر پاکستان نے زندہ رہنا ہے (اور خدا کرے یہ ہمیشہ سلامت رہے) تو ہمارے نوجوان طبقہ کو اپنی تاریخ کے صحیح پہلوؤں اور نظریوں سے آگاہی لازم کرنی ہوگی۔ انھیں صاف طور پر پتہ ہونا چاہیے کہ ہمارا قافلہ کہاں سے چلا تھا۔ اس کے کیا ارادے اور کیا عزائم تھے۔ زادِ راہ کیا تھا اور اس کی منزل کون سی تھی۔ پھر ان کو اس کی بھی تمیز ہونی چاہیے کہ ہم اپنی مقرر کردہ منزل کی جانب بڑھ رہے ہیں یا راستہ سے بالکل بھٹکے جا رہے ہیں۔ ایسے کہ کسی دن (خدانخواستہ) قعرِ مذلت میں گر پڑیں گے۔

بزمِ اکبر کے انعقاد کے ساتھ ہی "مجلسِ اقبال" کی بنیاد بھی رکھی گئی جس نے اقبال کے کلام کی روح کو اُونچے (اور کسی حد تک بھٹکے ہوئے) طبقہ کے سامنے اس کی حقیقی شکل میں پیش کیا۔ مجلس کے سالانہ اجلاس گورنر جنرل ہاؤس میں منعقد ہوتے تھے جس میں تمام غیر ملکی سفیر اور ملکی اکابرین شامل ہوتے تھے جو بلند پایہ مقالوں اور تقریروں سے اقبال کے پیغام کی روح سے

آشنائی حاصل کرتے تھے۔

اقبال سے وابستگی کا یہ عالم تھا کہ ایک مخصوص "حلقۂ قلندرانِ اقبال" قائم کیا گیا جس کے سرخیل مصر کے سفیر اور مشہور ادیب محترم عبدالوہاب عظام بے (جو میرے نہایت ہی عزیز دوست تھے) مُتررہوئے۔ حلقہ کی مجالس اکثر ان کے ہاں یا میرے ہاں منعقد ہوتی تھیں اور ہمارے ذوق کا یہ عالم تھا کہ اقبال کے پیغام کو ہر زبان میں سُننا چاہتے تھے چنانچہ میری استدعا پر عظام بے مرحوم نے "بالِ جبریل" کا ترجمہ عربی زبان میں کیا جو مصر میں بڑے اہتمام سے چھپا اور عربی دانوں کی رائے میں فارسی کو عربی کے قالب میں ڈھالنے کی یہ بڑی کامیاب کوشش ہے

میں ۱۹۴۳ء سے دولت مشترکہ ممالکِ اسلامیہ کے خیال کو فروغ دینے کی دُھن میں لگا رہا۔ "حلقۂ قلندرانِ اقبال" میں "ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے" کا جذبہ خاص طور پر نمایاں تھا۔ اس کو ذرا وسیع کر کے (اگرچہ حلقہ کی بزم یاراں سے باہر) دوسرے ممالکِ مسلم کے سفیروں سے دلی رابطہ قائم کیا گیا۔ خصوصاً انڈونیشیا کے مسٹر شمس الدین (مرحوم) کے ساتھ اور سعودی عرب کے جناب عبدالحمید الخطیب کے ساتھ عراق، لبنان، ترکی اور ایران کے سفیروں سے بھی کافی مراسم استوار کیے۔ اکثر میرے مکان پر کسی نہ کسی طور اجتماع مسلم سفیروں کے ہوتے تھے اور اس طرح عالمِ اسلام اور پاکستان کے درمیان تعلقات بہتر اور مضبوط بنانے میں بڑی مدد ملتی۔ غیر ملکی سفارت خانوں میں سے امریکن تو صرف ہماری ان ملاقاتوں اور حلقہ کی مصروفیات کو زیرِ مطالعہ رکھتے تھے۔ لیکن برطانوی ہائی کمشنر سر لارنس گریفی سمتھ SIR LAWRANCE GRAFTY SMITH (ہفت زبان، اسلامی ممالک سے خُوب واقف) ہماری ملاقاتوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھتے تھے اور میرے خلاف جو کچھ بھی وہ کر سکتے تھے اس سے دریغ نہ کرتے تھے۔ میں بھی اپنی انگریز دشمنی میں بات ڈھکی چھپی نہ رکھتا تھا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں فرسٹ ایر میں داخل ہوتے ہی میں "فرسٹ الیون" یعنی کالج کی کرکٹ ٹیم کا ممبر بن گیا تھا۔ تیسرے سال کلب کا سیکرٹری مقرر ہُوا۔ جو اس زمانہ میں کالج میں ایک

بہت بڑا عہدہ تھا۔ کرکٹ سے شغف ساری عمر رہا۔ لاء کالج میں پہلی بار کرکٹ کلب قائم کی اور ٹیم کا کپتان چُنا گیا۔ شاید اسی بنا پر وزارت کا چارج سنبھالتے ہی مجھے پاکستان بورڈ آف کرکٹ کنٹرول کا پہلا صدر منتخب کر لیا گیا (کراچی کے کرکٹ سٹیڈیم کی جگہ کا انتخاب میں نے کیا تھا) خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل اور اپنے دوست مسٹر احمد صغیر (کراچی کی معروف ہستی) کو جگہ کے انتخاب کے واسطے ساتھ لے گیا تھا۔ خواجہ صاحب بورڈ کے مُربّی تھے اور احمد صغیر ممبر تھے۔ کرکٹ کو اپنے پیروں پر کھڑا ہوتے دیکھ کر (میں نے بورڈ کے لیے کافی سرمایہ اکٹھا کیا) بھلا ہاکی والے کب پیچھے رہتے تھے۔ ہاکی فیڈریشن کے اعلیٰ افسران میرے پاس پہنچے کہ آپ فیڈریشن کے صدر بن جائیں۔ میں نے معذوری کا اظہار کیا کہ میں کبھی ہاکی کھیلا نہیں۔ اور بہرحال کرکٹ کی نئی تنظیم کا بوجھ اٹھا چکا ہوں، اب مزید ذمہ داری قبول نہیں کر سکتا لیکن فیڈریشن میں کئی پُرانے دوست تھے وہ بھلا کب مانتے تھے۔ آخر مجبوراً مجھے ان کا مطالبہ ماننا پڑا اور خُدا کا شکر ہے کہ پاکستان ہاکی کو ایک اعلیٰ مقام پر پہنچانے میں اس عاجز نے بھی (پہلے پہل) حتیٰ المقدور کوشش کی۔ کرکٹ اور ہاکی کے لیے ہزاروں روپیہ اکٹھا کیا اور ان کو پاکستان کی ضرورت کے مطابق مناسب اور نئی بنیادوں پر استوار کر کے ان میں نئی رُوح پھُونکی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ یہ دونوں تنظیمیں آج تک قائم ہیں، اور عام طور پر کرکٹ اور ہاکی والے اچھے معیار کا کھیل دنیا کے سامنے پیش کر کے پاکستان کا نام روشن کر رہے ہیں۔ میں جب دُور سے (نزدیک آنے کی اجازت نہیں ہے) ان دونوں کی اچھی کارگزاری کو دیکھتا ہوں تو بطور ایک کھلاڑی کے (آجکل گولف کھیلتا ہوں۔ اب ٹینس نہیں کھیل سکتا) دل سے دُعا نکلتی ہے کہ اللہ ان تنظیموں کو اور بھی ترقی، شہرت اور استقامت بخشے تاکہ یہ پاکستان کا نام بین الاقوامی دنیا میں اپنے کھیل، تنظیم، اخلاق اور کردار سے اور بھی اُونچا کر سکیں۔ آمین۔

جب سے میں نے برٹش کامن ویلتھ آف نیشنز کا تماشا (اکتوبر ۱۹۴۸ء) میں دیکھا میری خواہش تھی کہ پاکستان اس "برطانوی برادری" سے الگ ہو جائے اور صحیح معنوں میں آزاد اور

خود مختار ہو۔ اس خیال کا اظہار میں نجی محفلوں میں بھی کرتا تھا اور جب کبھی اجتماعی تقریبوں میں موقعہ ملتا تھا اشارۃً کہہ جاتا تھا۔ میں خوش ہوں کہ اب ہم برٹش کامن ویلتھ کے ممبر نہیں ہیں لیکن حقیقی طور پر مسرت اس وقت ہوگی جب ہم ایک دولتِ مشترکہ ممالک اسلامیہ قائم کر کے پاکستان کو اس کا ایک مضبوط ستون بنا سکیں گے۔

۱۹۵۰ء کی بین الاقوامی اسلامی اقتصادی کانفرنس کراچی کے ایک اجلاس میں میرے خطبہ کو برٹش سفارتی حلقوں نے مشکوک نظروں سے دیکھا اور چونکہ برٹش پیٹرول کمپنی کے معاملہ میں میرا نظریہ خالص پاکستانی (یعنی پاکستان کے مفاد کو سب باتوں پر ترجیح دینا) اور برٹش مفادات پر کڑی نگرانی رکھنے کا تھا۔ اور بھی کئی اقدامات ایسے کیے جس سے خصوصاً برٹش (کیونکہ ابھی تک وہی حلقے نئے پاکستان کے قریب تر تھے) مجھ سے ایک حد تک بدظن ہو گئے اور میرے خلاف زمین دوز طریقہ سے کام شروع کر دیا۔ ان کی رسائی گورنر جنرل خواجہ ناظم الدین صاحب کے ہاں زیادہ تھی۔ ان کے کان بھرنا شروع کر دیے۔ چنانچہ انھوں نے ایک دو دفعہ اشارۃً اس کا ذکر بھی کیا۔ مسٹر لیاقت علی خاں مرحوم، وزیر اعظم نے بھی مجھے کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔

میں آگے چل کر بتاؤں گا کہ یہ روش کھُلم کھلا میری مخالفت پر ختم ہوئی۔ فی الحال اتنا عرض کرنا کافی ہوگا کہ اس کی بنیاد اپنا عہدہ سنبھالتے ہی میں نے رکھ دی تھی۔

زمانۂ وزارت میں مجھے تین دفعہ بیرونِ ملک بھیجا گیا (جس سے میرے ہم ممبروں میں کچھ چشمک زنی بھی ہوئی)

یہ تینوں سفر اس قابل ہیں کہ ان کو ذرا تفصیل سے بیان کیا جائے کہ ہر ایک سے کچھ سبق حاصل ہو سکتے ہیں۔

سفرِ انڈونیشیا
بتقریبِ انتقالِ اقتدار

دسمبر ۱۹۴۹ء میں مجھے (سابق بٹاویہ۔ حال جکارتہ۔ انڈونیشیا کے دارالخلافہ) پاکستان کے سہ رُکنی وفد کے قائد کی حیثیت سے بھیجا گیا کہ انتقالِ اقتدار کی تقریبات میں شرکت کرسکوں ۲۸ر دسمبر ۱۹۴۹ء کو ہم جکارتہ کے ہوائی اڈے پر پہنچے۔ ہمارے ساتھ ہی بھارت کا دس رُکنی وفد راجکماری امرت کور کی قیادت میں اسی جہاز سے جکارتہ پہنچا۔ مسٹر نجیب اللہ بھارت میں افغانستان کے سفیر ان کے ہمراہ تھے۔ اس وقت ہمارا کوئی سفارت خانہ انڈونیشیا میں نہ تھا۔ برٹش سفارت خانہ ہمارے معاملات کا نگران تھا۔ ہمیں ویسے بھی وہاں کوئی نہ جانتا تھا۔ ہندوستان نے انڈونیشیا کو اس کی جنگِ آزادی میں کچھ روپیہ بھی دیا تھا۔ کچھ سبق بھی دیے تھے۔ کئی انڈونیشی راہنما مسٹر گاندھی اور پنڈت نہرو کے ہاں رہ کر کام سیکھ چکے تھے' اس لیے ہوائی اڈے پر بھارتی وفد کا پُرتپاک استقبال ہُوا۔ "جے ہند" کے نعرے بلند ہوئے۔ ہمیں کسی نے بھی نہ پُوچھا۔ اتنے میں چند پاکستانی مسلمان جو کہیں سے خبر پاکر ہوائی اڈے پر پہنچے ہوئے تھے' انھوں نے "اللہ اکبر۔ اللہ اکبر" کے دل افروز نعروں سے فضا میں گونج پیدا کر دی۔ متعلقہ افسروں نے رسمی استقبال کیا لیکن مقامی باشندے اللہ اکبر کے نعروں میں شریک ہو گئے۔ اور ہماری کار جب چلی تو ایک پُرجوش ہجوم اس کے ساتھ تھا۔ پاکستان۔ پاکستان۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر کے نعروں کا تانتا بندھا ہُوا تھا۔ وقتاً فوقتاً مرڈیکا (MERDEKA) (آزادی) کے اُونچے نعرے گونجتے تھے اور اس طرح ہماری ابتدائی کس مپرسی ایک پُرجوش جلوس میں تبدیل ہو گئی

جو کچھ ہم نے انڈونیشیا کے دس روزہ قیام میں دیکھا وہ ہمارے لیے بڑا رُوح پرور نظارہ تھا کہ ڈیڑھ سال قبل ہم بھی اسی حالت سے گزر چکے تھے۔ آزادی کی نعمت ایسی ہوتی ہے اور غیروں کی غلامی سے رہائی کی اتنی خوشی ہوتی ہے کہ نہ فکرِ فردا نہ غمِ دوش۔ نہ بھوک کی پروا، نہ افلاس کی۔ نہ سامنے کھڑے اقتصادی مسائل سے خوف آتا ہے بس وہ شاعر کی سی حالت ہوتی ہے۔

اب تو آرام سے گزرتی ہے
عاقبت کی خبر خدا جانے

قوموں کی زندگی میں یہ اہم ترین موڑ ہوتا ہے۔ غیر ملک، غیر مذہب، غیر قوم کی حکومت، دنیا میں سب سے بڑی لعنت ہے۔

ہمارے انڈونیشی بھائی ایک طویل جدوجہد کے بعد قریباً قریباً نستے ڈچ (ولندیزی) استبداد سے نجات پانے میں کامیاب ہوئے تھے، وہ اس پر جس قدر فخر کرتے بجا تھا۔ ہم ان کی خوشی میں دل سے شریک تھے اور ان کی مزید کامیابیوں کے خواہاں۔

ظالم ڈچ حکومت نے انڈونیشیا کے EMERALD ISLAND (زمردی جزائر) کو جس بے دردی سے لُوٹا کھسوٹا، اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ ولندیزیوں کے مقابلہ میں برطانوی راج ایک بہتر قسم کی حکومت تھی کہ انگریز اپنے غلاموں کو تعلیم دیتے تھے۔ (اگرچہ اپنے مقاصد کے لیے) انتظامیہ، عدلیہ، مقننہ میں حصہ تو لینے دیتے تھے لیکن ڈچ حکومت نے تین سَو سال کے قریب انڈونیشیا میں یونیورسٹی تو کُجا کالج تک نہیں بنایا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ہالینڈ جانا ضروری تھا اور وہاں بھی آپ صرف ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ پولیٹیکل، سائنس، وکالت، انتظامیہ وغیرہ کی تعلیم کے دروازے آپ پر سختی سے بند تھے۔

انڈونیشیا کے جزائر میں اسلام کا اثر مختلف طور پر پایا گیا۔ سماٹرا خالص اسلامی معاشرہ کا پابند۔ حتیٰ کہ حافظِ قرآن نہ ہو تو اس وقت تک شادی نہ ہو سکتی تھی، حاجی ہونا بھی ضروری تھا۔

جاوا میں ہندو تہذیب ابھی تک اسلام کو دبائے ہوئے تھی۔ لیکن بہرصورت وہ لوگ عقیدۃً مسلمان تھے اور مسلمان دُنیا کے قریب آنا چاہتے تھے۔ باوجودیکہ مسٹر احمد سوئیکارنو کی حکومت SECULAR (لادین) تھی' مذہبی نہ تھی لیکن وہ اس قدر زیرک سیاست دان تھے کہ پاکستان کو ہمیشہ بھارت کے مقابلہ میں برابری کا درجہ دیا۔ وہ پاکستانی نظریاتِ زندگی اور رسم و رواج کا اتنا خیال رکھتے تھے کہ جب الوداعی تصاویر مختلف وفود کے قائدین کے ساتھ لی جارہی تھیں تو مرحوم مسٹر سوئیکارنو کی تیسری بیوی محترمہ فاطمہ دتی کے ساتھ وہ تصاویر کھچوا رہے تھے۔ جب ہماری باری آئی تو فوٹو گرافر تصویر لینے ہی لگا تھا کہ صدر سوئیکارنو نے فوراً اشارہ کر کے روک دیا پھر محترمہ فاطمہ دتی کے سر پر سے جو دوپٹہ سرک کر پیچھے ہٹ گیا تھا وہ خود اپنے ہاتھ سے ماتھے پر کر دیا۔ تاکہ پاکستان میں یہ تصویر جائے تو قابلِ اعتراض نہ ہو۔

عوام میں پاکستان کے حق میں بے پناہ جذبہ تھا یہ جذبہ اتنا نمایاں تھا کہ ایک تقریب میں امریکی سفیر مجھ سے کہنے لگے SIR THERE ARE YOUR PEOPLES YOU SHOULD TAKE CHARGE OF THEM.

"یہ آپ کی برادری ہے' آپ ان کو گلے لگائیے"

مسٹر نجیب اللہ خان (افغان مندوب) کا رویّہ بڑا دلچسپ رہا وہ کھاتے اور پیتے ہندوستانیوں کے ساتھ لیکن فوٹو برادر کے (یعنی میرے) ساتھ کھچواتے تھے اور برادر' برادر کی گردان جاری رکھتے تھے۔ بعد میں سُنا کہ ان کا کرایہ بھی بھارتی حکومت نے ادا کیا تھا۔

مرحوم صدر سوئیکارنو ایک ہمہ صفت لیڈر تھے۔ نہایت اعلیٰ درجہ کے مُقرّر بلکہ خطیب، دل کش شخصیت' واقعاتِ عالم سے بڑے باخبر، زیرک اور معاملہ فہم اور پھر قوم کے منظورِ نظر اُن سے ہاتھ ملائیے تو معلوم ہوتا تھا کہ بجلی کی رَو آپ کے جسم میں سرایت کر گئی ہے

گورنمنٹ کے حُکّام نے ہمیں مسجومی پارٹی (وہاں کی جماعت اسلامی) کے لیڈروں سے ملنے نہ دیا لیکن جب میں نے اصرار کیا تو آخری رات ہماری مُلاقات ہوئی۔ مسٹر

محمد ناصر NATSIR جو کچھ عرصہ بعد انڈونیشیا کے وزیر اعظم مقرر ہوئے لیکن صدر سوئیکارنو سے اختلافات کی وجہ سے چھ ماہ بعد ہی باغیوں کی جماعت کے سرفہرست کی صورت میں کئی سال جنگلوں میں روپوش ہوئے، پارٹی کے لیڈر تھے۔ دو وزیر بھی پارٹی کے ممبر تھے۔ ڈاکٹر محمد روم وزیر خارجہ، اور جناب واحد ہاشم وزیر امور مذہبی کوئی ۲۵ ممبر اور تھے۔ یہ ملاقات پونے چار بجے رات تک جاری رہی اور جب ہمیں رخصت کرنے لگے تو وہ سب چشم پُرنم تھے اور یہاں بھی یہی حالت تھی۔ اس وقت کے ۱۲ کروڑ مسلمانوں کا یہ ملک پاکستان کے بہت قریب آسکتا تھا لیکن افسوس کہ اس وقت کی وزارتِ خارجہ نے میری رپورٹ اور سفارشات پر توجہ نہ دی اور حالات رفتہ رفتہ اس مقام پر جا پہنچے جہاں اب ہیں۔

فارن آفس کے ایک بہت بڑے افسر نے انہی دنوں میں مجھ سے کہا تھا کہ "اگر وزارتِ خارجہ آپ کی رپورٹ پر عمل کرتی تو پاکستان اور انڈونیشیا ایک دوسرے کے بھائی ہوتے"۔

میری رائے میں اب بھی اگر ہماری روش بہتر ہو تو ہم دونوں ایک دوسرے کے قریب آسکتے ہیں۔ انڈونیشیا کا اقتصادی مستقبل بڑا روشن ہے۔ تیل کی دریافت نے اس کے قدرتی ذخائر میں قابلِ قدر اضافہ کر دیا ہے۔ ویسے بھی اسلام کا رشتہ بہت حقیقی ہے اور بہت مضبوط ہو سکتا ہے۔

رخصت ہونے پر میں نے صدر سوئیکارنو مرحوم اور میڈم سوئیکارنو کو پاکستان آنے کی دعوت دی، جو انہوں نے بخوشی قبول کی۔ چنانچہ وہ دونوں یہاں آئے۔ بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ مسٹر لیاقت علی خاں کے ہاں دعوت پر میڈم سوئیکارنو نے قرآن کی قرأت سے حاضرین پر وجد طاری کر دیا۔ سبحان اللہ! بس قرأتِ مصری کا سماں تھا اور کیا استغراق تھا۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ہمارے بھائی ساری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ایک دوسرے کے قریب آنے کے بہترین مواقع رکھتے ہیں۔ سب سے ٹھوس حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس ایک اللہ، ایک رسولؐ، ایک کتاب اور ایک شریعت ہے اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر اور رشتہ کیا ہو سکتا ہے۔

کیا مسلمانوں کو کبھی اپنے حقیقی ورثہ کا صحیح اندازہ ہو سکے گا؟ ☆

سفر آسٹریلیا

بسلسلہ شمولیت کنسلٹیٹو کمیٹی

مئی سنہ ۱۹۵۰ء میں مجھے کامن ویلتھ کنسلٹیٹو کمیٹی COMMONWEALTH CONSULTATIVE COMMITTEE کے اجلاس منعقدہ سڈنی (آسٹریلیا) میں پاکستانی وفد کی قیادت کے واسطے منتخب کیا گیا جس میں برٹش کامن ویلتھ BRITISH COMMONWEALTH کے ۹ ملک حصہ لے رہے تھے۔ ایجنڈے میں COLUMBO PLAN کے عملی پہلوؤں پر غور ہونا تھا اور پاکستانی وفد کی کوشش یہ تھی کہ اس پلان سے پاکستان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو سکے۔ سر راما سوامی مدالیار SIR RAMA SWAMI MUDALIAR ہندوستانی وفد کے لیڈر تھے جو گورنمنٹ آف انڈیا کے زمانہ میں بیرونِ ملک کئی وفود کی قیادت کر چکے تھے۔ کانفرنس کے اجلاس میں میں نے ایک بات ضمنی طور پر پیش کی۔ اگرچہ اس کی مار دُور پڑتی تھی۔ میں نے SIR SUBRAMANIUM AYER کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا کہ ہم جو یہاں ایک برادری کے ممبران کی حیثیت سے جمع ہوئے ہیں، ہمیں چاہیے کہ ہم اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے بعض تنازعات بھی باہمی افہام و تفہیم سے فیصلہ کرنے کی کوشش کریں تاکہ ہمارے ممالک پر جو کشیدگی کے بادل چھائے ہیں، وہ چھٹ جائیں۔ میرا اشارہ کشمیر کے تنازعہ کی طرف تھا۔

دوسرے دن آسٹریلوی اخبارات میں اس فقرہ کو بڑی اہمیت دی گئی اور بعض نے تو یہاں تک لکھ دیا کہ چودھری نذیر احمد خاں کی اس براہِ راست چوٹ کے باوجود

SIR SUBRAMANIUM AYER کے چہرے پر کسی قسم کے جوابی آثار نہ دیکھے گئے
اگلے دن سڈنی کے اخبار SUN کے ایک کالم نویس ڈاکٹر DR. BARCOS نے
قائدینِ وفود کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا کہ ہمیں جس DELEGATE نے سب سے زیادہ متاثر
کیا ہے وہ چودھری نذیر احمد خاں وزیرِ صنعت پاکستان ہیں۔ وہ بلند قامت ہیں اور ہمارے وزیرِ خارجہ
MR PEREY SPENDER کی طرح کھری باتیں کرتے ہیں۔ ایشیا کے معاملات میں انہیں
بڑی واقفیت ہے۔ اعلیٰ درجہ کی OXFORD انگریزی زبان بولتے ہیں اور سپین کے بادشاہ
ALFANSO سے بہت ملتے جلتے ہیں جو اس وقت MOST ELEGANT
GENTLEMAN OF HIS TIME IN EUROPE ہیں رنگینی جو یورپ
میں اپنے وقت کے نفیس ترین شرفا میں ممتاز ترین درجہ رکھتے ہیں۔"

مقابلتاً SIR RAMA SWAMI MUDALIAR "ہمیں صاحب
موصوف معاف کریں گے اگر ہم یہ کہیں کہ وہ تھوڑی سی مونچھیں ترشوا لیں اور سفید ٹائی پہن
لیں تو بالکل موسیو لاوال LAVAL (فرانس) کے غدار سربراہِ مملکت VICHY
PRESIDENT کے مشابہ ہو جائیں گے۔

الحمد للہ! کہ پاکستان کا حصہ اس کانفرنس میں بہت نمایاں رہا اور COLUMBO
PLAN سے فائدہ اٹھانے کے زیادہ مواقع ہم نے حاصل کر لیے۔

کانفرنس سے باہر دو چار تاثرات ایسے ہیں جن کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ پہلا تو یہ
کہ جب ۹ قائدینِ وفود کی غیر رسمی ملاقات مسٹر PEREY SPENDER (جو بعد میں SIR
PEREY SPENDER ہوئے) وزیرِ خارجہ کے گھر ہوئی تھی تو راستہ بھر کوئی پولیس کا
سپاہی ہمیں نظر نہ آیا۔ ڈرائیور سرکاری تھے، وہ مکان جانتے تھے۔ ہم مکان میں داخل ہوئے
گھنٹی بجائی مسٹر SPENDER نے دروازہ کھولا (ملازم اس وقت تک آسٹریلیا کے دستور
کے مطابق جا چکے ہوتے ہیں۔) ایجنڈا کے متعلق گفتگو شروع ہوئی۔ مسز سپینڈر

MRS. SPENDER نے کافی COFFEE پیش کی۔ اس کے دوران ادھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ مسز SPENDER کہنے لگیں کہ آپ کی بات تو ختم نہیں ہو گی اور میں نے ابھی برتن دھونے ہیں۔ اس پر وزیرِ خارجہ نے کہا کہ میں مہمانوں کو رخصت کر کے آپ کے ساتھ شامل ہوتا ہوں۔ ہم نے جلدی سے رخصت حاصل کی اور کمرے سے نکلتے وقت مسٹر SPENDER کو کوٹ اُتارتے، بازو چڑھاتے اور PANTRY (برتن دھونے کا کمرہ) میں داخل ہوتے دیکھا۔

دوسرا واقعہ وفاقی دارالخلافہ CANBERRA میں وزیرِاعظم مسٹر MENZIES کی اقامت گاہ پر حاضری دینا تھا۔ جہاں کوئی سپاہی یا ملازم باہر نہیں تھا۔ مسٹر یوسف ہارون جو ابھی ابھی آسٹریلیا میں پاکستان کے سفیر مقرر ہوئے تھے اور بعد میں مغربی پاکستان کے بھی کچھ دن گورنر رہے، میرے ہمراہ تھے۔ ہم نے گھنٹی بجائی۔ ایک ضعیف مُلازمہ باہر آئی۔ ہم نے پوچھا تو اس نے کہا کہ وزیرِ اعظم صاحب موجود نہیں۔ ہم نے مُلاقاتیوں کی کتاب (VISITOR'S BOOK) مانگی تو وہ ہمیں دے کر اس بے پروائی سے رخصت ہوئی کہ اگر ہم میز کے نیچے بم بھی رکھ دیتے تو کسی کو پتہ نہ چلتا۔ گورنر جنرل کے ہاں البتہ ہم نے ایک سپاہی کھڑا دیکھا۔ کیونکہ گورنر جنرل براہِ راست نمائندہ ہوتا ہے۔

تیسری بات جو میں نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ سارے سڈنی میں صرف ۱۶ پیکارڈ (PACKARD) کاریں تھیں جو غیر ملکی مہمانوں کے واسطے مخصوص تھیں۔ مقامی ضروریات کے واسطے چھوٹی ہولڈن (HOLDEN) استعمال ہوتی تھیں۔ اکثر وُزراء پیدل دفتر جاتے تھے صرف ایک کیڈلک (CADELLAC) (سب سے قیمتی گاڑی) جو ماشاءاللہ پاکستان کی تھی۔ یہ باتیں میں نے دیکھیں اور ان کا گہرا اثر میرے دل پر ہُوا۔ واپسی پر میں نے وزیرِ داخلہ خواجہ شہاب الدین صاحب کو چٹھی لکھی کہ ہمارے حفاظتی سپاہی GUNMAN اور کوٹھیوں پر سے حفاظتی دستے اُٹھا لیے جائیں۔ چٹھی میں میں نے لکھا کہ اپنے مکان سے

وزیراعظم صاحب کے مکان تک (کوئی نصف میل کے فاصلے میں) مجھے تیس دفعہ سلام کا جواب دینا پڑتا ہے۔ جب میں جھنڈے والی کار میں بیٹھتا ہوں تو گارڈ SALUTE (سلامی) دیتا ہے جب صبح صبح پیدل سیر کو جاتا ہوں تو اسے پتہ بھی نہیں ہوتا کہ کون ہے۔ میرا منہ دیکھتا رہتا ہے۔

میں کلفٹن کی سڑک پر علی الصبح سیر کو جاتا ہوں جو اس زمانہ میں سنسان ہوتی تھی کوئی GUNMAN (پستول والا محافظ) ساتھ نہیں ہوتا۔ اگر کسی نے مجھے مارنا ہے تو اس سے اچھا موقعہ کیا ہو سکتا ہے۔ ہاں جب میں کسی تقریب میں شامل ہوں یا دفتر جاؤں تو GUNMAN ہمزاد کی طرح ساتھ چمٹا رہتا ہے۔ میں آسٹریلیا میں جو کچھ دیکھ آیا تھا اس کا بھی مختصراً حوالہ دیا۔

خواجہ صاحب نے یہ چٹھی CABINET میں بھیج دی۔ مسٹر لیاقت علی خاں ملک سے باہر تھے۔ وزیر خارجہ سر ظفر اللہ (سینئر وزیر) ان کے قائم مقام تھے۔ میری تجویز منظور نہ ہوئی۔ میں نے کہا کم از کم میری کوٹھی سے تو پہرہ ہٹالو اور میرے GUNMAN تو ہٹالو۔ جواب ملا جب تک آپ اس عہدہ پر فائز ہیں مملکت آپ کی حفاظت کی ذمّہ دار ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کو بغیر حفاظت کے چھوڑ دیا جائے۔ باوجود اس جواب کے میں جب لاہور آتا تو سرکٹ ہاؤس (چیمبہ ہاؤس) یا گورنمنٹ ہاؤس میں نہ ٹھہرتا۔ اپنے خسر مولوی غلام محی الدین صاحب (مرحوم) کے ہاں ٹھہرتا۔ گارڈ کے متعلق حکم دے رکھا تھا کہ کوئی گارڈ نہیں ہوگا۔ ایک دفعہ جنوری کی رات کو ریل گاڑی سے لاہور پہنچا۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے شب کا وقت تھا۔ مولوی صاحب مرحوم کی کوٹھی پہنچا تو گارڈ نے جنرل SALUTE دیا۔ میں نے پرائیویٹ سیکرٹری سے باز پرس کی کہ گارڈ کیوں موجود ہے۔ انھوں نے بتایا کہ حکام متعلقہ کو اطلاع دے دی گئی تھی کہ گارڈ نہ بھیجیں۔ معلوم ہوتا ہے کہیں غلطی ہوئی ہے۔ میں نے گارڈ والوں کو دس روپے اپنے پاس سے دیئے کہ اپنی چھولداری پولیس لائن میں لے جائیں۔ مجھے کسی پولیس والے کی حفاظت کی ضرورت نہیں ہے (وہ دس روپے ابھی تک حکومتِ پاکستان نے واپس نہیں کیے) جب میں پنجاب کے دورے پر آتا تھا تو اپنے دونوں GUNMAN کو جو پنجاب کے رہنے والے

تھے چھٹی دے دیا کرتا تھا کہ گھر ہو آؤ۔

درحقیقت مجھے بچپن سے مصنوعی ریاستی طمطراق دیکھ کر ظاہری جاہ و جلال سے کچھ رغبت نہ تھی۔ باہر کے زیادہ امیر اور شاہ پسند ملکوں میں میں نے یہ تکلفات نہ دیکھے تھے اس لیے پاکستان میں بھی میں نے سادگی کی روش پر چلنے کی کوشش کی اور شروع میں پیدل CABINET کے اجلاس میں جانا شروع کیا لیکن یہ بات اتنی ناپسندیدہ ہوتی کہ مجبوراً مجھے بھی روایتی سلسلہ کی ایک کڑی بننا پڑا۔ اگرچہ میرا دل نہ مانتا تھا اور نہ ہی ان تکلفات سے خوشی ہوتی تھی۔

مجھے وزراء کا استقبال یا ان کو الوداع کہنے کے لیے اجتماعات کی رسم نہ اس وقت پسند تھی نہ اب۔ اس بے معنی رسم سے نہ صرف انسان کی انانیت مجروح ہوتی ہے، بلکہ ملک کے قیمتی وقت کا بڑا نقصان ہوتا ہے۔

انگریز کے زمانہ میں تو اسے کسی حد تک اس جاہ وحشم کے مظاہرہ کی ضرورت تھی لیکن اسلامی حکومت پاکستان میں ان لغویات کا کیا جواز ہے؛ اس ضمن میں ایک سبق آموز واقعہ سُن لیجیے:۔

میں نے ابھی اپنے عہدہ کا چارج لیا ہی تھا کہ پرائیویٹ سیکرٹری نے فون کیا۔ وزیر اعظم صاحب دورے پر جا رہے ہیں۔ میں نے پوچھا پروگرام آپ نے بھیج دیا۔ بولے جی۔ میں نے کہا بہتر۔ وہ کہنے لگے کہ جناب آپ کو ہوائی اڈہ پر جانا چاہیے۔ میں نے پوچھا کہ وزیر اعظم صاحب نے کسی خاص معاملہ کے متعلق میرے ساتھ بات کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے؟ کہا۔ یہ تو نہیں لیکن اطلاع PRIME_ MINISTER'S HOUSE-HOLD سے آئی ہے۔ میں نوآموز تھا۔ پوچھا۔ اس کا کیا خاص مطلب ہوتا ہے؟ بولے کہ وزیر صاحبان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ ہوائی اڈہ پر الوداع کے لیے حاضر ہوں۔ میں نے کہا میں تو جانے کو تیار نہیں۔ انھوں نے حق الخدمت کے جذبہ سے پھر کہا کہ جناب آپ کی عدم موجودگی سب کی

نظروں میں کھٹکے گی۔

میں نے کہا آپ میری طرف سے PRIME MINISTER'S HOUSEHOLD سے کہہ دیں کہ آئندہ اگر وزیر اعظم صاحب خود مجھ سے کسی معاملہ میں بات کرنا چاہیں یا یہ کہ کیبنٹ کا فیصلہ ہو کہ ان کو وداع کیا جائے یا ان کا استقبال کیا جائے یا کوئی قومی اہمیت کا موقعہ ہو تو مجھے پرائم منسٹر کے دورہ کی ان کے HOUSEHOLD کی جانب سے اطلاع آسکتی ہے ورنہ دفتر سے پروگرام بھیج دینا کافی ہوگا۔

وہ دن اور میری وزارت کا آخری دن۔ نہ مجھ سے کسی نے حاضری کی توقع کی اور نہ ہی کبھی عدمِ حاضری کا گلہ کیا۔ مسٹر لیاقت علی خان مرحوم کو خدا جنت نصیب کرے۔ انھوں نے تو کبھی اشارۃً بھی اس واقعہ کا ذکر نہ کیا اور نہ ہی ان کی شفقت میں کوئی فرق پڑا۔

اس واقعہ کے چند دن کے بعد جب میں ریل پر لاہور آنے لگا (کہ اپنا سامان وغیرہ لاہور لے آؤں) تو اسٹیشن پر بیسیوں افراد اہلکارانِ وزارتِ صنعت موجود پائے جو الوداع کہنے کو آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان کا رسماً شکریہ ادا کیا اور یہ بھی بتا دیا کہ میں کسی خطرناک مہم پر نہیں جا رہا، معمولاً سفر کر رہا ہوں۔ پھر گاڑی چلتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ ایک سرکلر وزارتِ صنعت کے اہلکاروں کے نام جاری کیا کہ اگر میرے بُلائے بغیر کوئی صاحب بھی الوداع کہنے یا استقبال کرنے کے لیے آئے تو اُن سے بازپرس کی جائیگی۔

کچھ صحافی بھی تھے انھوں نے کچھ معاملات کے متعلق سوال کیے۔ میں نے ان سے صاف عرض کر دیا کہ میں ہوائی اڈوں یا ریلوے اسٹیشنوں پر بیان نہیں دیتا اور نہ ہی کسی اور ملک میں میں نے اس عجیب رسم کو دیکھا ہے۔ اگر آپ نے کچھ پوچھنا ہے تو مناسب موقعہ پر دریافت کریں۔

پنجاب و سرحد کے پہلے دورے پر میں نے واہ آرڈیننس فیکٹری اور وارسک ڈیم کی جگہ کا معائنہ کیا۔

واہ فیکٹری کا جنرل منیجر ایک انگریز تھا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے کراچی واپس پہنچنے پر وزیراعظم صاحب (جو وزیر دفاع بھی تھے) کو یہ بات بتائی کہ ہمارے اسلحہ سازی کے کارخانے کا کرتا دھرتا انگریز ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ انگریز نے ہمارے ساتھ پاکستان بنتے وقت کیا کیا بے انصافی بلکہ مخالفت نہیں کی جو اب ہمیں اپنے دفاع کے معاملہ میں اس پر کچھ بھی (خواہ کتنا محدود کیوں نہ ہو) انحصار کرنا چاہیے۔ میں نے اپنی رائے کا اظہار کر دیا لیکن معاملہ بہرصورت میرے اختیار میں نہیں تھا۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کیا وجوہات ہیں کہ جب گزشتہ ۲۵ سال میں بھارت نے ٹینک، ٹینک شکن توپیں، بھاری فوجی تازہ ترین اسلحہ، ہوائی جہاز، حتے کہ ایٹمی ہتھیار بھی تیار کر لیے، پاکستان کے لیے ملکی دفاع حرفِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ حالت یہ ہے کہ نالتو پُرزوں کے واسطے بھی ہمیں دُوسروں سے بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ اصحابِ اقتدار کے واسطے گہرے فکر کا مقام ہے۔ ملکی دفاع کے واسطے اپنا اسلحہ آپ بنانے کا اہتمام ہماری قومی ضروریات کے سرفہرست ہونا چاہیے۔

وارسک کو دیکھا کہ بند کہاں ہونا چاہیے اور اس بات پر بھی غور کیا کہ کیا یہ پراونشل سکیم رہنی چاہیے یا مرکزی سکیم قرار دی جائے۔ چنانچہ کراچی پہنچ کر ایک اعلیٰ سطح کے اجلاس میں یہ بتایا گیا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کی سکیم تھی جواب مرکزی حکومت نے مکمل کرنے کا منصوبہ تیار کیا ہے۔ (اس وقت) ساڑھے نو کروڑ روپیہ جو اس پر لاگت آئے گی، وہ مرکزی حکومت پاکستان نے دینی ہے، بند کی جگہ قبائلی علاقہ میں ہے جو مرکزی حکومت کے براہِ راست ماتحت ہے۔ بند کے اُوپر جھیل کا بہت سا حصّہ قبائلی علاقہ میں ہے۔ جو مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے کچھ افغانستان کی حدود میں ہے۔ ملاغوری علاقہ جس کو پانی سے سیراب کیا جائے گا اُس کا ساٹھ ہزار ایکڑ رقبہ مرکزی حکومت سے براہِ راست متعلق ہے پھر بجلی جو پیدا ہوگی صوبہ سرحد میں استعمال نہ ہوگی، کہ وہاں کی ضروریات کے لیے مالاکنڈ پراجیکٹ میں توسیع ہو رہی ہے۔ اجلاس میں فیصلہ ہُوا کہ

کہ ان حقائق کے زیرِ نظر وارسک مرکزی حکومت کی سکیم ہے۔ یکم اپریل سنہ ۱۹۵۰ء سے وہ اس کو اپنے ہاتھ میں لے لے گی۔

اس فیصلہ سے صوبہ سرحد کے چند سیاست دان (جن کے مفادات پر زد پڑتی تھی) بہت جزبز ہوئے۔ لیکن انصاف یہی درست معلوم ہوا۔ چنانچہ اس پر وسیع تر ملکی مفاد کے مطابق عملدرآمد شروع کر دیا گیا۔ اگرچہ سرحد کے بعض سیاست دان میرے اس وجہ سے مخالف ہو گئے کہ وارسک جیسی سونے کی چڑیا کیوں ان کے ہاتھ سے نکل گئی۔

ایسی ایک تجویز چند طالع آزماؤں نے نوشہرہ میں کیمیاوی کھاد کا کارخانہ قائم کرنے کے متعلق وزیراعظم کے پیش کی۔ انھوں نے میرے ساتھ ذکر کیا تو میں نے مخالفت کی۔ فوراً میانوالی کا دورہ کیا اور پنجاب گورنمنٹ پر زور دے کر داؤدخیل میں یہ کارخانہ قائم کرنے کا فیصلہ کرایا۔ انگریز کے زمانے میں جپسم GYPSUM داؤدخیل سے نکلتا تھا لیکن کیمیاوی کھاد کا کارخانہ سندری دریا میں تھا جو ڈھائی ہزار میل دُور تھا۔ میں نے دل سے فیصلہ کیا کہ اس علاقہ سے مزید ناانصافی نہیں ہوگی۔ چنانچہ لڑ بھڑ کر کیمیاوی کھاد کا کارخانہ (FERTILIZER) داؤدخیل میں قائم کروایا۔

میں نے ریلوے کے حکام کو بھی یہ کہہ دیا تھا کہ میری وجہ سے ٹرین کبھی دیر سے نہ چلائی جائے۔ ایک دفعہ میری پھوپھی زاد ہمشیرہ نے بہاول پور شام کو ٹرین پر کھانا پہنچانا تھا۔ سترہ آدمیوں کا کھانا تھا۔ کسی باعث وہ وقت پر نہ پہنچ سکیں۔ اسٹیشن ماسٹر نے بہت زور لگایا کہ تین چار منٹ گاڑی لیٹ ہونے میں کوئی حرج نہیں ہوگا لیکن میں مُصر تھا کہ تیرہ چودہ سو مسافروں کا وقت "وزیر صاحب" کے کھانے کی وجہ سے ضائع نہیں ہونا چاہیے۔ آپ ٹرین چلائیے۔ ہم کھانا ڈائننگ کار وغیرہ سے لے لیں گے۔ چنانچہ گاڑی چلا دی گئی۔ مجھے کافی وقت کے بعد پتہ چلا کہ ساری باتیں پاکستان کی نئی روایات (جو انگریز کی روایات کو بھی مات کرتی نظر آتی تھیں) کے خلاف ہیں اور بعض اُونچے حلقوں میں ناپسند کی جاتی ہیں۔

آسٹریلیا سے واپسی پر سنگا پور کے مسلمانوں کے اصرار پر وہاں ٹھہرا۔ V.C ہال میں ایک مخلوط جلسہ سے خطاب کیا۔ آدھی تقریر انگریزی میں آدھی اُردو میں، کیونکہ حاضرین میں ہندوستانی پاکستانی، عرب، ملیشین، انڈونیشی اور سنگاپوری سبھی قوموں کے لوگ تھے۔ ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر کے بعد جب میں ہال کی سیڑھیوں سے نیچے اُترا تو دو رویہ کھڑے شرکائے جلسہ نے میرے ہاتھ چومے۔ چنانچہ ۱۵ مئی ۱۹۵۰ء کے سٹریٹس ٹائمز (STRAITS TIMES) میں خبر نکلی۔

THEY QUE YOU UP TO KISS 'A HAND "سینکڑوں افراد نے پاکستان کے وزیر صنعت کے ہاتھ چومے۔ جب وہ عالمِ اسلامی پر اور دولت مشترکہ ممالکِ اسلامیہ پر V.C ہال میں تقریر کر کے سیڑھیوں سے اُتر رہے تھے"۔ لیکن جو بات نامہ نگار نہ دیکھ سکا وہ آنسو تھے جن سے میرے ہاتھ تر ہوتے رہے جب لوگ میرے ہاتھ چومتے تھے۔

سُبحان اللہ! کیا عالمی برادری ہے۔ یہ ہاتھ چومنا اور آنسو بہنے کیوں؟ محض اس لیے کہ میں نے محبت اور اخوت کا پیغام دیا۔

'دُنیا میں اس برادری کی مثال نہیں ملتی۔ لیکن افسوس کہ ہم نے اس سے آج تک کما حقہٗ فائدہ نہیں اٹھایا اور اس دولتِ بے بہا کا نہ صرف صحیح استعمال ہی نہیں کر رہے' اس کو ضائع کر رہے ہیں۔ اگر ہم ذرا سی عقل و فراست سے کام لیتے تو اس فطری برادری کے ذریعے دنیا کی بڑی سے بڑی مہم بھی سر کر لیتے۔ لیکن ہمارا تو یہ حال ہے۔ ؎

ہم تو رخصت ہُوئے اوروں نے سنبھالی دُنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دُنیا

فلڈ کمیشن کا قیام

FLOOD COMMISSION

۱۹۵۰ء میں کثرتِ باراں کے باعث پنجاب میں زبردست طغیانی آئی۔ بہت سا جانی و مالی نقصان ہُوا۔ مرکزی حکومت نے دو کروڑ روپے کی امداد فوری طور پر منظور کی۔ ایک فلڈ کمیشن (FLOOD COMMISSION) مقرر ہُوا جس کا چیئرمین مجھے مقرر کیا گیا۔ ہم نے مہینوں کا کام ہفتوں میں ختم کر کے ڈیڑھ ماہ کے اندر اپنی رپورٹ پیش کر دی۔ کمشن میں تمام محکموں کے چیف انجینئر، فوج کے انجینئر اِن چیف، C.O.D. لاہور، سنٹرل انجینئرنگ اتھارٹی کے نمائندے ممبر تھے۔ غرضیکہ اعلیٰ سطح کے ماہرین شامل تھے۔ ہم نے متعدد سفارشات پیش کیں۔ ان میں ایک RAVI SPILLWAY بنانے کی تھی جس میں راوی کا طغیانی کا پانی سما سکے۔ اور طوفان کی شدّت ایک حد تک کم ہو سکے۔

افسوس کہ حکومت نے ہماری سفارشات پر (میرے چلے آنے کے بعد) کوئی توجہ نہ دی۔ ایک روایت یہ ہے کہ چونکہ حکومت مجھ سے ناراض ہو گئی تھی کہ میں نے ملک کے باہر سفیر بن کر جانے سے انکار کیوں کیا اس لیے ہماری رپورٹ پر عمل درآمد نہ کیا گیا۔ ورنہ یقین ہے کہ اس عرصہ میں جو کچھ بھی ہو سکتا تھا اگر وہ کیا جاتا تو پھر پنجاب میں اس شدّت کی طغیانی نہ آتی یا کم ازکم جانی نقصان اتنا زیادہ نہ ہوتا۔ وجہ کچھ بھی ہو، یہ انتہائی افسوسناک بات ہے کہ میرے بعد اس معاملہ کی طرف کما حقہٗ، توجہ نہ دی گئی جس سے ہمیں کئی بار (اور ایک بار تو شدید)

نقصان اٹھانا پڑا۔

اتنا شکر ہے کہ کشن پر فوج کے نمائندگان نے RAVI SPILLWAY کو بطور ایک دفاعی لائن کے بہت اہم قرار دیا اور اس لیے وہ تیار کر دی گئی۔ چنانچہ وہ آج B.R.B کی شکل میں آپ کے سامنے موجود ہے اور خدا کے فضل سے دفاعی اغراض کے واسطے کافی مفید ثابت ہوئی ہے۔

اس کے ساتھ ہی NATIONAL CALAMATIES ACT جس کا بل میں نے تیار کر کے اسمبلی سے پاس کرایا تھا قانون بن گیا جس کے تحت FLOOD RELIEF COMMISSION کا تقرر ہو سکتا ہے۔ یہ تو میرے سامنے ہو گیا۔ لیکن افسوس کہ میرے بعد باقی سفارشات پس پشت ڈال دی گئیں اور اس طرح صوبے کو بے پناہ مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ پاکستان کی ایک بدقسمتی یہ بھی ہے کہ شخصیات کی طرف زیادہ توجہ دی گئی۔ معاملات کی طرف ان کی اہمیت کے مطابق کم ہی غور کیا گیا ہے۔ میری رائے میں جذبہ حب الوطنی کا فقدان اس افتاد کا باعث ہے۔

دورانِ وزارت میرا تیسرا بیرونِ ملک سفر سب سے زیادہ سبق آموز ہے۔

دولتِ مشترکہ کے بعض خام مال پیدا کرنے والے ملکوں کی لندن میں SUPPLY MINISTERS کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ میں نے وزیر اعظم سے کہہ دیا کہ میں نہیں جانا چاہتا کہ بعض دوستوں کو میرا بار بار باہر جانا ناگوار معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ چونکہ وزیر صنعت قواعد کے مطابق سپلائی منسٹر ہے وہ جائے گا۔ چنانچہ مجھے جانا پڑا۔ کیبنٹ کے جس اجلاس میں کانفرنس کے متعلق ہدایات پر بحث ہوئی اس کے بعد مسٹر لیاقت علی خاں نے مجھے مخاطب کیا اور فرمایا "وزیر صنعت صاحب (یاد رہے کہ پاکستان میں برطانوی رسم جاری رکھی گئی۔ وزرا کو عہدوں کے اعتبار سے یاد کیا جاتا تھا۔ ان کے نام سے نہیں) آپ ایک نہایت اہم بین الاقوامی کانفرنس میں پاکستانی وفد کی قیادت کر رہے ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہوگا

کہ جب آپ انگریز سے معاملات طے کر رہے ہوں تو بہت زیادہ شرافت کے اظہار کی ضرورت نہیں۔

DON'T TRY TO BE TOO MUCH OF A GENTLEMAN"

میں تو شروع سے اس رائے کا حامی تھا۔ شکر ہے نوابزادہ صاحب نے بھی یہی روش اختیار کی۔ کمرے سے باہر نکلے تو میرے ساتھی وزرا نے برملا کہا۔ بھائی صاحب! مُبارک ہو' آپ تو پہلے ہی انگریز کے خلاف تھے' اب تو کھُلی چھٹی مل گئی۔

لندن پہنچے۔ کانفرنس کے اغراض و مقاصد سے کما حقہٗ آگاہی ہوئی۔ مطلب یہ تھا کہ خام مال پیدا کرنے والے ملک جو دولتِ مشترکہ برطانیہ کے ممبر ہیں' اس بات کی ضمانت دیں کہ وہ یہ مال سرکاری سطح پر انگلستان کی حکومت کے پاس بھیجیں گے اور سرکار عالیہ انگلشیہ اس کے بدلے ان ملکوں کو مشینری یا فنّی امداد دے گی۔ لیکن مشینری کے متعلق شرط یہ ہے کہ حکومتِ برطانیہ نے پہلے

(۱) بین الاقوامی ذمہ داریاں پُوری کرنی ہیں۔

(۲) ملکی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھنا ہے۔

(۳) تیسری عالمگیر جنگ کے خطرے سے بچنے کے لیے فوجی ضروریات کے واسطے مشینری وغیرہ کا ذخیرہ کرنا ہے۔

اس کے بعد جو مشینری رہ جائے گی' وہ ممبر ملکوں میں جنھوں نے خام مال دیا ہے' میں تقسیم کر دی جائے گی۔

اور خام مال کی قیمت کے متعلق بعد میں بائع اور مُشتری دونوں حکومتوں میں گفت و شنید سے معاملہ طے پائے گا۔

مسٹر پرسی سٹوکس (PERCY STOKS) انگلستان کے سپلائی منسٹر ہماری کانفرنس کے چیئرمین تھے۔ وہ ایران میں مشہورِ عالم وزیر اعظم ڈاکٹر مصدق صاحب کو شکست

دے کر ایک فاتح کی حیثیت سے کرسیِٔ صدارت پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ (DOWNING STREET) میں مسٹر ایٹلی وزیر اعظم انگلستان نے لنچ پر روغنِ قاز ملا اور فضا سازگار بنانے کی کوشش کی۔ لیکن کانفرنس کے متعلق میری رائے میں تبدیلی نہ ہوئی۔

میں جس بات کی تہہ کو پہنچا تھا وہ یہ تھی کہ یہ انگریز کی چال ہے۔ یکطرفہ فائدہ مطلوب ہے۔ ہم تو اپنا خام مال دینے کے معاہدہ کی رُو سے پابند ہو جائیں لیکن ہمارے لیے ان کے CAPITAL GOODS یعنی بھاری مشینری سے کیا بچے گا جو ہمیں ملے گا۔ اگر اُوپر بیان کی گئی تین شقوں کو ترجیح دی گئی؟

چنانچہ دوسرے دن کانفرنس کا باقاعدہ اجلاس شروع ہونے پر جب ساری بات چیئرمین صاحب نے چکنی چپڑی طرز پر پیش کی اور CAPITAL GOODS ملنے کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا تو سب سے پہلے بحث کا آغاز کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "مسٹر چیئرمین! اگر میں معاملہ کو صحیح سمجھا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سے تو حاضر مال وصول کر لیا جائے اور ہمیں صرف موہوم وعدوں پر ٹالا جائے۔ اگر اس کانفرنس کا یہی مقصد ہے (میں نے نہایت بے پروائی اور بے رُخی سے کرسی پر ٹیک لگاتے ہوئے، سر کو پیچھے جھکاتے ہوئے۔ یہ ساری باتیں انگریز سے سیکھی ہوئی تھیں) کہا تو پھر پاکستان کو اس کانفرنس میں مزید کوئی دلچسپی نہیں ہے۔"

میرا اس انداز میں کہنا تھا کہ سٹوکس صاحب نے پھُریری لی اور خالص انگریزی طریقہ سے کھلکھلاتے ہوئے کہا "کیا خیال ہے صاحبان! کافی نہ پی لی جائے۔ پھر بات جاری رکھیں گے؟" کمرہ سے باہر نکلے تو میرے مشیروں میں پاکستانی ہائی کمشنر صاحب بولے "ارے صاحب! یہ آپ نے کیا غضب ڈھایا۔ آپ نے تو بم پھینک دیا۔" میں نے کہا کہ کیا آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ "بم" تھا؟ کہنے لگے۔ اس میں کوئی شبہ ہے؟ میں نے کہا پھر مجھے مبارک باد دیجیے

کر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا۔ میں واقعی "بم" ہی پھینکنا چاہتا تھا۔ میرے بعض سرکاری مشیروں نے بھی ہائی کمشنر صاحب کے ساتھ اتفاق کیا۔ چند ایک نے کہا آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ بہرصورت میں نے اپنے دوستوں کو کہا کہ آپ انگریز کی چال کو سمجھتے ہوئے اسے ہمارے ساتھ مزید گفتگو کے پھندے میں پھنسانا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص آپ کی شہ رگ پر بُری نیت سے ہاتھ ڈالے تو آپ اس سے بات چیت شروع کردیں گے یا ایک گھونسہ اس کے منہ پر رسید کر کے جان بچائیں گے۔

میرے بعض مشیروں کے کچھ مقاصد انگریز کی بات ماننے سے وابستہ تھے۔

آنکہ شیراں را کند روباہ مزاج
احتیاج است احتیاج است احتیاج

مجھے انگریز کی پروا نہ تھی اس لیے برملا بات کہہ دی۔ جب ان حضرات نے اپنا اپنا نقطۂ نظر خوب زور سے پیش کر لیا۔ میں نے انھیں کاغذ کے دو پُرزے دکھائے اور کہا یہ پُرزہ مجھے آسٹریلیا کی انگریزی نسل کے وفد کے قائد نے میرے "بم" پھینکنے کے بعد آہستہ سے میز کے نیچے سے دیا تھا اس پر لکھا تھا آپ نے بہت اچھا کیا WELDONE PAKISTAN

دوسرا پُرزہ نیوزی لینڈ کے وزیر نے دیا تھا "ہم آپ کے ساتھ ہیں"۔

سیلون کے وزیر نے میرا پاؤں زور سے دبا کر اشارہ کیا کہ بہت صحیح رویہ اختیار کیا ہے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ البتہ بھارت اور کینیڈا پُورے طور پر انگریز کے ساتھ تھے۔ بھارت انگریز کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا تھا اس واسطے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا تھا۔

ہوٹل پہنچنے پر میرے مشیروں نے کہا چونکہ ہماری رائے میں اختلاف پایا جاتا ہے ان کی رائے تھی کہ کانفرنس جاری رہنی چاہیے اور کوئی معاہدہ ہونا چاہیے، اس واسطے کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ آپ گورنمنٹ آف پاکستان کے سامنے سارا معاملہ پیش کر کے ان کی رائے حاصل کرلیں میں نے کہا مناسب۔

چنانچہ میں نے مسٹر لیاقت علی خاں صاحب کو لندن سے ٹیلی فون کیا۔ یہ میری مرحوم سے آخری گفتگو تھی۔ تاریخ شاید ۲۰ر ۳۰ر اکتوبر ۱۹۵۱ء تھی۔ انھوں نے ساری بات اپنے اسسٹنٹ سیکرٹری مسٹر حکیم الدین سے لکھوائی۔ پھر دُہرائی جب تصدیق کر لی تو کہا میں ابھی کیبنٹ (CABINET) میٹنگ بلا کر فیصلہ کرتا ہوں جس کی اطلاع آپ کو فلاں وزیر صاحب کل صبح ۹ بجے دیں گے۔

دوسرے دن اطلاع ملی معاملہ بالکل آپ کے اختیار میں ہے۔ جو فیصلہ آپ کریں وہی ہمیں منظور ہے۔ لیکن کانفرنس چھوڑنے کا کوئی ڈپلومیٹک طریقہ اختیار کریں تو بہتر ہوگا۔

دوسرے دن کانفرنس میں حکومت برطانیہ کی جانب سے سر ہارٹلے شاکراس SIR HARTLY SHOUCRASS اٹارنی جنرل (جو بعد میں لارڈ شاکراس ہو گئے) شریک ہوئے۔ انگریز کے زمانہ میں سر ہارٹلے شاکراس کا نام سنتے ہی دل پر رُعب سا طاری ہوتا تھا۔ لیکن اب ایک خادمِ پاکستان کی حیثیت سے وہ مجھے اپنے جیسے ہی آدمی نظر آئے۔ یہ محض اللہ کا فضل ہے۔

اس نکتہ کے بیان کرنے کی ضرورت اس واسطے پیش آئی کہ میں بہ اصرار یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اللہ کے نام پر حاصل کیے ہوئے پاکستان کے مفاد کے واسطے اگر آپ کام کر رہے ہیں تو اللہ کی برکتیں اور رحمتیں آپ پر نازل ہوتی ہیں۔ مشکلیں آسان ہوتی چلی جاتی ہیں اور آپ کسی کی شخصیت سے نہ مرعوب ہوتے ہیں، نہ آپ اسے خاطر میں لاتے ہیں۔ آپ کی خفتہ صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔

خیر میں نے اجلاس میں کہا کہ میں سوچتا رہا ہوں کہ کوئی سبیل کانفرنس کا کام آگے بڑھانے کی نکل آئے۔ چنانچہ میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ جس وقت CAPITAL GOODS یا بھاری مشینری دینے کا وقت آئے، اس وقت HIS MAJESTY'S GOVERNMENT یعنی ہز مجسٹی گورنمنٹ، ضرورت PRIORITIES کا خود فیصلہ

کرے مثلاً اگر پاکستان اور سیلون دونوں سیمنٹ فیکٹری انگلستان سے مانگتے ہیں اور مشینری صرف ایک فیکٹری کی ہو تو یہ حکومت برطانیہ کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ خود فیصلہ کرے کہ کس کی ضرورت زیادہ ہے۔ اس کو جو ایک فیکٹری مل سکتی ہے' دے دی جائے۔ ظاہر ہے کہ اس تجویز سے حکومتِ برطانیہ پر بڑی بھاری ذمہ داری پڑتی تھی جس کو قبول کرنے میں ان کو تامل تھا۔

سر ہارٹلے شاکراس نے میرے اصل مطلب کو بھانپ لیا اور خالص انگریزی طریقہ سے (بالکل مصنوعی طور پر) کھانستے ہوئے اور فرضی طور پر گلا صاف کرتے ہوئے کہا: "تجویز نہایت معقول معلوم ہوتی ہے۔ بہتر ہوگا کہ آفیشل سطح پر اس کی تفاصیل پر غور ہو جائے۔ چنانچہ معاملہ آفیسروں کی کمیٹی کے سپرد کر دیا گیا اور دوسرے دن حکومتی اعلان کے مطابق:

SUPPLY MINISTERS OF COMMONWEALTH STATES ARE RETURNING TO THEIR COUNTRIES

سپلائی منسٹر صاحبان اپنے اپنے ملکوں کو واپس جا رہے ہیں۔

کانفرنس ختم ہوئی۔ انگریزی نقطۂ نگاہ سے ناکام اور ہمارے (پاکستانی نقطۂ نگاہ سے خدا کے فضل سے ہم سو فیصدی کامیاب رہے۔

سپلائی منسٹرز کانفرنس

منعقدہ لندن میں شمولیت

دوران قیام لندن کئی سرکاری دعوتوں کے جواب میں ہم نے بھی دعوت دینی تھی۔ ہمارے ہائی کمشنر صاحب نے اس کا انتظام کرنا تھا۔ میں نے کہہ دیا اس دعوت میں شراب نہیں دی جائے گی۔ انھوں نے کہا اس کے بغیر دعوت پھیکی رہے گی۔ میں نے کہا اگر "لادین" ملک بھارت شراب کے بغیر دعوتیں دیتا ہے تو پاکستان جیسے اسلامی ملک کے واسطے شراب دینی کیسے جائز ہے؟ پھر میں خود آج سے تین سال پہلے شراب کے خلاف وفد لے کر وزیراعظم کے پاس اسی لندن میں گیا۔ اب وزیر ہو گیا ہوں تو کیا میرے خیالات بدل جائیں گے؟ میں نے صاف کہہ دیا کہ میں اپنی دعوت میں شراب ہرگز نہیں آنے دوں گا۔ آخر یہ فیصلہ ہُوا کہ دو سو مہمانوں کی بجائے چالیس کو لنچ پر بُلا لیا جائے۔ تاکہ شراب کا دور نہ چلے۔ چنانچہ ایسا ہی ہُوا۔ میں نے اپنی دعوت میں اُم الخبائث کو نہیں آنے دیا۔

منٹگمری میں بھی جب انگریز گورنر، چیف جسٹس، جج صاحبان یا دیگر معزز انگریز افسران کو کھانے پر بُلاتا تو کبھی شراب نہیں پلائی جاتی تھی۔

اسی دوران نوجوانوں سے خطاب کیا جو ولایت میں زیر تعلیم تھے۔ ان کو یقین دلایا کہ پاکستان کی اقتصادی پالیسی کسی غیر ملک کی اقتصادی پالیسی کے تابع نہیں ہونے دی جائے گی اور ہم اپنے ملک میں غیر ملکی ماہرین کی بجائے اپنے آدمیوں سے کام لیں گے۔ بھاڑے کے ٹٹوؤں پر مجھے اعتبار نہیں ہے۔ پاکستانی بہر حال پاکستانی ہو گا غیر ملکی سے تو زیادہ خدمت پاکستان کی کرے گا

اور دل سے کرے گا۔

لیکن امورِ خارجہ میں ہم اکثر دوسری قوموں سے مار کھا جانے کے عادی ہیں۔ ایک تو خادمانِ پاکستان کی کمی ہے (پاکستان کا خادم وہی ہو سکتا ہے جو اللہ کا بندہ ہو اور جسے رسولِ پاک سے عشق ہو اور ان کی راہ پر چلنے کو وہ اپنے لیے سعادت سمجھتا ہو) ہماری فارن سروس میں یہ جنسِ گرامی نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔

جہاں فارن آفس میں داخل ہونے والے نوجوانوں کو اس بات کی خاص تعلیم دی جاتی ہے کہ فلاں شراب فلاں وقت پلائی جاتی ہے، ایسے گلاس یا کنسٹر میں پلائی جاتی ہے، اس کی مقدار اتنی ہونی چاہیے تو آپ کیا توقع رکھ سکتے ہیں کہ ایسے نوجوان سفارت یا اس قسم کے عہدوں پر فائز ہو کر "پاکستان" کی کیا خدمت کر سکیں گے۔

یہی حال میں نے "نوکر شاہی" طبقہ کا دیکھا ابھی تک وہ گھروں کو مزین کرنے کی جستجو میں ایر کنڈیشنز، ریفریجریٹر، ٹیپ ریکارڈر یا ریکارڈ وغیرہ اشیا کی فراہمی میں مصروف ہیں۔ فارن آفس کے ایک صاحب نے (جو بعد میں پاکستان کے وزیرِ خارجہ بھی بن گئے تھے) خود مجھے کہا تھا کہ فارن سروس پر جو روپیہ خرچ ہوتا ہے، اس میں سے ۳/۴ محض ضائع ہو جاتا ہے۔

GOES DOWN THE DRAIN

یہی سفارت خانے ہمارے وفود کی رہنمائی کرتے ہیں اور ان کو اطلاعات دیتے ہیں۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیجیے کہ کیا اس طرح پاکستان کا نام روشن ہو سکتا ہے؟

چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

لندن کانفرنس میں میرے مشیرِ اعلیٰ اس وقت پاکستان کے ہائی کمشنر تھے (انھوں نے انتہائی کوشش کی کہ ان کے ذاتی مفادات کو نقصان نہ پہنچے اور میں انگریز کی بات مان جاؤں۔ لیکن میں نے صاف انکار کر دیا اور خدا کے فضل سے لندن سے کامیاب و بامراد واپس آیا۔

کانفرنس کے دوران میرے رویے کو متاثر کرنے کے واسطے جو حربے انگریز نے استعمال کیے

اُن کا ذکر بات کو بہت طویل کر دے گا۔ مختصر یہ کہ ہمارے جو وفود باہر جاتے ہیں (ابھی تک) وہ سفید چمڑی والے کی ریشہ دوانیوں کا مقابلہ کامیابی سے نہیں کر سکتے اور اکثر ان کی عیاریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بین الاقوامی سطح پر پاکستان کا وقار نہ ہونے کے برابر ہے۔ برعکس اس کے بھارت کو باہر کی دنیا والے زیادہ جانتے ہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو باہر جا کر بھی (خالص) ہندو رہتا ہے اور مسلمان باہر جا کر یہ کوشش کرتا ہے کہ میں دوسروں کی کاربن کاپی بن کر ان سے سندِ قبولیت حاصل کروں۔ اس کا اپنا مقام کوئی نہیں ہوتا۔ وہ دوسروں کی نقالی کر کے اور ان کو راضی کر کے دوسروں کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتا ہے۔" ابن الوقت" بن کر رہتا ہے۔

(یاد آیا ہو گا" آپ کو مولوی تمیز الدین خاں مرحوم کا ریمارک۔ اُدھر اُن کے ڈرپر چودھری صاحب، آپ کی تقریر کی سکاٹش اٹارنی جنرل بڑی تعریف کر رہے تھے لیکن اس بات کی احتیاط رہے کہ ہندو کے خلاف کہنے سے انگریز خوش نہیں ہوتا) میں نے اس وقت بھی لاحول ولا قوۃ پڑھ کر اس ریمارک کو ٹال دیا تھا اور اب بھی اس ذہنیت پر جو آج تک پاکستان میں کم و بیش قائم ہے۔ پھر ایک دفعہ پورے زور سے لاحول ولا قوۃ پڑھتا ہوں اور دُعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالےٰ اب بھی پاکستان کو سچے مسلمانوں کی خدمت سے نوازے۔ اس کے وزیر، سفیر، افسر، کارندے، باشندے محض اللہ تعالیٰ، اس کے رسولِ پاک کے نام پر حاصل کیے گئے پاکستان کی اسی جذبہ سے خدمت کر سکیں، جس جذبہ نے پاکستان کو جنم دیا تھا۔ آمین ؂

لیاقت علی خان کی شہادت

لندن سے واپس آرہا تھا۔ ۱۶۔ اکتوبر ۱۹۵۱ء ہم روم کے ہوائی اڈے پر جہاز چلنے کا انتظار کر رہے تھے کہ میرے پرائیویٹ سیکرٹری نہایت سراسیگی کی حالت میں آئے اور رُکتے رُکتے بتایا کہ ابھی ابھی بھارتی سفارت خانہ کی طرف سے اطلاع آئی ہے کہ نوابزادہ لیاقت علی خاں وزیراعظم پاکستان کو کسی شخص نے گولی مار کر شہید کر دیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔
پردیس میں اچانک یہ خبر سُن کر جو اثر میرے دل پر ہُوا اس کا اندازہ ہر پاکستانی لگا سکتا ہے۔ کچھ وقت کے لیے تو گویا دماغ کی سوچ معطل ہو گئی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ حادثہ کس طرح رُونما ہو سکتا ہے اور وہ کون بدبخت ہے جس نے یہ فعل کیا ہے۔ تفصیلات کا پتہ نہ تھا لیکن آج تک یہ پتہ نہ چل سکا کہ ہُوا کیا؛ یہ کسی ایک آدمی کا کام تھا یا سازش تھی، اور اگر سازش تھی تو صرف ملکی تھی یا غیر ملکی شمولیت بھی تھی۔ جتنے مُنھ اتنی باتیں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ مسٹر لیاقت علی خاں کو ایک گھناؤنے منصوبے کے تحت بعض طالع آزماؤں نے اپنا راستہ صاف کرنے کے لیے شہید کروایا ہے اور اپنے جرم پر اس طرح پردہ پوشی کی ہے کہ آج تک اصل قاتل کا پتہ نہیں چل سکا۔

میری یہ بھی رائے ہے کہ ہمارے قومی مصائب کا آغاز اس گناہِ کبیرہ کے ارتکاب سے شروع ہوتا ہے۔

لیاقت علی خاں مرحوم نے ملک کو سنبھالا دیا تھا اور وہ قائداعظم کے بعد نیک نیتی

اور تندہی سے ملک کی خدمت کر رہے تھے۔ ۱۶/ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو وہ کچھ اہم باتیں کہنے والے تھے اور جہاں تک میرا تاثر ہے وہ ایک آزاد پالیسی اختیار کرنے والے تھے۔ گو اُن پر کئی اعتراض ہوتے رہے (اور وہ کون سربراہِ مملکت ہے جس پر کوئی اعتراض نہ ہُوا ہو) تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ عام طور پر ملک کی حالت ان کی قیادت میں اچھی رہی۔ انھوں نے قراردادِ مقاصد پاس کرا کے (میں اس بارہ رکنی OBJECTIONS RESOLUTION کمیٹی کا ممبر تھا۔ میں نے قریباً ایک پوری رات اس پر بحث کر کے اسے پاس کرایا تھا) یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ پاکستان کو ایک اسلامی فلاحی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ یہ کہنا اس وقت مشکل ہے کہ وہ کہاں تک اسلام کو ریاست میں داخل کرتے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ وہ اتنے معاملہ فہم ضرور تھے کہ رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے اسلام کا زیادہ سے زیادہ رنگ معاملاتِ ریاست میں بھرتے۔

قراردادِ مقاصد کی بحث کوئی چھ گھنٹے جاری رہی۔ مختلف خیالات کا اظہار کیا گیا۔ دو خیال متحارب و متضاد تھے ایک یہ کہ اسلام میں REGIMENTATION ہے یعنی نری پابندیوں کی زندگی ہے اور مذہب کی بنیاد پر آجکل سیاست قائم کرنی اس ترقی پذیر دنیا میں جگ ہنسائی کا باعث ہوگی۔ دوسرا خیال (جس کے شدید حامی جناب عمر حیات ملک اور یہ خاکسار تھے) یہ تھا کہ پاکستان بناتے وقت جو وعدے کیے گئے تھے وہ کما حقہٗ پُورے کرنے چاہئیں۔ پاکستان کا مطلب کیا "لا الٰہ الا اللہ" کا عملی نمونہ ریاست کو پیش کرنا چاہیے۔ نہ صرف اسلامی آئین و قوانین یہاں جاری ہوں بلکہ معاشرہ بھی خالص اسلامی ہو کہ دنیا میں صرف "اسلامک سوسائٹی" بہترین اور مثالی معاشرہ کا نمونہ پیش کر سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ یہ خاص ترکیب کی ریاست اس وقت مستحکم ہو سکتی ہے جب اس کی بنیاد منضبط اور استوار ہو۔

باقی رہی جگ ہنسائی کی بات تو اس کے متعلق چونکہ وقت بھی کافی ہو چکا تھا اور بحث بھی سیر حاصل ہو چکی تھی، اس لیے اپنا مافی الضمیر ظاہر کرنے کے واسطے حضرت اکبرؒ

کے اشعار پیش کر دیے کہ تفریح طبع بھی ہو جائے اور میری رائے کا ملخص بھی پیش ہو جائے۔

یہ پوچھا دورِ گردوں نے کہ کیا تو بھی مسلماں ہے
میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا راز پنہاں ہے
اگر اقرار کرتا ہوں تو بے مہری کرے شاید
اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ
ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

بہر صورت مسٹر لیاقت علی خاں کے فوراً بعد جو صاحبان اقتدار کی گدی پر بیٹھے ان میں سے کسی کو خدا نے اتنی توفیق نہ دی کہ وہ اپنی اسلام دوستی کے باوجود ملک میں اسلامی معاشی و اقتصادی نظام رائج کرا سکتے یا ہمیں ایسے سربراہ ملے جن کو اسلام سے دلی لگاؤ نہ تھا۔

میری رائے میں مسٹر لیاقت علی خاں ایک سچے محبِ وطن، بے لالچ، قابل اور گہری سوچ بچار کے مالک تھے۔ انھوں نے قائد اعظم کے بعد جس طرح اس نوزائیدہ مملکت کو سنبھالا، وہ انہی کا حصہ تھا۔ وہ شہید ہیں اور صحیح طور پر شہیدِ ملت ہیں ظاہر ہے کہ شہادت کا بہت بڑا بلند درجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا درجہ اور بھی ارفع و اعلیٰ کرے۔

میرے ساتھ مسٹر لیاقت علی خاں کے تعلقات بہت مخلصانہ تھے۔ وہ گرم جوشی کے قائل نہ تھے بہت دیمے تھے (ہم انھیں SPENDER کہا کرتے تھے) وہ مبالغہ آمیزی پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ کم گو تھے مگر راست باز۔

ان کی شہادت سے کوئی تین ماہ قبل میرے خلاف مختلف وجوہات کی بنا پر (جس میں وزارتی اور دفتری سازش تھی) اخبارات میں ایک بہت بڑا اُدھم مچایا گیا۔ ایک اخبار تو خاص میری مخالفت کے واسطے جاری کیا گیا۔ باقی اخباروں میں خوب روپیہ تقسیم کیا گیا اور کچھ اس قسم کا پروپیگنڈا شروع ہوا "سنا یہ حضرت وزارتِ صنعت میں کیا کر رہے ہیں؟" بات لمبی ہے

آئندہ تفصیل سے بتائیں گے۔" "اڑتی چڑیا یہ خبر لائی ہے کہ وزیرِ صنعت کو اپنے کیے کی سزا بھگتنی پڑے گی۔" "وزیرِ صنعت نے جو کچھ کیا ہے اس کا کچا چٹھا جلدی آپ کے پیش کیا جائے گا۔"
"لیجیے صاحب وہ راز طشت از بام ہو گیا۔ وزیرِ صنعت کا لڑکا فلاں صنعتی فرم میں ملازم ہے۔" (وہ میری وزارت سے تین سال پہلے ساڑھے تین سو روپے پر ملازم ہو چکا تھا) لیجیے صاحب ہم نہ کہتے تھے کہ گھپلا ہو رہا ہے۔" "وزیرِ صنعت کے لڑکے کو باہر ٹریننگ کے لیے بھیجا جا رہا ہے" (اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی بیسیوں کارکن اس فرم نے ٹریننگ کے لیے بھیجے تھے۔ عام اداروں کی طرح یہ ان کا بھی دستور تھا)

یہ سب کچھ اس واسطے ہوا کہ میں نے ایک خاص شہرت کے مالک صنعت کار کا ناجائز مطالبہ تسلیم نہ کیا۔ وزارت کے ایک بڑے افسر کی (وزیرِ اعظم کی صلاح کے ساتھ) تنزلی کی۔ خود وزارتی حلقوں میں میری محنت سرگرمیوں کی وجہ سے ایک درجہ حسد کا اظہار ہونا شروع ہو چکا تھا اور چند اور صاحبان بھی اس سکیم میں ملوث تھے جن کا بیان یہاں ضروری نہیں۔ مذیادہ تر ادھم تو اس صنعت کار اور معتوب افسر نے مچایا۔ باقی عناصر نے ان کو ہوا دی اور پھر پیسہ بھی خوب چلا۔ یہ سب باتیں ہوئیں اور کسی حد تک کامیاب ہوئیں۔

مختصر یہ کہ بغیر کوئی خاص وجہ بتائے مبہم الزامات کی بھرمار شروع ہو گئی اور تاثر یہ دیا گیا کہ وزیرِ صنعت نہایت بد دیانت اور رشوت خور ہے۔

مسٹر لیاقت علی خاں کو میرے مخالفین براہ راست بھی آگاہ کرتے رہتے تھے۔ میں نے بھی ذکر کیا (یہ تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں ان کا منظورِ نظر تھا۔ لیکن وہ میرے کام، کردار اور دیانت داری سے پوری طرح مطمئن تھے) فرمانے لگے:

"مجھے سب کچھ پتہ ہے۔ کتے بھونکتے ہیں۔ آپ ان کی پروا نہ کریں۔ مناسب وقت پر میں اس کے متعلق اگر کچھ کہنے کی ضرورت پڑی تو خود کہوں گا۔" میں نے وزیرِ اعظم کے فرمان کے مطابق اس معاملہ کا کوئی نوٹس نہ لیا۔ میرے کئی احباب نے مشورہ دیا کہ مجھے

پریس پر و پیگنڈا کا جواب دینا چاہیے اور حقیقتِ حال بتانا چاہیے لیکن میں نے سختی سے یہ روش اختیار کی کہ چونکہ وزیر اعظم نے خود فرمایا ہے کہ میں کوئی جواب نہ دوں، اس لیے میری طرف سے کسی اور جواب آنے کی صورت میں وہ ضرور محسوس کریں گے کہ میں نے ان پر اعتبار نہیں کیا۔ لہٰذا میرے سارے احباب اس معاملہ میں خاموش رہے۔

ملک کے چند اخبار میری کھلم کھلا اسلام دوستی کی وجہ سے مجھ پر چوٹ کرنے سے نہ چوکتے تھے۔ (اب بھی اسلام پسند عناصر کے متعلق ان کی یہی روش ہے اور رہے گی کیونکہ وہ اپنے غیر ملکی مُربیوں کے زیرِ اثر ہیں) میں ستمبر کے اواخر میں ملک سے باہر چلا گیا تھا۔ سپلائی منسٹرز کانفرنس (لندن) کے بعد چند دن کی چھٹی لی ہوئی تھی، اس لیے پاکستان میں میرے مخالفین کے واسطے میدان صاف تھا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ دے سکتا تھا۔ وزیر اعظم صاحب نے ابھی تردید ضروری نہ سمجھی (تردید وہ کس بات کی کرتے۔ کوئی ٹھوس یا کم از کم واضح الزام تو لگایا نہ گیا تھا۔ بس یہ ہوگیا، وہ ہوگیا کی ہاؤ ہو تھی۔ اس کا جواب کوئی وزیر اعظم کیوں اور کیا دے گا۔)

لیکن میری عدم موجودگی، احباب کو میرا خاموش کرا دینا اور وزیر اعظم نے ابھی جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ پریس کی طاقت کو آپ جانتے ہیں۔ خصوصاً اس کے پیچھے جب سرمایہ، سازش اور اقتدار کا ہاتھ ہو۔ مختصر یہ کہ تاثر یہ دیا گیا کہ نذیر احمد وزیرِ صنعت پاکستان سب سے زیادہ بددیانت، رشوت خور، بے ایمان ہے۔

ایک تو میں ملک سے باہر تھا اس لیے سب خبریں مجھ تک نہ پہنچتی تھیں۔ دوسرے اگر میں پاکستان میں موجود بھی ہوتا تو چونکہ معاملہ وزیر اعظم صاحب نے خود ہاتھوں میں لیا ہوا تھا، میں نے کچھ نہ کرنا تھا۔ اُدھر اخباری، دفتری اور خود وزارتی حلقوں کی سازش نے ایسا تاثر پیدا کیا کہ اکثر لوگ اس (بے بنیاد مگر مسلسل) پروپاگنڈا سے چہ میگوئی کی حالت میں پڑ گئے۔ مجھے کراچی واپس پہنچنے پر (۱۰ اکتوبر ۱۹۵۱ء) لاہور کا ایک انگریزی اخبار دکھایا گیا جس میں لکھا تھا

کہ وزیرِ اعظم نے نذیر احمد وزیرِ صنعت کی بدعنوانیوں کی تحقیقات کا حکم دے دیا ہے۔ وزارتِ صنعت کے ایک افسر اس کام کو شروع کرنے والے ہیں۔ یہ خبر ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو شائع ہوئی اور سراسر بے بنیاد اور جھوٹی تھی۔

میرے محترم دوست (اب) پاکستان کی معتبر (معروف ہستی) کراچی کے مسٹر حاتم علوی اس بات کے راوی ہیں کہ وہ راولپنڈی کے ہوائی اڈے پر ۱۶؍ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو موجود تھے کہ کسی اخباری نامہ نگار نے اس تحقیقات کی خبر پر وزیرِ اعظم صاحب کی پنڈی میں آمد پر تبصرہ کرنے کو کہا۔

حاتم علوی صاحب کا بیان ہے کہ وزیرِ اعظم صاحب کا منہ غصے سے سُرخ ہو گیا اور انھوں نے جھڑک کر کہا۔ کیسی تحقیقات؟ آپ لوگ کیوں اس طرح بے پر کی اڑا رہے ہیں؟

میرا خیال ہے کہ یہ ریمارکس کسی اخبار میں چھپے بھی تھے لیکن یقیناً حاتم علوی صاحب کی روایت سے ہی کہہ سکتا ہوں۔

دورانِ قیام کراچی خواجہ ناظم الدین صاحب گورنر جنرل سے میرے کچھ اختلافات رُونما ہو چکے تھے۔ ایک تو تیل کی تلاش کے معاملہ میں۔ دوسرے اس وقت جب میں FLOOD COMMISSION کا کام ختم کر کے کراچی پہنچا تو گورنر جنرل صاحب کو کسی کام کے لیے ملنے گیا۔ فرمانے لگے "مشرقی پاکستان والوں کو آپ لوگوں سے بڑی شکایت رہتی ہے"۔ میں نے فوراً کہا: "آپ صرف مشرقی پاکستان کے گورنر جنرل ہیں یا سارے پاکستان کے۔ پنجاب میں طغیانی نے تباہ کاری مچا دی ہے میں فلڈ کمیشن کی کارروائی مکمل کر کے آیا ہوں آپ نے ایک لفظ پنجاب کے متعلق نہیں پوچھا"۔

ایک دفعہ میں نے وزیرِ اعظم صاحب کو لکھ کر دیا تھا کہ گورنر جنرل صاحب کو میرے کام میں دخل دینے کا کوئی اختیار نہیں ان کو یہ بات بتا دیجیے۔ (انھوں نے مجھے خود کہا کہ انھوں نے ایسا کر دیا تھا)

خواجہ صاحب بڑے اسلام دوست بزرگ تھے۔ لیکن حکومت کا تجربہ کم ہی رکھتے تھے۔ کانوں

کے کچھ اور بعض اثرات کے تابع تھے۔ مجھے گمان ہے کہ برٹش ہائی کمشنر سر گلبرٹ لیتھ ویٹ کو لندن کانفرنس کی ناکامی کی خبر مل چکی تھی اور وہ مجھ سے لندن جانے سے پہلے برطانوی کمپنی کو تیل کا لائسنس دینے کے سلسلے میں ناکام گفتگو کر چکے تھے۔ ان کی بھی خواجہ صاحب تک بڑی رسائی تھی۔ وہ بھی میرے خلاف پروپاگنڈا میں دلچسپی لیتے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جب خواجہ ناظم الدین صاحب شہید ملت کے انتقال پر وزیر اعظم بنے اور مسٹر غلام محمد گورنر جنرل بنے (جو میرے اسلام، اسلام کی رٹ اور سینہ زوری سے کچھ بیزار سے تھے) تو پہلی کابینہ بناتے وقت مجھے خواجہ ناظم الدین صاحب مرحوم نے نیویارک میں سیکورٹی کونسل کا پاکستانی ممبر بننے کی پیش کش کی یا آسٹریلیا میں سفیر (یعنی ہائی کمشنر بننے کو کہا)

جب میں نے پوچھا کہ مجھے وزارت میں کیوں نہیں لیا جا رہا تو انھوں نے فرمایا کہ پاکستان کے واسطے بہتر ہوگا کہ آپ بیرونِ ملک اس کی اعلیٰ سطح پر خدمت کریں۔

میں نے کہا میری خطا بیان کی جائے۔ انھوں نے فرمایا کوئی خاص شکایت نہیں ہے۔ ایسے ردّ و بدل پہلے بھی ہوتے ہیں۔ مسٹر جنید ریگر (مرحوم) اور راجہ غضنفر علی (مرحوم) وزارت سے سفارت پر بھیجے گئے۔

میں نے عرض کی اگر میں پاکستان میں رہ کر گیارہ آدمی کی ٹیم میں پاکستان کی صحیح خدمت نہیں کر سکتا تو اکیلے کو باہر پاکستان کا واحد نمائندہ بھیجنا کوئی مناسب بات نہیں معلوم ہوتی۔ دوسرے میں ملک بدر ہونے کو تیار نہیں ہوں۔ میں یہاں رہ کر کام کروں گا اور جس طرح بن پڑا ملک کی خدمت کروں گا۔ یہ کہہ کر میں تو واپس چلا آیا۔ اس کے بعد نئے گورنر جنرل صاحب مسٹر غلام محمد اور نئے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین صاحب مرحوم نے پھر یاد فرمایا اور کہا کہ میرے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔ صرف یہ کہ ہماری رائے میں آپ باہر جا کر پاکستان کی زیادہ خدمت کر سکتے ہیں۔ میں اس شعر کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ جب میں اپنے انکار پر مُصر رہا تو اس پر خواجہ صاحب مرحوم کی منطق مجھے قائل کرنے کے لیے قابلِ غور ہے۔

پہلے تو انھوں نے فرمایا کہ سال بھر کے اندر مجھے سندھ کا گورنر مقرر کر دیا جائے گا۔
دوسری بات جو انھوں نے فرمائی یہ تھی "چودھری صاحب تین ہزار آپ کی تنخواہ، تین ہزار ضیافتی الاؤنس جس کا کوئی حساب نہیں مسٹر پرسی سپنڈر PERCY SPENDER (وزیر خارجہ آسٹریلیا) کا سجا سجایا مکان CADELLAC CAR آپ کی سواری کے لیے۔ دو نوکر مفت، پھر سال میں ایک دفعہ بیوی بچوں کے ساتھ رخصت پر پاکستان آ جا سکتے ہیں۔ یہ کوئی دس ہزار روپے بنتے ہیں" اور لطف یہ ہے کہ کام کوئی نہیں ہے"۔
میں نے یہ سنتے ہی عرض کیا کہ اگر کام کوئی نہیں تو میں تنخواہ کس بات کی لوں گا؟ میں تو ساری عمر کام کرتا رہا ہوں۔ اب بھی بطور وزیر کے اپنے جوتے آپ صاف کرتا ہوں۔ اگر کوئی کام نہیں تو میرا صاف جواب ہے۔ یہاں ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ کوئی خواجہ صاحب مرحوم کی قسم کے ملاقاتی ابراہیم لنکن صدر امریکہ سے ملنے گئے۔ وہ اس وقت اپنے جوتے صاف کر رہے تھے۔ ملاقاتی نے جھجک سے کہا "مسٹر پریذیڈنٹ آپ اپنے جوتے صاف کرتے ہیں؟ مسٹر لنکن نے کہا جی ہاں آپ کس کے جوتے صاف کرتے ہیں؟
میں یہ کہہ کر رخصت ہوا تو میرے چند زیادہ جہاں دیدہ عزیزوں نے مشورہ دیا کہ اس طرح دو ٹوک جواب دینا مناسب نہیں۔ آپ یہ کہیں کہ جس وقت سرکاری طور پر OFFER آئے گی میں آپ کے ارشادات کو فیصلہ کرتے وقت ضرور ملحوظ رکھوں گا۔ یہ کہہ کر میں اپنی وزارتی زندگی کا باب ختم کر کے گھر واپس آیا۔
اب واپسی کا کرایہ اور لاہور میں پہنچ کر اخراجات کا بندوبست ضروری تھا۔ اس کے واسطے میرے پاس پیسے نہ تھے، کچھ قرض اپنے ایک دوست سے اور دو ہزار روپے عاریتاً اپنے بڑے بھائی صاحب سے لیے۔ ایک ایک پیسے کی ضرورت تھی۔ رائفل بیچی، ٹائپ رائٹر بیچا۔ محمد علی ہاؤسنگ سوسائٹی ڈرگ روڈ پر قریباً ۴ کنال اراضی سوسائٹی والوں نے بہ اصرار میرے نام الاٹ کی تھی، ۵۰۰ روپیہ پیشگی لیا تھا۔ میں نے کہا مجھے زمین کی ضرورت نہیں، پیسے

واپس کیجیے۔ انھوں نے کہا ضابطہ کے مطابق ۱۰۰ روپے وضع کریں گے، ۴۵۰ روپے واپس کریں گے۔ میں نے کہا مجھے منظور ہے (آج اس بہترین قطعۂ اراضی کی قیمت کئی لاکھ روپے ہے) لیکن حاشا وکلاّ جو مجھے اس بات کا افسوس ہو کہ اتنی قیمتی جائداد کیوں ہاتھ سے کھوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ سب سے بڑی نعمت یہ ہے کہ اطمینانِ قلب نصیب ہے اور غیر اللہ کے سامنے دامن بچھانے کا موقع نہیں آیا (اور نہ ہی اللہ کرے آئے)

سٹیشن پر الوداع کہنے والوں میں علاوہ بے شمار اور احباب کے مسلمان سفیر نمایاں طور پر موجود تھے جنھوں نے بڑی محبت اور افسوس کے ملے جلے جذبات سے رخصت کیا۔ یہ اکتوبر ۱۹۵۱ء کے اخیر کا واقعہ ہے۔

کراچی میں وزارت کا زمانہ ختم ہوا۔ گاڑی اسٹیشن کے آخری سگنل سے نکل ہو گی کہ میں نے کراچی کے قیام کو یک قلم دل سے محو کر دیا۔ گویا کتابِ زندگی کا ایک ورق اُلٹ دیا۔ اب پھر اپنے محبوب شغل وکالت کا تیسرا دور شروع ہو گا۔ مجھ سے جو سلوک ہوا اُس کا نہ گلہ ہے نہ شکایت۔ بعد میں نکتہ کھُلا کہ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔

میں لاہور پہنچ کر سوچتا رہا کہ آخر میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں روا رکھا گیا۔ ہاتف نے ندا دی کہ یہ تمھیں تمھارے غرور کی سزا ملی ہے۔

میں نے دورانِ قیامِ کراچی کسی سے کوئی تحفہ قبول نہ کیا، کسی غرض مند کی دعوت قبول نہ کی، کسی سیاسی جوڑ توڑ میں شامل نہ ہوا۔ بلکہ کبھی اس شغل میں دلچسپی ہی نہ لی۔ سیٹھ ڈالمیا نے ہندوستان سے آم بھیجے۔ میں نے نہ لیے کہ ان کی سیمنٹ فیکٹریاں یہاں تھیں۔ سر سری رام دہلی کلاتھ ملز لائل پور والے نے ایک درجن تولیے (جن پر میرا نام کندہ تھا) بھیجے میں نے ان کی بازاری قیمت دریافت کر کے چیک بھجوا دیا۔ کبھی کسی فیکٹری وغیرہ سے جو تھوڑی بہت چیز معاینہ کے لیے خریدی اسی وقت اس کے دام ادا کر کے رسید حاصل کی۔ لڑکی کی شادی کراچی میں نہ کی جہاں ہزاروں نئے دوست تھے۔ لاہور میں کی جس میں زیادہ تر پرانے دوستوں کو بلایا۔

پچاس روپے سے زیادہ قیمت کا تحفہ کسی سے قبول نہ کیا۔ کھانا نہ دیا عصرانہ دیا' وہ بھی بالکل سادہ۔ چند صنعت کار تحفے لے کر لاہور پہنچے۔ سب کے تحفے واپس کیے۔ کسی کی سفارش نہ مانی۔ کسی کے کام میں دخل نہ دیا۔ اپنے کام میں منہمک رہا اور ملک کی خدمت میں دن رات ایک کر دیے۔ پھر مجھ پر یہ اُفتاد کیوں پڑی؟

بچی کی شادی کے سلسلے میں جو بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے' وہ یہ ہے کہ رسمی نکاح نہایت سادہ۔ مولوی غلام محی الدین مرحوم کے مکان پر صرف چند عزیزوں کو بلایا ہوا تھا اور نکاح دنیائے اسلام کے نامور مجاہد امین الحسینی مرحوم مفتیٔ اعظم فلسطین نے پڑھایا تھا۔ شادی کے ضمن میں میری ساری کوشش یہ تھی کہ سادگی کی اسلامی مثال پیش کی جائے۔

لاہور پہنچ تو گیا لیکن نہ اپنا مکان' نہ اپنا دفتر۔ مولوی صاحب مرحوم کے ہاں ٹھہرا۔ وکالت کا کاروبار اُکھڑ چکا تھا۔ یہی نہیں اکثر دوستوں نے مشورہ دیا۔ ملک سے باہر چلے جاؤ۔ یہاں فضا تمہارے سخت خلاف ہے۔ سفارت ملتی ہے قبول کر لو۔ چند سال بعد لوگ بات بھول جائیں گے' اس وقت واپس آ جانا۔

ایک دن ایک عزیز نے بتایا کہ وہ ایک تانگہ میں سوار تھے تو دو سواریاں آپس میں بات کر رہی تھیں۔ ایک نے کہا کہ بھئی رشوت تو سب وزیروں نے لی لیکن چودھری نذیر احمد نے تو تمام ریکارڈ مات کر دیے۔

اس کے چند ہی دن بعد کی بات ہے کہ میں اپنی کوٹھی میں تنہا' لان میں بیٹھا ہوا تھا۔ (یہ کوٹھی کچھ منٹگمری کے وکالت کے زمانہ کی پونجی سے' کچھ وہاں کی جائداد بیچ کر اور کچھ ایک عزیز سے قرض لے کر بنائی تھی) یہ ۱۹۵۲ء کی فروری' مارچ کا واقعہ ہے۔ ابھی اس نئی آبادی میں باڑیں وغیرہ نہ تھیں۔ میرے پھاٹک کے باہر میرے نام کا بورڈ (جس پر ایڈووکیٹ بھی لکھا ہوا تھا) پڑھ کر ایک نوجوان بولا (میں نے خود اپنے کانوں سے سُنا) ارے یہ وہی نذیر احمد ہے جو وزیر صنعت تھا۔ وہ جو ساڑھے چار کروڑ روپے رشوت کراچی میں لی تھی' وہ کھا پی گیا ہے' جو پھر دو تین ماہ بعد

وکالت شروع کر دی ہے۔؟

میں نے جب ان نوجوانوں کی گفتگو سنی تو اللہ کا شکر ادا کیا۔ اُس نے مجھے میرے غرور کی سزا دُنیا ہی میں دے دی اور اس طرح مجھے یہ سبق مل گیا کہ بڑائی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ وہی عظیم و برتر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے اپنی پاکی دامن پر فخر و ناز ہی نہ تھا، غرور کا عنصر بھی ضرور شامل ہوگا کہ میں دوسروں سے بہتر ہوں' ایمان دار ہوں، قابل ہوں۔ پھر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے دنیا ہی میں یہ سبق ذہن نشین کرایا کہ درویشی کوئی آسان کام نہیں۔ یہ رتبۂ بلند حاصل کرنے کے لیے" انا" کو مارنا پڑتا ہے۔ مجھے اپنی درویشی پر گھمنڈ تھا۔ یہ ایک سچے درویش کے شایانِ شان نہیں۔ خدا کرے کہ اس تلخ سبق کا اثر ساری عمر میری زندگی پر رہے۔ اب بھی کبھی کبھی کسی بات پر افتخار کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو فوراً اللہ تعالیٰ کے حضور میں عاجزی سے توبہ اور استغفار کرتا ہوں کہ یا الٰہ العالمین! میری خطاؤں کو بخش دے' میری کمزوریوں پر پردہ پوشی کر' تو ہی غفور و رحیم ہے تو ہی سب کا مالک ہے' تو ہی غلطیاں معاف کرنے والا ہے' میرا مقام امیری نہیں فقیری بنا اور مجھ سے غرور اور افتخار کا جو جرم سرزد ہوا ہے' اس کی باز پرس اب عاقبت میں نہ کرنا۔

میں خداوند تعالیٰ کو حاضر و ناظر جان کر کہتا ہوں کہ لاہور آ کر مجھے کراچی کا زمانہ ایسا بھولا جیسا کہ میں کبھی وہاں گیا ہی نہ تھا۔

البتہ ایک بات سمجھ میں نہ آئی کہ آخر وہ ساڑھے چار کروڑ روپیہ کدھر گیا۔ میری ایک مربع زمین نہیں' میری کوئی مل MILL نہیں۔ ایک مکان ضرور ہے۔ پھر ۴۲ سال سے جان مار کر وکالت جیسے مشکل پیشہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دن رات کام کر رہا ہوں۔ آخر وہ ساڑھے چار کروڑ روپیہ جو میں نے رشوت لیا تھا' وہ کس مصرف میں لایا گیا؟

کراچی سے واپسی سے پہلے لاہور کے ایک انگریزی مقامی اخبار نے ایڈیٹوریل لکھا کہ چودھری نذیر احمد وزیرِ صنعت نے لاہور میں ایک کوٹھی بنائی ہے جو ہیران کن کرایہ پر چڑھی ہے

(یعنی مبلغ ۵۰۰ روپے ماہوار پر) حکومت کو چاہیے کہ اس سکینڈل SCANDEL کی فوراً تحقیقات کرائے تاکہ لوگوں کے دلوں سے الجھن دُور ہو۔

لاہور پہنچ کر میں نے اس اخبار کے ایڈیٹر صاحب کو بُلایا (وہ میرے پرانے ملنے والے تھے) میں نے پوچھا۔ آپ نے وہ کوٹھی دیکھی ہے جو پانچ سو روپیہ ماہوار پر کرایہ پر دی گئی ہے؟ وہ بچارے فرمانے لگے کہ چودھری صاحب میں تو دو سو روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا ہوں اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہوں۔ اخبار کے منیجر صاحب اس صنعت کار کے قانونی مشیر ہیں جس نے آپ کے خلاف یہ طوفان بدتمیزی اُٹھایا ہے مجھے انھوں نے بُلا کر حکم دیا ایسا لکھو، میں تعمیل بجا نہ لاتا تو کیا کرتا!

اسی طرح اور کئی کرمفرماؤں نے کہا کہ ہم کو اُس جانب سے رُوپے پیش کیے گئے۔ ہم نے قبول نہیں کیے لیکن کاش کہ میں یہ بات ان سب کے متعلق کہہ سکتا جن کی میں نے ساری عمر خدمت کی اور جنھوں نے اب چند روپلی مصلحتوں کے باعث ڈنگ مارنے سے گریز نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کو بھی جزائے خیر دے اور قلم کی حقیقی عصمت کے راز سے انھیں آگاہ کرے تاکہ وہ حق بات کہیں "ناحق" کو کسی قیمت پر قبول نہ کریں۔ آمین۔

وزارت کے زمانہ کے چند ایک اور واقعات سبق آموز ہیں آپ بھی ملاحظہ فرمائیے:

میں پہلی بار فروری سنہ ۱۹۵۰ء میں جب ڈھاکہ دورہ پر گیا تو اپنے پرانے دوست سر فریڈرک بادان SIR FREDRIK BAWENE گورنر مشرقی پاکستان کے پاس ٹھہرا۔ یہ پاکستان کے ایک صوبہ کا گورنمنٹ ہاؤس تھا لیکن اس کی کپڑے کی تمام اشیا لندن کی ایک مشہور فرم ہارکسز HORROCKES نے مہیا کی تھیں۔ بستروں کی چادریں، تکیوں کے غلاف، تولیے، جھاڑن حتیٰ کہ BATHMENTS غسل خانہ کے فرش پر بچھانے والا کپڑا بھی ہارکسز لندن کا بنا ہوا تھا۔

یاد رہے کہ ڈھاکہ مدت سے کپڑے کی مصنوعات کے واسطے مشہور ہے لیکن پاکستانی

مگر (انگریز نژاد) گورنر نے سب چیزیں اپنے (شیریں وطن) "ہوم سویٹ ہوم (HOME SWEET HOME) سے منگوائی تھیں۔

اتفاق سے میرے قیام کے دوران سر لارنس گرافی سمتھ اور لیڈی سمتھ بھی (برٹش ہائی کمشنر اور ان کی اہلیہ) اسی گورنمنٹ ہاؤس میں مقیم تھیں۔ میں نے ڈھاکہ کے کپڑے کی مصنوعات دیکھنے کے لیے کچھ نمونے منگائے۔ (سب دکاندار ہندو تھے) لیڈی سمتھ اور لیڈی بورن نے ایک ایک چیز کو بہت پسند کیا' تعریفوں کے پل باندھے۔ لیڈی سمتھ نے تو ایک ململ کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا IT IS A DREAM "یہ تو ایک حسین خواب ہے"۔ لیکن ایک پیسے کا کپڑا نہ خریدا۔ تعریف کر کے اپنے اپنے کمروں میں واپس تشریف لے گئیں۔

اس کے مقابلہ میں کراچی گورنر جنرل ہاؤس کا واقعہ بھی سُن لیجیے۔

خواجہ ناظم الدین صاحب مرحوم گورنر جنرل تھے۔ ملٹری سیکرٹری انگریز تھا۔ مجھے پتہ چلا کہ اس نے کئی لاکھ روپے کے چھُری کانٹوں چمچوں وغیرہ کا آرڈر لندن کی کسی فرم کو دیا ہے۔ میں فوراً خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہُوا اور اُن سے گلہ کیا کہ جب گوجرانوالہ' وزیرآباد اور سیالکوٹ میں یہ تمام چیزیں بنتی ہیں اور ہمارے کاریگروں کو آرڈروں کی سخت ضرورت ہے۔ آپ نے آرڈر لندن کو کیوں دیا' مجھے تو طلب کیا ہوتا۔ میں آپ کا وزیر صنعت ہوں' اب بھی یہ آرڈر اگر کسی طرح منسوخ ہو سکتا ہے تو اسے منسوخ کرا لیجیے۔ خواجہ صاحب مرحوم مرنجاں مرنج آدمی تھے' اس بات پر آمادہ نہ ہوئے۔ میرا گلہ اپنی جگہ پر قائم رہا۔

مشرقی پاکستان کے اسی دورہ میں جس کا ذکر میں نے اُوپر کیا ہے' اس خوش فکر دوست نے (جس کو دنیا اے۔ ڈی اظہر کے نام سے جانتی تھی) جو اُس وقت مشرقی پاکستان ریلوے میں چوٹی کے مالیاتی مُشیر تھے' ایک شاندار مشاعرہ کا انتظام چٹاگانگ میں کیا جس میں حفیظ جالندھری۔ ظریف (ضم الکراچوی)، کے علاوہ اور چند ایک شعراء نے اپنا کلام سُنایا۔ چودھری

غلام احمد صاحب پرویز (طلوعِ اسلام) نے اقبال پر ایک محققانہ مقالہ پڑھا اور دہلی سے ایک عظیم باپ (منشی تلوک چند مرحوم) کے عظیم بیٹے جگن ناتھ آزاد نے اپنے کلام سے حاضرین کے دل موہ لیے۔ وہ میانوالی چھوڑ کر دلی جا بسنے پر مجبور ہوئے۔ مگر پوچھتے گئے "میانوالی کے صحرا تیرے ویرانوں پہ کیا گزری" اپنی منظومات کا مجموعہ مجھے بھی عطا کیا اور لکھا "اپنے وطن کے وزیر چودھری نذیر احمد خاں کی خدمت پُرخلوص میں" میں نے جگن ناتھ آزاد کا ثانی نہیں دیکھا، درد مندی کا وہ ایک مُرقّع تھے اور ان کی صداقت دل کے راستہ رُوح تک پہنچ جاتی تھی۔ وطن کی جُدائی پر وطن والوں سے کہتے ہیں:

ممکن نہیں کہ بزمِ طرب پھر سجا سکوں،
اب یہ بھی کم ہے کیا کہ تمھیں یاد آ سکوں

ذوقِ نگاہ اور بہاروں کے درمیاں
پردے پڑے ہیں وہ کہ نہ جن کو ہٹا سکوں

کس طرح کر سکو گے بہاروں کو مطمئن
اہلِ چمن، جو میں بھی چمن میں نہ آ سکوں

آزاد میرے دل میں ہیں رقصاں وہ زمزمے
خود سُن سکوں مگر نہ کسی کو سُنا سکوں

انگریزی شاعر KEATS کا وہ مصرعہ شاید آپ کو یاد آ گیا ہو۔

HEARD MELODIES ARE SWEET BUT
THOSE UNHEARD ARE SWEETER

جگن ناتھ آزاد کی پیاری زبان سے اس کے جگر پاروں کی آواز سُننا اتنی بڑی نعمت تھی کہ میں اپنی خوش بختی پر نازاں تھا۔

پھر خدا نے موقع دیا۔ جنوری ۱۹۵۹ء میں دہلی بین الاقوامی مجلس قانون داناں کے جلسہ

پر جب گیا۔ آزاد سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ انھوں نے بہ کمالِ ذرہ نوازی خود میرے ہوٹل "جن پھتھ" آنے کا وعدہ کیا چنانچہ میں اور میری بیوی، موجودہ جسٹس شکورالسلام کی موجودگی میں کوئی ڈیڑھ گھنٹہ اپنے معجز بیان کلام سے سب کو نوازتے رہے۔

اس سے پہلے ایک دفعہ لاہور آئے تھے تو میاں بشیر احمد مرحوم اور میں نے ان کی تھوڑی سی خدمت کر کے اتنی خوشی حاصل کی تھی کہ باید و شاید۔ یقیناً "آزاد" ایک قابلِ قدر ہستی تھی اور یہ میری خوش بختی تھی کہ اس عظیم شاعر اور انسان کے ہمراہ کچھ وقت گزارنے کا موقع مل گیا۔

انگریز کی وطن دوستی بہت ہی سبق آموز ہے۔ لیکن بعض دفعہ وہ معمولی مطلب کے لیے کچھ ہیر پھیر بھی کر جاتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ مسلمان کو اس قسم کا ہیر پھیر کرنا جائز ہے۔ ہم ماشاءاللہ اس قسم کی عیاریوں سے پاک رہنا چاہتے ہیں لیکن جو واقعہ میں بیان کرنے والا ہوں، اس کا واحد سبق یہ ہے کہ پاکستان بننے کے بعد بھی بعض ممالک کی پالیسی اس حکمتِ عملی پر مبنی رہی ہے کہ کم ترقی یافتہ ملکوں سے جس رنگ میں بھی فائدہ اُٹھا سکو' اُٹھاؤ۔ حکومت کا ڈنڈا نہ رہا تو تجارت و صنعت کا حربہ استعمال کرو۔ یہ بھی پُوری طرح کام نہ آسکے تو ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں کے اجزا کو نسخۂ "تحلیلِ مشرق" میں استعمال کرنا مفید رہتا ہے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ فرنگ (جس میں اب امریکہ بھی شامل ہے) اور روس بھی ہمیشہ سے اپنے مفاد کے لیے کام کرتے ہیں وہ سب "ایشیا میں کھیلتے پھرتے ہیں قوموں کا شکار"

ہمیں ان سے واسطہ پڑے تو اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔

کراچی کے قیام کے دوران ایک دن اخبار میں پڑھا کہ ایک برطانوی صنعتی وفد لارڈ برلے (LORD BURLIEGH) کی قیادت میں کوئی سوا ماہ کے لیے پاکستان آ رہا ہے تا کہ یہاں کی صنعتوں کو فروغ دینے میں مدد کر سکے۔

میں نے نیا نیا کام سنبھالا تھا۔ دفتر سے پوچھا کہ اس صنعتی مشن کے ضمن میں مجھے متعلقہ کاغذات بھیج دیں۔ دو تین روز بعد پتہ چلا کہ وزارت صنعت میں تو کوئی کاغذات ہی نہیں۔ لیکن چونکہ چند ماہ پہلے ہی وزارتِ تجارت و صنعت مشترکہ تھیں، شاید وزارتِ تجارت کے دفتر میں ہوں SIR ALAN MACQFERQUHAR وزارت تجارت کے سیکرٹری تھے۔ تین چار دن تو وہ ٹالتے رہے کہ کاغذات مل نہیں رہے۔ لیکن جب میرے سیکرٹری نے ان کو یقین دلایا کہ یہ نیا وزیر دُھن کا پکّا ہے۔ بے ڈھب شخص ہے۔ اگر کاغذات کل تک نہ ملے تو وہ وزیرِ اعظم کے نوٹس میں سارا معاملہ لائیں گے۔ دوسرے دن کاغذات مل گئے۔

پتہ چلا کہ جب وزیرِ اعظم گزشتہ دفعہ (کوئی چھ ماہ پہلے) انگلستان گئے تھے تو برطانیہ کے وزیرِ اعظم نے ان سے کہا تھا کہ وہ ایک تجارتی وفد پاکستان بھیجنا چاہتے ہیں۔ اب ان کا تار آیا تھا کہ غالباً آپ نے وفد کے متعلق فیصلہ کر لیا ہوگا۔ ہمارے وزیرِ اعظم صاحب نے جواب دیا کہ ہاں وفد آسکتا ہے۔ چند دن بعد اخبارات میں یہ خبر چھپی کہ انگلستان کا ایک اونچی سطح کا "صنعتی" وفد لارڈ برلے کی قیادت میں پاکستان جا رہا ہے (لارڈ برلے اولپک کے مشہور کھلاڑی (دوڑ لگانے والے) تھے لیکن صنعت کے ضمن میں ہم نے ان کا نام تک کبھی نہ سُنا تھا)

میں نے کاغذات دیکھ کر حکم دیا کہ یہ "تجارتی" وفد ہے "صنعتی" نہیں ہے۔ وزارتِ تجارت ان کا پروگرام بنائے۔ اگر وزارتِ تجارت کو وزارتِ صنعت کے تعاون کی ضرورت ہو تو ہم بخوشی دیں گے۔ لیکن سرکاری طور پر ایسے صنعتی وفد تسلیم نہیں کرتے۔

ڈیڑھ ماہ تک پاکستان کا دورہ کرنے کے بعد مجھے اپنے طور پر پتہ چلا کہ وفد یہ سفارش بھی کرے گا کہ پاکستان میں بڑی اور درمیانی صنعتیں قائم کرنے کے امکانات نہیں ہیں۔ یہاں صرف گھریلو یا چھوٹی صنعت کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

میں نے اس وقت اخباری بیان دیا کہ وزیرِ صنعت کی رائے میں پاکستان میں بھاری اور درمیانی صنعتیں قائم کرنے کے کافی امکانات ہیں اور ہماری توجہ اس پر ہونی چاہیے اور انشاءاللہ ہم یہ کام سرانجام دینا شروع کر دیں گے۔

میرے اس دوٹوک بیان کے بعد برطانوی وفد کی رپورٹ منظرِ عام پر نہیں آئی۔ چند دن بعد وفد بخیر و خوبی وطن واپس روانہ ہو گیا۔ شما بخیر و ما بہ سلامت یہ قصہ یوں ختم ہوا۔

سبق اس واقعہ سے یہ ملتا ہے کہ پاکستان جیسے ملک کو بیرونی وفود اور ماہرین کی رائے کو بڑے غور سے چھان پھٹک کر قبول کرنا چاہیے کیونکہ اکثر معاملہ کچھ اس ڈھب کا ہوتا ہے۔

سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

ماضی کے تجربے مستقبل کے لیے مشعلِ راہ بن سکتے ہیں۔ ہمیں تو ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا چاہیے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس معاملہ میں بے احتیاطی اور بے راہ روی سے کام لیے گئے ہیں۔ یہ ملکی مفادات کے لیے کوئی مفید روش نہیں ہے۔

میں نے اپنے زمانۂ وزارت میں ایک ذاتی سفارش ایک بڑے افسر کے پاس کی تھی، وہ شاید آپ کے لیے دلچسپ ثابت ہو۔

غالباً جولائی ۱۹۵۱ء میں میں میاں امین الدین مرحوم (جو اس وقت بلوچستان میں گورنر جنرل کے ایجنٹ تھے اور بعد میں پنجاب میں گورنر رہے) اور جنرل گریسی کمانڈر ان چیف پاکستان ایک ہی ٹرین میں کوئٹہ سے کراچی آ رہے تھے۔ میں نے دونوں احباب کو دوپہر اور رات کے کھانے پر اپنے سیلون میں مدعو کیا تھا۔

رات کا کھانا شروع ہوا تو میں نے کمانڈر ان چیف صاحب سے کہا۔ جنرل۔ میں نے آپ سے ایک سفارش کرنی ہے۔ وہ منتظر تھے کہ میں مزید کیا کہتا ہوں۔ میں بات سوچے سمجھے منصوبہ کے ماتحت کر رہا تھا، ایک خاص انداز میں کہا "سفارش بھی ذاتی

ہے۔" جنرل گریسی اس پر کچھ متعجب ہوئے کہ ایک کھانا کھلا کر پاکستان کے وزیر ذاتی سفارش پر بھی اُتر آئے۔ غالباً انھوں نے میری بات کچھ پسند نہ کی (جو میں نے مزے لے لے کر کہا) کہ سفارش میرے لڑکے کے متعلق ہے جو فوج میں ہے۔ میاں امین الدین مرحوم اور جنرل گریسی دونوں متعجب ہو کر میرا منھ دیکھنے لگے۔ جنرل گریسی نے ذرا خشک لہجے میں کہا۔ "فرمائیے کیا ارشاد ہے؟" میں نے کہا میرا لڑکا ۹ سال سے فوج میں ہے۔ آج تک سٹاف میں رہا ہے۔ رائفل چلانے کا کبھی موقع ہی نہیں ملا آجکل یہ حضرت کراچی میں ملٹری انٹیلی جنس MILITARY INTELLIGENCE میں میاں میرے ہاں رہتے ہیں۔ اپنی کار رکھی ہوئی ہے۔ کراچی کی اعلیٰ سوسائٹی میں گزر ہوتی ہے۔ مکمل طور پر رئیس زادوں کی سی زندگی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ اس کو سپاہی بنائیں جو ایک فوجی کا پہلا مقام ہے اور اسے اپنے یونٹ میں تبدیل کر دیں تا کہ وہ سخت فوجی زندگی کا عادی بن سکے۔ اب جنرل گریسی کو معلوم ہوا کہ میں نے کس طرح تمہید اپنی سفارش کی اٹھائی تھی۔ میرا مطلب پا کر وہ بہت خوش ہوئے، کہنے لگے اس کا نام، پتہ، اصلی رجمنٹ وغیرہ بتائیے۔ میں نے کہا ARMOURED CORPS NAUSHERA انھوں نے اسی وقت نیو کارڈ (NEW CARD) کے پیچھے سارے کوائف نوٹ کر کے ہنستے ہوئے کہا۔ بہت بہتر تعمیل ارشاد ہوگی۔

کوئی چار پانچ دن بعد ہمارے بڑے صاحبزادے سعید میاں صاحب مُنھ لٹکائے کھانے کے وقت دفتر سے آئے اور بجھے بجھے انداز میں کہا۔ یہ کیا ہوگیا۔ میرا تبادلہ فوری طور پر نوشہرہ کر دیا گیا ہے۔ حکم ہوا ہے کہ ایکدم اپنی یونٹ میں حاضر ہو۔ میں نے کچھ دیر ان کی پریشانی سے لطف اندوز ہونے کے بعد ڈنر والی سفارش کا واقعہ بتایا۔ بہت سٹ پٹائے کہ یہ آپ نے کیا کیا۔ میں نے کہا۔ بیٹا یہ تمھارے لیے اور ملک کے لیے بہتر ہے پاکستان کے فوجیوں کو لڑاکا، جری اور تجربہ کار ہونا چاہیے GANTLEMAN AT LAROB نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ سعید صاحب کراچی کی دلچسپیوں کو چھوڑ کر عازم نوشہرہ ہو گئے۔

وکالت کا تیسرا دور

اکتوبر ۱۹۵۱ء کے اواخر میں لاہور پہنچا تو نہ اپنا مکان تھا (وہ کرایہ پر چڑھا ہوا تھا) نہ دفتر نہ کلرک اور نہ ہی لائبریری کی پوری کتابیں۔ (جو میری عدم موجودگی اور کسی محفوظ مقام پر ان کو رکھنے کا بندوبست نہ ہونے کی وجہ سے اکثر ضائع ہو چکی تھیں) عزیز و اقارب سے جو قرض لیا ہوا تھا۔ اس کو بھی اتارنے کی فکر تھی۔ مولوی غلام محی الدین صاحب مرحوم کے ہاں قیام کیا۔ باہر سیر کو نکلتا تو یہ لوگ انگلیاں اٹھاتے "یہ ہے وہ نذیر احمد جو رشوت کی وجہ سے موقوف ہوا ہے"۔

میں یہ سب کچھ سنتا تھا لیکن دل پریشان نہ ہوتا۔ کیونکہ مجھے اللہ کے فضل سے یقین تھا کہ میرا دامن پاک ہے اور خواہ مخواہ الزام لگانے والے اخباری پروپاگنڈا سے فی الحال متاثر ہیں۔ تھوڑی دیر میں اصل حالات سے واقف ہونے پر ان کا رویہ درست ہو جائیگا۔

جس وقت سے میرے لیے یہ آزمائش کا زمانہ شروع ہوا حضرت اکبر کی اس رباعی سے دل کو بڑی تسکین ملتی تھی۔

کہو کرے گا حفاظت میری خدا   رہوں جو حق پہ مخالف کرینگے کیا میرا
غرور ابلیس ہے تو مجھ کو بھی نازہے اکبر   سوا خدا کے سب ان کا ہے اور خدا میرا

زمانہ کی روش کے مطابق اکثر "احباب" نے آنکھیں بدل لیں۔ لیکن اس سارے ابتلا کے دور میں میرے ایک محترم دوست کے اخلاص کا خاص طور پر ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

مرحوم مسٹر جسٹس اے۔ ایم جان جج لاہور ہائی کورٹ، جو میری خاطر لاہور کی اعلیٰ "سوسائٹی" سے ہمیشہ لڑائی لڑتے رہے اور آخر اکثروں کو قائل کر کے چھوڑا کہ جو لے سرو پا باتیں وہ میرے متعلق کرتے تھے۔ ان میں ذرا بھر بھی اصلیت نہیں۔ چند حاسدوں اور بدخواہوں نے طوفانِ بدتمیزی مچایا تھا۔ جو خود بخود جھوٹا ثابت ہو رہا ہے۔ دنیا میں ایسا ہوتا آیا ہے۔ آزمائش ہر انسان پر آتی ہے۔ نذیر احمد بالکل بے قصور ہے اور اس پر الزام دھرنے والے بالکل جھوٹے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو غریقِ رحمت کریں، ایسا سچا دوست کسی کسی کو ملتا ہے۔ میں خوبیٔ قسمت سمجھتا ہوں کہ صرف جان مرحوم نے نہیں بلکہ جلدی ہی اور متعدد احباب نے فضا کو صاف کر کے میرے لیے میری دیرینہ آرزو پوری ہونے کی راہ ہموار کر دی کہ اصلیت سامنے آجائے۔

میں شروع سے وکالت کو بیشتر پیشوں پر ترجیح دیتا تھا۔ مجھے اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمتوں کی پیش کش ہوئی لیکن میں نے اپنی آزادی میں فرق نہ آنے دیا۔

ہاں وزارت کو میں نے ضرور وسیع طور پر خدمتِ ملک و ملت کا موقع سمجھا۔ اس لیے کچھ عرصہ کے لیے وکالت کو چھوڑنا پڑا۔ اب پھر میں خدا کے فضل سے اپنے پسندیدہ ماحول میں واپس آگیا تھا اور خوش تھا کہ میں اپنے صحیح مقام پر پہنچ گیا ہوں۔ سفارت سے میں نے (آخر کار) انکار کر دیا تھا کہ میرا ارادہ وکلاء کی تنظیم کرنا تھا تاکہ وہ ایک معزز پیشہ کے افراد کی حیثیت سے مل جل کر اجتماعی طور پر ملکی خدمت کر سکیں۔

چند ماہ میں میرا مکان بھی خالی ہو گیا، دفتر بھی قائم ہو گیا اور چونکہ اللہ کے فضل سے وکالت میں میرا نام کسی حد تک معروف تھا، بلا تاخیر عدالتی کام میں میرا پرانا سلسلہ شروع ہو گیا اور میں عارضی بوجھوں کے دباؤ سے جلدی فارغ ہو کر تنظیم وکلاء کی طرف مشغول ہو گیا۔

میں ابھی تک دستور ساز اسمبلی کا ممبر تھا۔ لیکن خلافِ سابق میں زیادہ توجہ پیشۂ وکالت اور اس کی تنظیم کی طرف دیتا تھا۔ اسمبلی کی قانونی کارروائی میں مجھے خاص دلچسپی نہ رہی تھی،

لیکن جہاں تک اس کی حیثیت آئین بنانے والے ادارے کی تھی۔ اس میں بھرپور حصہ لیتا تھا خصوصاً اس غرض کے لیے آئینی ڈھانچہ اسلام اور محض اسلام کی مضبوط اور پاک بنیادوں پر قائم ہو سکے۔

ایک طرف یہ دُھن تھی، دوسری طرف وکلاء کی تنظیم کا کام۔ بس سارا وقت لاہور کراچی۔ کراچی، لاہور گزرتا تھا کہ دونوں ذمہ داریوں سے عُہدہ برآ ہو سکوں

مجھے شروع سے سازشی اور غلیظ سیاست سے نفرت تھی۔ مسٹر لیاقت علی خاں کو میں نے ایک صاف ستھرا کارکن شخص پایا، جس کے کام کے کچھ اصول تھے، کچھ ضوابط تھے، کوئی دستور تھا۔ من مانی اور بلا ضابطہ کارروائیوں سے وہ اجتناب کرتے تھے اور گو انقلابی طبیعت کے مالک نہ تھے تاہم جدید ضروریات کو حل کرنے کے جدید طریقوں سے بھی اجتناب نہ کرتے تھے۔ میں پہلے بطور ممبر دستور ساز اسمبلی اور پھر دو سال سے زیادہ ان کے وزیر کی حیثیت سے ان کے طریق کار سے متاثر ہوا کہ وہ میری اپنی زندگی کی روشوں سے ہم آہنگ تھے۔

ذاتی پسند و ناپسند کا دخل تو ہر ملک میں پایا جاتا ہے اور پاکستان کے شروع میں بھی اس کی جھلک نظر آتی تھی لیکن ملکی سیاست میں محلاتی سازشوں کو وہ دخل نہ تھا جس کی وجہ سے لیاقت علی خاں شہید کے فوراً بعد پاکستان کا تار و پود بکھر کر رہ گیا اور جس کے مذموم اثرات اب بدرجہ اُتم رُونما ہو رہے ہیں ۔

ہائی کمشنری کی پیش کش برائے آسٹریلیا

میں خود اس محلاتی سازش کا شکار ہوا تھا کہ اب آسٹریلیا کی ہائی کمشنری (سفارت) کا مسئلہ میرے لیے ذہنی خلجان کا باعث بن گیا۔ میں نئے ماحول اور نئی قیادت کے ساتھ ایک قدم بھی چلنے کو تیار نہ تھا چہ جائیکہ میں ان کا "ملازم" ہو کر ملک بدر ہو جاؤں۔ میرے اکثر احباب مُصر تھے کہ چونکہ گورنری کی پیش کش ہوئی ہے۔ سفارت قبول کر لو۔ میرا اپنا دل نہ مانتا تھا اور میں نے خود بھی ساری عمر اس اصُول پر چلنے کی کوشش کی کہ جس بات پر اپنا "من" راضی نہ ہو وہ مت کرو۔ انھیں جذبات کے ماتحت مجھے جب ۲۔ فروری ۱۹۵۲ء کو حکومت پاکستان کی طرف سے آسٹریلیا میں ہائی کمشنری (سفارت) پر تقرری کا حکم موصول ہُوا تو انکار کرنے میں کوئی دقّت محسوس نہ ہوئی۔ میرا ذہن تو اس معاملہ میں بالکل صاف تھا۔ لیکن احباب کا اور خصوصاً جسٹس جان مرحوم کا اصرار تھا کہ تُم سیاسی زندگی سے علیحدہ نہ ہو جاؤ۔ ملک کو تمھاری ضرورت ہے۔ میں نے سب پہلوؤں کو اچھی طرح سے سوچا اور آخر کار اسی نتیجہ پر پہنچا کہ اب پاکستانی سیاست میں قابلیت، کام، اہلیت، دیانت داری اور محب الوطنی کی اتنی اہمیت نہیں رہے گی جتنی ہونی چاہیے۔ ان کی بجائے سیاسی گٹھ جوڑ، پارٹی بازی اور محلاتی سازشوں کو زیادہ دخل ہو جائے گا اور میں طبعاً اس سے متنفر تھا۔

دوسرے میں نے یہ خیال کیا کہ ملک کی خدمت رائے عامہ کو بیدار کر کے صحیح راستوں پر ڈالنے سے بھی کی جا سکتی ہے۔ میں سختی سے اس خیال کا حامی تھا کہ اسمبلیوں سے باہر طبقہ

وکلا ملک میں صحیح اسلامی اور جمہوری قدریں قائم کرنے میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔
چنانچہ انھیں خطوط پر میں نے ایک اخباری بیان کے ذریعہ اس خیال کا اظہار کیا کہ گو بیرونِ ملک بھی پاکستان کی خدمت بڑی سعادت کی بات ہے تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ملک میں رہ کر بھی ایسی ہی قابلِ قدر خدمت کی جا سکتی ہے اور اس کے لیے وکلاء کا طبقہ سب سے موزوں طبقہ ہے کہ مفکرِ پاکستان (علامہ اقبالؒ) اور بانیٔ پاکستان (قائدِ اعظمؒ) دونوں وکیل تھے۔ ان کے نقشِ قدم پر چل کر وکیل صاحبان قوم کی صحیح راہنمائی اور تنظیم کر سکتے ہیں تاکہ یہ ملک ان بنیادوں پر استوار ہو سکے جن کا ہم نے ملت سے وعدہ کیا تھا اور جن کے بغیر اب بھی یہ ملک کبھی اپنی سالمیت قائم نہیں رکھ سکتا۔
میں کچھ اسی قسم کے خیال کا اظہار کر کے سفارت کی پیش کش نامنظور کر دی اور اس طرح دوستوں کے پیدا کردہ ایک ذہنی خلجان سے خدا نے نجات دلوا دی۔
ادھر اب یکسوئی کے ساتھ پاکستان بار ایسوسی ایشن قائم کرنے کے لیے کام شروع کر دیا جس میں مغربی اور مشرقی پاکستان کے وکلاء شامل ہوں۔ البتہ دستور ساز اسمبلی BASIC PRINCIPLES COMMITTEE جس کا میں ممبر تھا' اس میں پوری دلچسپی لیتا رہا اور عملاً اس طبقۂ ممبران کا SPECIMEN (نفسِ ناطق) بن گیا جو خالص اسلامی ریاست بنانے کا متمنی تھا۔

مجھے ۱۹۵۲ء کے اخیر یا ۱۹۵۳ء کے شروع میں سنٹرل مسلم لیگ پارٹی کا ایک اجلاس (جو مملکت کے بنیادی اصول وضع کرنے کے لیے بلایا گیا تھا) خاص طور پر یاد ہے۔ جس میں دو دن ڈیڑھ ڈیڑھ گھنٹہ اسلامی مملکت کے قیام کی میں نے پُرزور حمایت کی۔ مسٹر محمد علی (بوگرہ) (وزیر اعظم) پارٹی کے صدر کی حیثیت سے چیئرمین تھے۔ اپنی تقریر کے دوران میں نے باآوازِ بلند کہا:

"YOU MR. CHAIRMAN ARE THE BIGGEST MURDERER IN PAKISTAN" "مسٹر چیئرمین، آپ پاکستان کے سب سے بڑے قاتل ہیں"

میرے اس صریح اور کڑے الزام پر بوگرہ صاحب کے بڑے بڑے جغادری وزیر خشمگیں نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔

میں جو کچھ کہہ رہا تھا سوچے سمجھے خیالات کا نتیجہ تھا۔ میں نے وزیر صاحبان کی "وفاداری" کے اظہار کو نوٹ کرتے ہوئے پھر کہا :

I REPEAT THE CHAIRMAN YOU ARE THE BIGGEST MURDERER IN PAKISTAN

اس تکرار پر اس وقت کے وزیر قانون نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ گویا وہ مجھے سمجھا رہے تھے کہ میں پٹڑی سے اُتر گیا۔ وزیر اعظم کچھ بھی ہو پاکستان میں سب سے بڑا "قاتل" کیسے ہو سکتا ہے۔ میں اس سارے سین کا لطف اٹھا رہا تھا۔ وزیر قانون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا :

OUR CHAIRMAN IS THE BIGEST MURDERER IN PAKISTAN BECAUSE HE HAS KILLED THE SOUL OF THE NATION.

" ہمارے چیئرمین صاحب اس واسطے پاکستان کے سب سے بڑے قاتل ہیں کہ انھوں نے ملت کی رُوح کو تباہ کر دیا ہے۔"

THE MANNER IN WHICH HE HAS ADVERTIZED THIS GIFT OF AMERICAN WHEAT IS LIKE STEEL IN OUR SOUL

" جس طرح انھوں نے امریکی گندم کے تحفے کو نشر کیا ہے ہماری رُوح کو خنجر سے مجروح کرنے کے مترادف ہے۔"

پھر مسٹر چیئرمین کو مخاطب کرتے ہوئے کہا :

YOU HAVE MADE US A NATION OF BEGGARS. YOU HAVE KILLED THE SOUL OF A NATION. THAT IS WHY I SAY, YOU ARE THE BIGGEST MURDERER IN PAKISTAN

"چونکہ آپ نے ایک قوم کے حفظِ نفس کو برباد کر دیا ہے اس واسطے میں پھر کہتا ہوں کہ آپ پاکستان کے سب سے بڑے قاتل ہیں۔"

میں نے یہ بھی کہا کہ ہماری مسلم لیگ پارٹی (جس نے پاکستان قائم کیا تھا) کے کچھ وزیر ریڈیو پاکستان کے بند کروں میں بیٹھ کر سپاہیوں کی سنگینوں کے حصار میں اب بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ اسلامی آئین سے مُراد کیا ہے؟

میں ان کو چیلنج کرتا ہوں کہ وہ یہی سوال اسمبلی کی عمارت سے باہر نکل کر اس چوراستے میں کریں۔ ملت اس کا مناسب جواب دے دے گی۔

بنیادی حقوق کی کمیٹی کی میری بیباکانہ تقریر کے بعد ایک دن مجھے مسٹر محمد علی بوگرہ وزیرِ اعظم نے بلایا۔ اس وقت وہ اپنے دندان ساز کے پاس جا رہے تھے۔ مجھے موٹر میں ساتھ بٹھایا اور ڈاکٹر صاحب کے کلینک کی سیڑھیوں پر چڑھتے چڑھتے فرمایا کہ آپ وفاقی کابینہ میں شامل ہو جائیں۔ میں نے کہا: آپ اپنے دانتوں کی طرف توجہ دیجیے۔ مجھے اب وزارت کی خواہش نہیں ہے لیکن وہ مریضوں کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بھی مصر تھے جو میں نے اسی اصرار کے ساتھ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور دوسرے دن چودھری محمد علی وزیرِ خزانہ سے شکایت کی کہ اگر وزارتیں اس طرح بننی شروع ہو گئیں تو پاکستان کا اللہ حافظ!

اللہ کا شکر ہے کہ بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹ اسلامی آئین کے حق میں تسلی بخش تھی اور اگر ان بنیادوں پر کوئی آئین مرتب ہو جاتا تو ملک اس دو رُخی پالیسی کا شکار نہ ہوتا، جس کا آج ہے اور نہ ہی مشرقی پاکستان ہم سے اس طرح جُدا ہوتا کہ ابھی تک بھی اس سانحہ کو یاد کر کے رُوح بے قرار ہو جاتی ہے۔ لیکن :

" اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا "

قبل اس کے کہ ہماری رپورٹ کے مطابق نئے آئین کا ڈھانچہ مرتب ہو۔ مسٹر غلام محمد گورنر جنرل پاکستان نے دستور ساز اسمبلی کو ہی منسوخ کر دیا کہ " نہ رہے بانس نہ بجے بانسری " اس واقعہ سے (اور درحقیقت اس واقعہ سے بھی پہلے مسٹر لیاقت علی خاں کی شہادت کے بعد) نئی قیادت کے عنان حکومت سنبھالنے سے پاکستان کے موجودہ مرض اور اس کی مصیبتوں کا آغاز ہوا، جس کا خمیازہ ہم آج تک بھگت رہے ہیں اور اگر موجودہ حالات رُو بہ اصلاح نہ ہوئے تو نہ معلوم کب تک بھگتیں گے۔ " خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے "

اسمبلی کے ٹوٹنے سے مجھے پاکستان بار ایسوسی ایشن قائم کرنے کا پُورا وقت مل گیا اور خُدا کا شکر ہے کہ اواخر ۱۹۵۳ء میں ملکی بار ایسوسی ایشن قائم ہو گئی، جس میں ملک کے دونوں حصّوں سے وُکلاء شریک ہُوئے۔ مشرقی پاکستان سے محض گنتی کے۔ لیکن انھوں نے ممبر شِپ فارم پُر کر دیے، چندہ ادا کر دیا۔ اگرچہ کسی جلسہ میں باقاعدگی سے شرکت نہ کی۔

مسٹر چندریگر مرحوم ایسوسی ایشن کے پہلے صدر منتخب ہُوئے لیکن جلدی ہی ان کے وزیر اعظم بننے کے بعد " قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند " مجھے پاکستان بار ایسوسی ایشن کا مستقل صدر چُنا گیا۔

میری یہ کوشش تھی کہ ہائی کورٹ بار جیسی معزز اور برگزیدہ جماعت کے صدر کا انتخاب قریباً قریباً بلا مقابلہ ہو۔ چند بزرگ وکلاء بیٹھ کر خواہش مند صاحبان سے ایک کو چُن لیں اور باقی سب انھیں منظور کریں۔ یہ دردانے در جا کر ووٹ مانگنا جسے

CANVASSING کہا جاتا ہے' پارٹیاں اور کھانے دینا، سفارشیں کرنا، منتیں کرکر کے ووٹ مانگنا مجھے اس اُونچے ادارے کے واسطے مناسب وموزوں معلوم نہ ہوتا تھا۔ میں نے اسی اُصول کو مدِنظر رکھ اپنی خواہش کا اظہار کردیا لیکن کسی سے ووٹ نہ مانگا۔ میرے محترم خُسر مولوی غلام محی الدین صاحب جو خود بھی ہائی کورٹ بار کے صدر رہ چکے تھے، ایک دن فرمانے لگے۔ بعض بڑے وکیلوں کے ہاں تو آپ کو جانا پڑے گا (ووٹ مانگنے کے لیے)، بخشی ٹیک چند (تقسیم سے پہلے سابق جج لاہور ہائی کورٹ) جب صدارت ہائی کورٹ بار کے واسطے کھڑے ہوئے تھے' وہ بھی کچھ نہ کچھ CANVA کرتے رہے۔ مجھے مولوی صاحب کا بڑا احترام تھا لیکن میں نے بہ صد ادب عرض کیا کہ "میں بخشی ٹیک چند نہیں ہوں"۔

چنانچہ میں نے بغیر CANVASSING کے اپنی اُمیدواری کا اعلان کردیا اور ۳۰ ووٹ سے ہار گیا۔ دوسرا اُمیدوار عین وقت پر ڈسٹرکٹ کورٹ کے وکیل ممبر لاکر جیت گیا لیکن میں اپنے موقف پر اڑا رہا۔

۱۹۵۵ء میں ملک بھر میں اسی شرط پر اُمیدوارِ صدارت ہُوا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ بلا مقابلہ ہائی کورٹ بار کا صدر منتخب ہوگیا اور کوئی CANVASSING بھی نہ کرنی پڑی۔ ازاں بعد بھی میری کوشش یہی رہی کہ جو بھی صدر ہو' بلا مقابلہ ہو۔ ایک دو دفعہ اس تجویز پر عمل ہُوا لیکن ہنگامہ پسند قوم زیادہ تر الیکشن کا دنگل دیکھنا چاہتی ہے خواہ وہ اسلامی روایات اور تاریخ کے مطابق ہو یا نہ ہو۔

عنوانِ کتاب ہٰذا

میں نے اس کتاب کو شروع کرتے وقت یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ہمارے مشرقی پاکستانی بھائی پھر ہم سے آملیں گے۔ ہمیں اس طرف پوری توجہ دینی چاہیے اور بھرپور کوشش میں مصروف رہنا چاہیے۔ معاملہ فہمی کے لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ بطور ممبر آئین ساز اسمبلی اور خصوصاً بطور ایک وزیر کے اپنے تاثرات و مشاہدات آپ کے سامنے مختصراً پیش کر دوں۔

جب ہم ۱۱ر اگست ۱۹۴۷ء کو کراچی پہنچے تو ہمیں سمرسٹ ہاؤس میں جگہ ملی جہاں کئی بنگالی ممبرانِ اسمبلی بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ شروع سے ہم نے محسوس کیا کہ وہ ہم سے گھُل مِل کر باتیں نہیں کرتے تھے۔ کھانے وغیرہ پر بھی وہ گرمجوشی سے ہمارے پاس نہ بیٹھتے تھے۔ آپس میں زیادہ مل جُل کر وقت کاٹتے تھے اور زیادہ تر بات چیت بھی بنگالی میں کرتے یا انگریزی میں۔ اُردو بول سکتے تھے لیکن بولتے نہ تھے۔ ہم ان کے بہت قریب آنا چاہتے تھے مگر یہ واقعہ ہے کہ وہ فاصلہ قائم رکھنا چاہتے تھے۔ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا ہمیں بنگالی بھائیوں کی ذہنیت کا مطالعہ کرنے کا زیادہ موقع ملا۔ انھیں قدرتی طور پر یہ احساس تھا کہ طاقت تو ساری مغربی پاکستان میں ہے، روپیہ بھی جو کچھ ہے یہاں ہے۔ مشرقی حصّہ تو ایک دُور اُفتادہ علاقہ ہے جو پسماندگی کی حالت میں چھوڑ دیا جائے گا۔ ان کا یہ تاثر بالکل غلط تھا۔ مغربی پاکستانیوں کی بھاری اکثریت اپنے بنگالی مسلم بھائیوں کو محبت اور برادرانہ کے

جذبہ سے دیکھتی تھی۔ مشرقی پاکستان کے عوام بھی یہی جذبہ رکھتے تھے لیکن ان کے جو نمائندے دستور ساز اسمبلی میں آئے' ان کی اکثریت کچھ اس خیال کی تھی کہ مشرقی پاکستان سے ایسا خصوصی سلوک کیا جائے۔ جو اُن کی رائے میں نہیں کیا جا رہا۔ میں پھر مغربی پاکستان کے ممبروں کی بھاری اکثریت کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہمارے دلوں میں ہرگز ہرگز کبھی ایسا خیال نہ آیا کہ مغربی پاکستان کو مشرقی پاکستان پر کوئی برتری یا فوقیت حاصل ہونی چاہیے۔ بنگالی بھائیوں کے خیالات کی بنا پر اس وقت زیادہ تر اچھی طرح پتہ چلا جب میں وہاں کے دورے پر گیا۔ عوام صوم و صلوٰۃ کے پابند، سادہ دل مسلمان' ان کے لیڈر بھی اچھے مسلمان لیکن بُری طرح ہندو کے اثر میں۔ اس وقت کوئی ۱½ کروڑ ہندو مشرقی پاکستان میں تھے جو سب کے سب ففتھ کالمسٹ تھے اور جن کی وفاداریاں ہندوستان کے ساتھ تھیں۔ تجارت ساری ہندوؤں کے ہاتھ میں تھی سوائے پٹ سن کے کیا بیلنگ پریس (KATAHA BAILING PRESS) کے اور کوئی کارخانہ مشرقی پاکستان میں نہ تھا۔ یہ ہندو مارواڑی اور انگریز بہادر کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔ سنہ ۱۹۵۰ء میں ایک پٹرول پمپ بھی کسی مسلمان ڈیلر (DEALER) کے پاس نہ تھا۔ قریباً سارے سکولوں کے اساتذہ اور افسران اور اکثر وکلاء ہندو تھے۔ میرا یہ تاثر ہے کہ یہ لوگ مسلمان لیڈروں سے ملی بھگت رکھتے تھے اور طرح طرح کے وسوسے اُن کے دل میں ڈالتے تھے۔ یہاں تک سنہ ۱۹۵۰ء میں ہی ایک دن مجھ کو مسٹر لیاقت علی خاں نے کہا کہ آج ہمارے بنگالی بھائی وفد کی صُورت میں آئے تھے (قیادت ایک صاحب کر رہے تھے جو حال ہی میں پاکستان میں فوت ہوئے ہیں) انھوں نے طرح طرح کی شکایتیں پیش کیں اور کچھ اس قسم کا اظہار کیا کہ اُن کے ساتھ سخت ناانصافی برتی جا رہی ہے۔ مسٹر لیاقت علی خاں نے ہر طرح سے انھیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ ان کے شکوک بالکل بے بنیاد ہیں مگر وہ اپنی ہٹ پر قائم رہے جس پر مسٹر لیاقت علی خاں نے بالآخر کہہ دیا کہ بہت بہتر صاحبان اگر آپ اتنے بیزار ہیں تو آپ بخوشی ہم سے علیحدہ ہو سکتے ہیں اس

پر فوراً سب نے کہا۔ نہیں، ہمارا یہ منشا ہرگز نہیں ہم تو صرف شکایات پیش کر رہے ہیں۔

جن صاحبوں نے ڈھاکہ کو ۱۹۴۷ء میں دیکھا ہے یا مشرقی پاکستان کے دوسرے بڑے شہروں اور علاقوں کو اس وقت دیکھا ہے، وہ ۱۹۷۰ء کے مشرقی بنگال کو دیکھتے تو ان کو زمین آسمان کا فرق نظر آتا۔ اتنی بھاری صنعتیں۔ اتنی شاندار عمارتیں، سڑکیں، جہاز، سکول، کالج، بندرگاہ نظر آتے جو پہلے وہاں کبھی نہ دیکھے تھے۔ تجارت فروغ پر تھی غرضکہ ۱۹۷۰ء کے ڈھاکہ اور ۱۹۷۰ء کے لاہور میں کوئی فرق نظر نہ آتا تھا۔ اور پھر لطف یہ ہے کہ یہ ساری کی ساری ترقی مغربی پاکستان کے سرمایہ اور زیادہ تر یہاں کے تجربہ سے ہوئی۔ مجھے ہر دفعہ مشرقی پاکستان کا دورہ کر کے یہ تاثر ہوتا تھا کہ ہمارے یہ بھائی خود کام کرنا نہیں چاہتے اور دوسروں کے کیے کو ناپسند کرتے ہیں۔

بنگالی ہندو چونکہ کئی طرح مسلم لیڈروں کو چھپائے ہوئے تھے۔ اُن کے زیر اثر پہلی غلطی جو خواجہ ناظم الدین مرحوم صاحب سے کرائی گئی وہ بنگالی کو اُردو کے ساتھ (جس کو قائدِ اعظم خود سارے پاکستان کی واحد قومی زبان قرار دے چکے تھے اور مشرقی پاکستانیوں سے اس فیصلہ کی منظوری لے چکے تھے) دوسری قومی زبان قرار دیا۔

اس کے بعد جو قدم اٹھا وہ ایک دوسرے کو دُور تر لے جانے کا باعث بنا۔ حتّٰے کہ شیخ مجیب کے ۶ نکات منظرِ عام پر آگئے۔ جن کی مغربی پاکستان میں سخت مخالفت ہوئی جس کے نتیجے میں اُدھر ان پر شدت سے اصرار بڑھ گیا۔

اگر اس وقت کوئی ملکی سطح کا مدبّر ہوتا تو حالات سُدھر سکتے تھے لیکن بدقسمتی سے اس وقت مغربی پاکستان کے ہر سیاسی لیڈر نے مشرقی پاکستان کے راہنماؤں کی ہاں میں ہاں ملانی شروع کر دی کہ مشرقی پاکستان کے ساتھ سخت ناانصافی ہوئی ہے۔ ان کا استحصال ہوا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میری رائے میں یہ بات بالکل غلط ہے کہ مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستانیوں کو پسماندگی

کی حالت میں رکھا اور ان کی ترقی کی طرف پوری توجہ نہیں دی اور کہ ان کی شکایات جائز ہیں۔
یہ تاثر حالات کو بگاڑنے کا باعث ہوا بہتری تو نہ ہوئی۔ ہر کوئی اپنی مقبولیت کے حاصل کرنے میں غلطاں تھا۔ مطالبات بڑھا چڑھا کر پیش کیے جانے لگے کہ اس سے ہر دلعزیزی بڑھے گی۔

اتنے میں فوجی کارروائی شروع ہو گئی جس کی داستان سب کے سامنے ہے۔ ہندو کی سازش، اپنوں کی غداری، ہماری غلط پالیسی، الزامات کی روک تھام کرنے سے غفلت۔ غرضکہ ہر لحاظ سے معاملہ بگڑتا چلا گیا۔ تا آنکہ ایک سُوپر طاقت کے سایہ میں بھارت نے اپنی گھناؤنی سکیم پُوری کر کے کھلم کھلا جارحیت سے مشرقی پاکستان کو ہم سے جبراً الگ کرا دیا اور اب اسے بھارت کی نوآبادی بنا رہا ہے۔

اس عمل سے دو قومی نظریہ ختم نہیں ہوتا۔ پاکستان جس بنیاد پر بنا تھا وہ اب بھی قائم ہے ہندو مُسلمان اب بھی دو مختلف قومیں ہیں۔ ان کے علیحٰدہ علیحٰدہ وطن ہونے چاہئیں۔ یہ ایک متحدہ بھارت میں نہیں رہ سکتے۔ روز بروز اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ اب بنگلہ دیش والے اپنی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں۔ ہندو مارواڑی انھیں بُری طرح لُوٹ رہا ہے۔ بھارت ان کا ایسا استحصال کر رہا ہے کہ ہر شخص نالاں ہے شیخ مجیب کی ناؤ ڈانواں ڈول ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مشرقی پاکستانی بھائیوں کو اصل حالات سے کما حقہٗ آگاہ کر کے ان کو راہ راست پر لائیں۔ مجھے یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن وہ پھر کسی نہ کسی صورت میں ہمارے قریب تر آجائیں گے۔ ضرورت صرف سوچنے اور کام کرنے کی ہے۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں پاکستان میں پہلا مارشل لا لگا۔ ایک سپیشل فوجی عدالت کے سامنے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور ان کے رفقاء پر قادیانی مسئلہ پر ایک رسالہ جماعت اسلامی نے چھپوایا تھا) مقدمہ چلا۔ میں مولانا اور ان کے رفقاء کا وکیل تھا اور دوران وکالت میں نے دیکھا کہ مولانا بہت عظیم ہستی ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر پختہ یقین رکھنے والے، ایمان والے، صبر والے اور حوصلہ والے

میرے دل میں ان کی عزت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی اور مجھے اس بات کا جائز فخر ہے کہ میں اس بزرگ عالمِ دین کی تھوڑی سی خدمت کر سکا۔

مقدمہ کا فیصلہ حسبِ توقع نکلا۔ مولانا کے لیے سزائے موت اور رُفقاء کے لیے مختلف میعادیں جیل میں گزارنے کی سزائیں۔ بعد میں مولانا کی سزا غالباً تین سال رہ گئی اور کچھ عرصہ بعد ہی رہائی ہو گئی۔

فسادات پنجاب (جن کی وجہ سے مارشل لا نافذ ہوا تھا) کی تحقیقات کے لیے ایک خصوصی عدالت مسٹر جسٹس محمد منیر سابق چیف جسٹس پنجاب ہائی کورٹ اور مسٹر جسٹس کیانی (مرحوم) سابق جج ہائی کورٹ پر مشتمل قائم ہوئی۔ مجھے پنجاب گورنمنٹ نے بھاری فیس پر اپنا سینئر وکیل مقرر کرنا چاہا۔ مسٹر آر جیسن لا سیکرٹری (جو بعد میں مسٹر جسٹس آر جیسن جج ہائیکورٹ ہوئے) خود پنجاب گورنمنٹ کی پیش کش لے کر میرے ہاں تشریف لائے۔ لیکن میں نے نسبتاً نہایت قلیل معاوضہ پر (جو بعد میں وہ بھی نہ لیا) جماعت اسلامی کا وکیل بننے کو ترجیح دی اور پنجاب گورنمنٹ کی بھاری رقم نامنظور کر دی۔

اس تحقیقاتی کمیٹی (جس کا نام PUNJAB DISTURBANCE ENQUIRY COMMITTEE تھا) کی رپورٹ جو عرفِ عام میں منیر رپورٹ کے نام سے مشہور ہے، شائع ہو چکی ہے اور قادیانی مسئلہ پر جو فسادات اس وقت رُونما ہوئے اُس کا عدالتی جائزہ ہے جو اس لحاظ سے بھی قابلِ مُطالعہ ہے کہ اس سے کچھ روشنی اس وقت کی سیاست پر بھی پڑتی ہے۔

اس انکوائری میں خواجہ ناظم الدین مرحوم سابق وزیر اعظم بھی بطورِ گواہ پیش ہوئے اور چند دن لاہور میں قیام کیا۔ اس دوران مجھے ایک فریق کے قانونی پیروکار نے (جو آجکل مملکت کے ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں) پیغام دیا کہ خواجہ صاحب مجھے ملنا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی خواہش کا اظہار خواجہ صاحب نے کراچی میں بھی کیا تھا جب میں BASIC PRINCIPLES COMMITTEE کمیٹی کے اجلاسوں کے واسطے وہاں تھا لیکن میں

نے وہاں بھی معذوری کا اظہار کیا اور اب بھی جب ایک نہایت محترم دوست کی معرفت پیغام ملا تو پھر بھی میں نے معذرت چاہی۔ آخر ان کے اصرار پر میں راضی ہو گیا۔ خواجہ صاحب مرحوم کو ٹیلی فون کیا کہ وہ تکلیف نہ فرمائیں میں خود اُن کے ہوٹل میں حاضر ہو جاؤں گا۔ انھوں نے اصرار کیا کہ وہ خود آنا چاہتے ہیں۔ گھر کا پتہ بتا دو ٹیکسی پر آجاؤں گا۔ میں نے کہا یہ تو نہیں ہو سکتا کہ آپ ٹیکسی پر آئیں۔ میں کار بھیج دوں گا۔ آپ دن اور وقت مقرر فرما دیں تا کہ میں چند احباب کو بھی آپ سے ملنے کے لیے بلا سکوں۔ انھوں نے یہ تاکید کی کہ وہ اکیلے ملنا چاہتے ہیں۔
چنانچہ ان کے اصرار پر میں نے ان کے اعزاز میں کسی دوست کو نہ بلایا۔ اپنی کار بھیجی۔ وہ تشریف لائے اور کوئی ایک گھنٹہ ٹھہرے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ خواجہ صاحب مرحوم نے ہی مجھے نئی وزارت میں نہیں لیا تھا اور سفارت کی پیش کش کی تھی۔ غالباً انھوں نے محسوس کیا کہ ان کا یہ فیصلہ دُرست نہیں تھا۔ بہرحال میں ان کے اخلاق کا قائل ہو گیا۔ گلہ تو پہلے بھی نہ تھا اور اب تو ان کے تشریف لانے کے بعد گلہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ نہایت نیک دل انسان تھے۔
۲۴ ستمبر ۱۹۵۴ء کو مسٹر غلام محمد گورنر جنرل پاکستان نے دستور ساز اسمبلی کو موقوف کر دیا۔ میں بھی اس کا ممبر تھا۔ ملک میں سخت ہیجان پیدا ہو گیا۔ لوگ ششدر رہ گئے کہ ایک فردِ واحد قوم کی منتخب اعلیٰ مجلس کو کس طرح بیک جنبشِ قلم برطرف کر سکتا ہے۔ یہ تو کھلم کھلا آمریت کا مظاہرہ ہے۔ اس سے ملک میں جمہوریت ختم ہو جائے گی۔ پبلک کے اصرار پر مولوی تمیز الدین خاں مرحوم صدر اسمبلی نے عدالتِ عالیہ کے سامنے اس حکم کو چیلنج کیا۔ کورٹ نے کثرتِ رائے سے گورنر جنرل کے فیصلے کی توثیق کی۔ صرف ایک جج مسٹر جسٹس کارنیلیس نے باقی جج صاحبان سے اتفاق نہ کیا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۵ء کا ہے۔ میں نے اسی مقدمہ میں یعنی مولوی تمیز الدین خاں کی طرف سے پیروی کی۔ گورنمنٹ کے موقف کے خلاف بحث میں حصہ لیا۔
تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ پاکستان کی سیاست نے اس دن سے وہ پلٹا کھایا

ہے کہ ہم روز بروز مشکلات میں گھرتے چلے جارہے ہیں۔ آخر یہ روزِ بد بھی دیکھنا پڑا کہ اپنے مشرقی حصّہ سے محروم ہو گئے اور اب بھی جو کچھ ہو رہا ہے' وہ بھی مسٹر غلام محمد کی ڈگر پر چلنے کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ملک اور قوم پر رحم کرے اور ہمیں یہ توفیق دے کہ ذاتی انا کی خاطر ملک و ملّت کے مفادات قربان نہ کیے جائیں۔

اوائل ۱۹۵۲ء میں میں اپنی گلبرگ والی کوٹھی میں آگیا منٹگمری والی کوٹھی کا نام "بہارِ افشاں" رکھا گیا۔ لیکن موجودہ مکان کا کوئی موزوں نام آج تک پسند نہ آیا۔ اس واسطے اس کا معروف پتہ آج تک ۹۲، گلبرگ ہی رہا۔

یہاں آکر کئی ملکی اور غیر ملکی مہمان ہمارے ہاں قیام کی عزت بخشنے لگے۔

۱۹۵۲ء میں چند عراقی خواتین ہمارے ہاں مہمان ٹھہریں۔ وہ لاہور کی مختلف محفلوں میں شامل ہوئیں اور لوگوں سے ملیں۔ ایک دن کھانے پر تعجب سے پوچھنے لگیں۔ آپ کی کوئی قومی زبان نہیں ہے؛ جیسے ہماری زبان عربی ہے۔ ہم نے کہا کیوں نہیں۔ ہماری قومی زبان اُردو ہے۔ حیران ہو کے بولیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ کسی محفل میں ہم نے اس زبان میں کسی کو گفتگو کرتے نہیں سُنا۔ سب آپس میں بھی انگریزی ہی بولتی تھیں۔ دراصل ان مہمانوں نے یہ بات بہت پتے کی کہی۔ واقعی ہم میں سے اکثر اپنی قومی زبان اُردو میں بات کرنا اپنی کسرِ شان سمجھتے ہیں۔

حال ہی میں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس صاحب نے عدالتِ عالیہ میں اُردو میں بحث کی اجازت دی ہے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ سب انگریزی میں ہی بحث کرتے ہیں اِلّا ماشاءاللہ۔

۱۹۵۴ء میں بالآخر میری اور بعض مخلص احباب کی دن رات کی کوششوں سے پاکستان بار ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا اور اس طرح میری دیرینہ آرزو پوری ہوگئی کہ ملک کے دونوں حصّوں کے قانون دان حضرات مل کر پاکستان میں آئینی اور جمہوری اقدار کی حفاظت کریں۔

میرا موقف یہ تھا (اور ہے) کہ قانون ساز اسمبلیوں (مقننہ) کے باہر طبقۂ وکلا ہی ایسے ماہرین کا طبقہ ہے جو ملک میں آزادی حقوقِ انسانی کا محافظ ہو سکتا ہے۔ بہ وقتِ ضرورت انتظامیہ کی زیادتیوں کے خلاف مؤثر آواز اُٹھا سکتا ہے (LEGISLATURES) مقننہ کو موقع بہ موقع وہ قوانین کے متعلق (EXPERT) ماہرانہ رائے دے سکتا ہے۔ عدلیہ کا وقار قائم رکھنے بلکہ اسے بلند و بالا کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے اور سارے ملک میں نمائندہ جماعت کی حیثیت سے بین الاقوامی (خصوصاً قانونی یا آئینی) مسائل پر اپنی باوقار رائے کا اظہار کر سکتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ جس کام کے لیے میں نے سفارت کے عہدہ کو قبول نہ کیا اور گورنری کے وعدے کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اس کی بنیاد رکھی گئی۔ مسٹر چندریگر مرحوم (سابق وزیرِ اعظم پاکستان) ایسوسی ایشن کے پہلے صدر منتخب ہوئے۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہی (ان کی نئی مصروفیات کے باعث) انھیں مستعفی ہونا پڑا اور مجھے صدر منتخب کیا گیا جو ذمہ داری میں نے کم و بیش پانچ سال نبھائی۔

انٹرنیشنل بار ایسوسی ایشن میں شرکت

INTERNATIONAL BAR ASSOCIATION

۱۹۷۵ء کے وسط میں انٹرنیشنل بار ایسوسی ایشن (بین الاقوامی انجمن وکلاء) کا اجلاس مونٹی کارلو MONTECARLO میں منعقد ہوا۔ یہ اس چھوٹی سی ریاست مناکو (MONACO) کا صدر مقام ہے جو دنیا میں ایک عجوبہ ہے۔ بہرصورت اس کی مشہوری یہ ہے کہ مونٹی کارلو میں دنیا کا سب سے بڑا جوا خانہ ہے جسے اہل فرنگ اپنی اصطلاح میں (نقل کفر کفر نہ باشد۔ نعوذ باللہ) جواریوں کا مکہ کہتے ہیں۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ دنیا بھر کے بڑے بڑے جواری یہاں آکر قسمت آزمائی کرتے ہیں۔ سینکڑوں برباد ہوتے ہیں۔ ہم نے اکثر چہروں پر نحوست چھائی ہوئی دیکھی ہے۔ کچھ اپنے نقصان کے متحمل ہو سکتے ہیں اور کچھ راتوں رات امیر کبیر بن جاتے ہیں۔ ابھی چند ماہ کی بات ہے کہ ایک عرب شہزادے نے اسی جوا خانہ میں چھ کروڑ روپیہ ایک رات میں ہارا۔ لیکن تیل کی دولت نے ماتھے پر شکن نہ آنے دی۔ CASINO جوا خانہ کے عین سامنے سڑک کی دوسری طرف ہوٹل ڈی پیری (HOTEL DEPARIS) ہے جہاں دنیا کے امیر ترین لوگ، بادشاہ یا مشہور حسینیاں قیام کرتی ہیں۔

چونکہ ہماری اب ایک کُل ملکی جماعت بن چکی تھی۔ بین الاقوامی تنظیم وکلاء نے ہمیں بھی (پہلی بار) شمولیت کی دعوت دی۔ چنانچہ میں (حال) جسٹس چودھری محمد یعقوب علی خاں سینئر جج سپریم کورٹ آف پاکستان) اور حال جسٹس چودھری محمد صدیق جج لاہور ہائی کورٹ جو پاکستان

بار ایسوسی ایشن کے سیکرٹری جنرل تھے پاکستان کی طرف سے شامل ہوئے۔ بحیثیت صدر ایسوسی ایشن مجھے مشورہ دیا گیا کہ میں HOTEL DE PARIS میں قیام کروں چنانچہ میں اور میری بیوی وہاں ٹھہرے۔

پانچ دن کی کانفرنس میں پاکستانی وفد نے کافی نمایاں حصّہ لیا اور خدا کا شکر ہے کہ اس طرح پاکستان کا نام بارِ اوّل اقوامِ عالم کی قانون دانوں کی تنظیم میں ایک باوقار درجہ حاصل کر سکا تھا۔

بھارت نے بھی ایک بڑا سرکاری وفد اس کانفرنس میں بھیجا جس نے بھارت کا بہت پروپیگنڈا کیا۔ لیکن ہمارے چھوٹے سے وفد نے بھی ماشاءاللہ دنیا کے قانون سے پاکستان کو روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

واپسی پر میں نے گورنمنٹ کو سارے حالات سے آگاہ کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ قانون دان دنیا کی تنظیموں میں پاکستان کو ضرور شرکت کرنی چاہیے اور گورنمنٹ وکلا کو تمام مراعات دے۔ لیکن افسوس کہ کسی گورنمنٹ نے اس طرف کماحقہٗ توجہ نہ دی۔ جس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بھارت اس میدان میں بھی ہم سے بازی لے گیا۔ پھر بھی پاکستان بار نے حتی المقدور اپنا اہم کردار تسلی بخش طور پر انجام دیا۔

ون یونٹ کی تحریک

۵۴-۱۹۵۳ء میں اس تجویز پر عام بحث شروع ہوئی کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں کو ایک انتظامیہ کے سپرد کر دیا جائے اس تحریک کا نام ون یونٹ ONE UNIT رکھا گیا۔ یہ اس وقت کی ملکی سیاست کا اہم ترین مسئلہ تھا۔

میں ون یونٹ کا زبردست حامی تھا (ساری عمر رہا ہوں اب بھی ہوں) میرا اور میرے ہم خیالوں کا استدلال یہ تھا کہ مشرقی پاکستان کی طرح مغربی پاکستان بن جانے سے ریاست کے امور میں توازن پیدا ہو جائے گا۔ صوبائی، نسلی اور لسانی جھگڑوں سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جائے گی۔ پنجابی، سندھی، پٹھان، بلوچ کی تفریق عملی طور پر مٹ جائے گی۔ آپس میں اتحاد و یگانگت کے جذبات اُبھریں گے اور جس طرح مشرقی پاکستان اپنے مسائل کو ایک ملکی سطح پر دیکھتا ہے اس طرح ہم بھی اپنے مسائل کو ضلعی یا علاقائی رنگ میں نہ دیکھیں گے بلکہ کل مغربی پاکستان کے مفاد کو پیش پیش رکھیں گے۔

ہماری یہ بھی ایک دلیل تھی کہ پاکستان مسلمانوں نے مل کر بنایا ہے۔ بنگالیوں نے یا پنجابیوں نے یا سندھیوں وغیرہ نے اپنے لیے علیحدہ خطے حاصل نہیں کیے۔ درحقیقت یہ مصنوعی حد بندی (پنجاب، سندھ وغیرہ کی) انگریز نے اپنی ذاتی سیاسی مصلحتوں اور اپنے مخصوص مفادات کے واسطے کی ہوئی تھی۔ ورنہ ہم سب مسلمان ہیں اور اب جبکہ پاکستان بن چکا ہے علاقائی تعصبات کا کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا۔ ہاں انتظامی ڈھانچہ ایسا ہونا چاہیے کہ ایک صوبے کو دوسرے پر برتری نہ ہے

بلکہ ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں۔ زبان ایک ہو یعنی اُردو۔ نظریہ ایک ہو یعنی اسلامی، قومیت ایک ہو یعنی پاکستانی' اور اس عظیم نظریہ کے ماتحت اپنے اپنے علاقے کے لوگ ہر میدان میں (اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح) بھرپور کردار ادا کر سکیں۔

ایک دلیل ہماری یہ بھی تھی کہ پاکستان کے مشرقی اور مغربی حصّوں کے متعلق جب بھی بات چیت ہو' ملکی سطح پر ہو۔ یہ درست نہ ہوگا کہ مشرقی حصّہ کا تو ایک واحد نظریہ ہو اور مغربی حصّے کے چار مختلف (یا شاید بعض وقت متضاد نظریات) ہوں۔

غرضیکہ یہ اور اس قسم کے کئی اور دلائل تھے جس کی وجہ سے ہم نے ملک میں ONE UNIT کی زبردست تحریک چلائی جو بالآخر ۱۹۵۵ء میں کامیاب ہوئی اور مغربی پاکستان ایک مشترکہ اور واحد صوبہ کی صورت میں ملکی افق پر ایک حقیقت بن کر نمودار ہُوا۔ ون یونٹ کے مخالفین کا کہنا تھا کہ اس میں کئی انتظامی الجھنیں ہوں گی۔ لاہور کو صدر مقام بنانے سے دُور دراز سے لوگ معمولی معمولی کاموں کے لیے لاہور آئیں گے۔ تکلیف بھی ہو گی۔ خرچ بھی ہو گا۔ اور پھر کام تسلی بخش نہ ہوا تو رقابت بڑھے گی۔ بجائے یگانگت کے کھنچاؤ پیدا ہو گا۔ اس لیے صدسالہ ڈھانچہ کو نہ بدلا جائے۔ یہ حضرات بھول جاتے تھے کہ انگریز نے کئی سال کلکتہ میں بیٹھ کر (جو ملک کا ایک دُور دراز کونہ تھا) سارے ہندوستان کی حکومت کا انتظام کیا اور پھر ۱۹۱۲ء سے ۱۹۴۷ء تک دلی پایۂ تخت رہا۔ جہاں سے مدراس۔ کلکتہ۔ پشاور۔ کراچی وغیرہ اتنے دور تھے کہ اس وقت کے ذرائع مراسلات سے (ہوائی سروسیں تو اس وقت آجکل کی طرح نہ تھیں) کئی دن دہلی پہنچنے میں لگتے تھے۔ آخر لاہور آنے میں (اور خصوصاً جب اچھی سڑکوں، ریلوں اور ہوائی جہاز کی سہولتوں نے سفر نسبتاً آرام دہ اور کم وقتی کر دیا ہے) کوئی خاص تکلیف نہ ہو گی۔

بہرحال جیسا میں نے عرض کیا ۱۹۵۵ء میں مغربی پاکستان کا ایک صُوبہ بن گیا جس کا ایک مشترکہ ہائی کورٹ ہو گیا۔ مشترکہ مقننہ لیجسلیٹو اسمبلی بن گئی۔ مشترکہ وزارت بن گئی اور اس طرح جو بوجھ علیحدہ انتظامیہ' عدلیہ اور مقننہ کے تھے' وہ ختم ہو گئے۔ میں بہ حیثیتِ وکیل کہہ سکتا ہوں کہ عدلیہ کو اس نئے

نظام سے بہت فائدہ ہُوا۔ کراچی' پشاور کے جج صاحبان لاہور آتے تھے۔ یہ وہاں جاتے تھے۔ ملک میں عدلیہ کی ایک ایسی پالیسی وضع ہونے میں کافی مدد ملی شروع ہو گئی اور ملک کے پسماندہ حصّے بھی قانون کی برکتوں سے پوری طرح مالا مال ہونے شروع ہو گئے۔

اس طرح مقننہ میں بھی کل مغربی پاکستان کا مفاد پیشِ نظر رہتا تھا گو علاقائی ضروریات نظرانداز نہیں کی جا سکتی تھیں۔ انتظامیہ میں البتہ شکایتیں پیدا ہوئیں جو مقامی تھیں اور جن کا تدارک ہو سکتا تھا اور جیسا کہ بعد میں عرض کروں گا۔ فضل اکبر کمیشن نے چند مفید تجاویز ۱۹۶۹ء میں پیش بھی کیں۔ مختصراً یہ کہنا درست ہو گا کہ ون یونٹ کے حامی یہ کہتے تھے کہ جو جذبہ پاکستان کی تخلیق کا باعث ہُوا اس کا عکس وحدتِ مغربی پاکستان میں نظر آئے گا۔

مخالفین بظاہر انتظامی مشکلات کی نشان دہی کرتے تھے۔ بہرصورت، دس سال کے بعد ون یونٹ توڑ دیا گیا۔ اس کا ذکر کچھ تفصیل سے بعد میں کروں گا اور اس کے نتائج پر بھی کچھ عرض کروں گا۔

اس وقت میں اُردو زبان کے متعلق کچھ لکھنا چاہتا ہوں کہ ہم اس سے سخت بے رُخی برت رہے ہیں۔ نجی محفلوں میں انگریزی اور نئی پود کا تو یہ حال ہے کہ امّاں۔ ابّو۔ ابّی کے الفاظ غائب۔ اولڈ بوائے اور ڈیڈی اور اولڈ CHAP کی اصطلاحیں زور پکڑتی جا رہی ہیں اور ہمارا نوجوان طبقہ اس طرح انگریزی کی طرف راغب ہے جیسے ان کی نجات بس انگریزی بولنے میں ہی ہے۔

اس میں ان بچاروں کا زیادہ قصور نہیں۔ ہمارا تعلیمی نصاب اور تدریسی نظام ہی ایسا ہے کہ قومی زبان کی اہمیت ہی نہیں رہ جاتی۔ پھر اعلیٰ نوکریاں زیادہ تر انگریزی خوانوں کو ملتی ہیں۔ نئی پود بچاری کدھر جائے۔ جذبۂ قومی کی طرف یا روزی کی جستجو میں!

۲۷ سال سے ہم چیخ رہے ہیں کہ خدا کے واسطے اردو کو دفتری زبان بناؤ۔ بچّوں کو اُردو پڑھاؤ۔ گھروں میں اُردو بولو۔ (ہم اپنے گھر میں اکثر اُردو بولتے ہیں) اور اس قومی زبان کا وقار اتنا بلند کرو کہ اعلیٰ سے اعلیٰ ملازمتیں بھی اردو دانوں کو مل سکیں۔ یہ تو نہ ہُوا۔ کمیونسٹ اور

وطن دشمن طبقہ کی کوششوں سے علاقائی زبانوں پر زیادہ زور دیا جا رہا ہے اور دیدہ دانستہ ایک سوچی سمجھی سکیم کے مطابق قومی زبان کو پس پشت ڈالا جا رہا ہے۔ حکومت اس سارے معاملہ میں خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ نہ ہم انگریزی دان بن سکیں گے اور نہ اپنی قومی زبان اردو کے بے پناہ ذخیرہ سے فائدہ اٹھا سکیں گے۔

نہ خدا ہی ملا' نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے' نہ اُدھر کے رہے

۱۹۵۴ء میں انٹرنیشنل بار کانفرنس جو زیادہ تر امریکنوں کی کوششوں سے قائم ہوئی تھی' کے اجلاس مونٹی کارلو MONTECARLO میں شمولیت کے بعد بین الاقوامی مغربی (خصوصاً' امریکی قانون دانوں کی برادری سے تعلقات کافی حد تک براہِ راست قائم ہو گئے اور اس طرح پاکستان کو پہلی بار اس برادری سے روشناس کرایا گیا۔ اس سے پہلے جولائی ۱۹۵۳ء میں جسٹس رابرٹ سمنز اور مسز سمنز جو پاکستان کے دورے پر آئے' ہمارے ہاں مہمان ٹھہرے۔ جسٹس سمنز براسکا NEBRASKA کی امریکی ریاست کے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس تھے جن کا درجہ ہمارے ہائی کورٹوں کے چیف جسٹس کے برابر ہوتا ہے۔ امریکہ کی ہر ریاست میں ایک سپریم کورٹ ہوتی ہے۔ اور ایک سپریم کورٹ سارے وفاق کی یعنی کُل امریکہ کی واشنگٹن میں ہوتی ہے اور یہ مملکت کی سب سے اعلیٰ اور ارفع عدالت ہوتی ہے۔ جسٹس سمنز اور مسز تین چار روز ہمارے ہاں رہے۔ بہت گھُل مل گئے۔ امریکہ اور پاکستان کے متعلق کھُل کر باتیں ہوتی رہیں۔

ایک سبق آموز بات انھوں نے سُنائی۔

کہنے لگے: جب میں نے پاکستان جانے کا ارادہ کیا' تو میرے کئی ملنے والوں نے کہا کہ ایسے پس ماندہ غیر مہذب لوگوں کو ملنے کیوں جا رہے ہو؟ جب میں نے انھیں بتایا کہ اب تو میں پروگرام طے کر چکا ہوں اور یقیناً جا رہا ہوں۔ کیونکہ آپ کے شبہات محض بے بنیاد ہیں۔ تو جہاز پر سوار ہونے سے کچھ وقت پہلے میرے چند ایک خاص احباب نے علیحدگی میں مجھ سے کہا

کہ تم جا رہے ہو لیکن بھرا ہوا پستول ہمیشہ اپنے پاس رکھنا۔

میں نے اس واقعہ کا تفصیلی ذکر اس واسطے کیا ہے کہ شروع سے پاکستان کے خلاف معاندانہ پروپیگنڈا بڑے منظّم طریقے سے ہو رہا ہے اور ہماری طرف سے کوئی مُثبت قدم نہیں اٹھایا گیا جس سے غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکے۔ ہمارے سفارت خانوں کے متعلق عام تاثر یہی ہے کہ وہ ملکی خدمت کرنے کی بجائے "ذاتی خدمت" پر توجہ دیتے ہیں۔
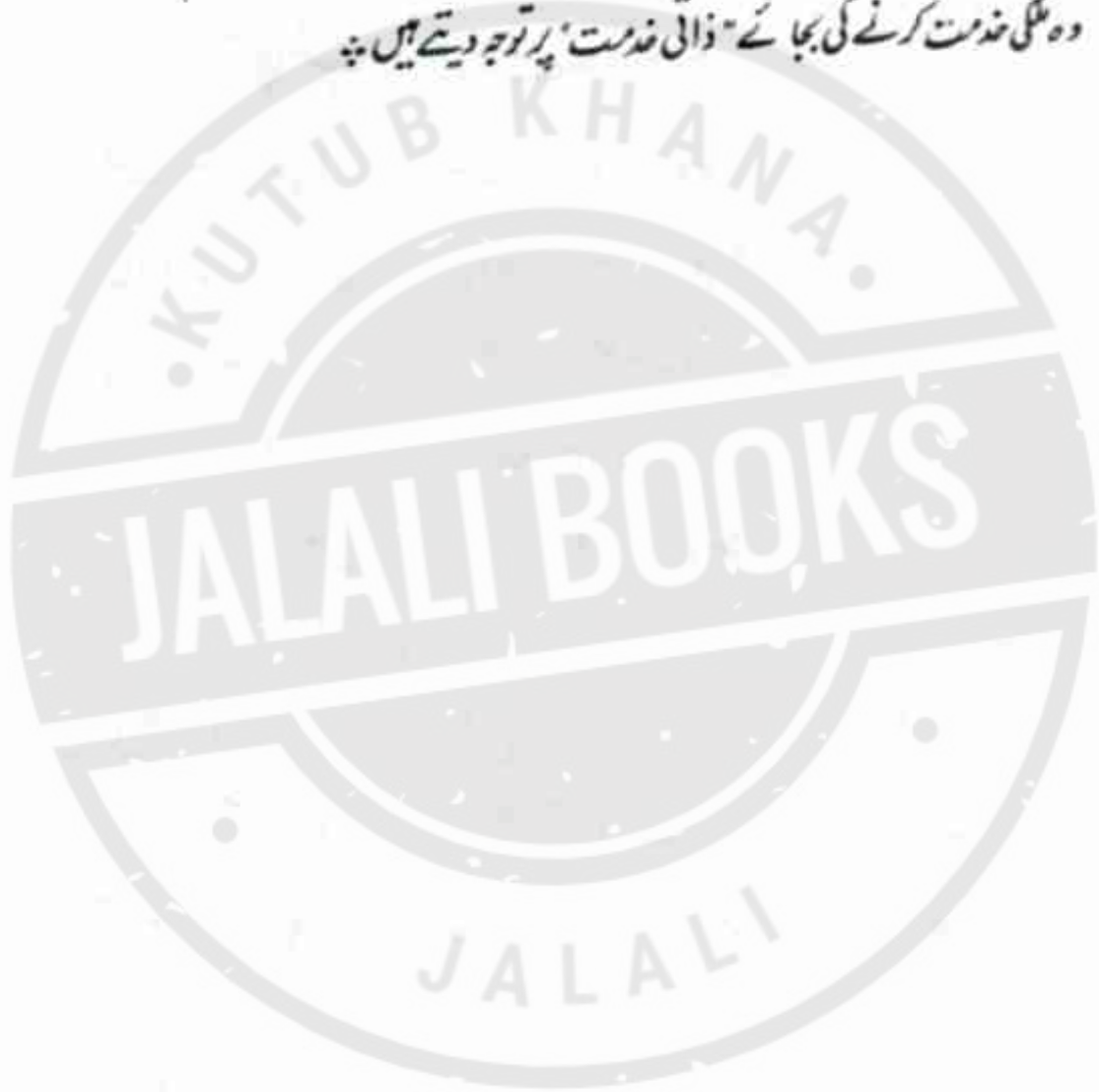
دورۂ امریکا

منجانب امریکن سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ

۱۹۵۶ء میں امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ (STATE DEPARTMENT) (وزارت خارجہ) کی طرف سے امریکہ کا سرکاری دورہ کرنے کی دعوت موصول ہوئی۔ میں امریکی گورنمنٹ کا مہمان تھا۔ میری بیوی میرے ساتھ گئیں، وہ میری مہمان تھیں۔ درحقیقت مجھے ان کے بغیر باہر جانے کا لطف نہیں آتا۔ دونوں مل کر تبادلۂ خیال کرتے رہتے ہیں تو بہت اچھا وقت کٹتا ہے۔ خرچ تو ہزاروں روپے کا ہوتا ہے۔ لیکن رفیقۂ حیات اگر حقیقی طور پر رفیقۂ حیات نہ ہو تو پھر زندگی کا کیا لطف۔ ہم دونوں تیار ہوئے۔ مجھے تو دعوت بہ حیثیت پاکستان بار ایسوسی ایشن کے صدر کے موصول ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ جسٹس ایس اے رحمان صاحب کو بھی بطورِ جج دعوت آئی۔ وہ اس وقت مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے۔ میرے ان کے تعلقات بھائیوں کے سے تھے۔ ہم نے طے کیا کہ اکٹھے جائیں گے اور اکٹھے ہی امریکہ کا دورہ کر کے اپنے مشاہدات اور تاثرات وضع کریں گے۔

وہ سیدھے لندن گئے۔ ہمیں پہلے ڈنمارک (کوپن ہیگن) جانا تھا۔ جہاں ہمارے پوتا پوتی رہتے ہیں۔ کوپن ہیگن میں ۹ عجائب گھر ہیں۔ نیشنل میوزیم کے مشرقی حصّہ کو ہم تین گھنٹہ میں دیکھ سکے۔ ایک لباس "افغانی" کے لیبل کی الماری میں تھا ہم نے CURATOR صاحب کو کہا کہ پاکستانی لباس کی نمائش ہونی چاہیے۔ انھوں نے بخوشی قبول کیا۔ میری بیوی نے اپنا ایک پُورا جوڑا عجائب گھر کو تحفہ دیا۔ ایک بیش قیمت نسخہ قرآن مجید کا پاکستان سے بھیجا۔ یہ اشیاً

کوپن ہیگن کے عجائب گھر میں اب بھی موجود ہیں۔

اس کے بعد آسلو (ناروے) میں انٹرنیشنل بار ایسوسی ایشن INTERNATIONAL BAR ASSOCIATION کے دوسرے سالانہ اجلاس میں شرکت کرنی تھی۔

کوپن ہیگن میں جو بات خاص طور پر قابلِ ذکر دیکھی وہ یہ تھی کہ شاہی خاندان کے افراد (شہزادیاں بھی) بغیر کسی خاص گارڈ یا حفاظتی اقدام کے عام شہریوں کی طرح پھرتے تھے۔ لوگ ان کا احترام کرتے تھے۔ لیکن نہ کوئی گن مین (GUNMAN) ہوتا تھا نہ موٹروں کے ساتھ حفاظتی دستوں کی بھرمار۔ جیسے اپنے وطن میں دستور ہو چکا ہے اور اب تو یہ رواج اپنے ہاں اتنا عام ہو چکا ہے کہ معمولی سے معمولی "حاکم" مغلیہ دور کے پنج ہزاری درباریوں سے کم نہیں۔

اس غریب ملک میں جس کا آدھا حصہ کٹ چکا ہے اور باقی مشکلات میں گھرا ہوا ہے، جاہ و جلال دکھانے کے لیے جو روپیہ بلا وجہ اور بے دریغ خرچ کیا جاتا ہے اسے دیکھ کر دکھ ہوتا ہے۔ اگر ان ظاہرداریوں کی بجائے ہم ملکی دفاع اور حقیقی ترقی پر روپیہ خرچ کرتے تو ہماری حالت بہت بہتر ہوتی۔

ویسے تو کوپن ہیگن (ڈنمارک) کئی لحاظ سے قابلِ دید ہے لیکن ایک روایت وہاں کی ایسی ہے جس کا بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

یہ تو آپ کو علم ہے کہ ڈنمارک میں بادشاہت ہے۔ وہاں پارلیمنٹ بھی ہے، اس کے کیفے ٹیریا (CAFETERIA) میں جہاں تمام وزرا اور ممبرانِ پارلیمنٹ ہر روز جمع ہوتے ہیں، گورنمنٹ کے حکم سے تمام اخباروں میں جو کارٹون (خواہ گورنمنٹ کے خلاف بھی ہوں) دیواروں پر آویزاں کیے جاتے ہیں تاکہ وزرا، ممبران اور حکام کو اس بات سے آگاہی ہو کہ ان کے فیصلوں کے متعلق رائے عامہ کا کیا رُخ ہے۔

یہ کچھ تو بادشاہت میں روا ہے۔ لیکن پاکستان جیسے (ماشاء اللہ) جمہوری اور اسلامی ملک میں شروع سے کچھ عجیب رسم پڑی ہے کہ مخالف رائے کوئی سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہے۔

حزبِ اختلاف کو اکثر غدّار اور دشمنِ ملک کے خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ حکومتِ وقت عقلِ کُل کا دعویٰ کرتی ہے، باقی اہلِ ملک گویا کچھ جانتے ہی نہیں۔ اس لیے ان کی کوئی شنوائی ہی نہیں ہوتی۔ اور اب تو نوبت بہ اینجا رسید، کہ جمہوریت کے بلند بانگ دعووں کے ساتھ ساتھ اکثر وقت ملک میں دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری لگا دی جاتی ہے۔ حزبِ مخالف کے جلسے نہیں ہونے دیئے جاتے۔ اخبارات کوئی مخالفِ حکومت بات لکھ ہی نہیں سکتے۔ حضرتِ اکبر کے شعر اس حالت کے متعلق رہ رہ کر یاد آتے ہیں:

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں، ہر موڑ پر اک لائسنس طلب
اس پارک میں آخر اے اکبر ہم نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا

یہی وجہ ہے کہ اکثر اہلِ دل حالاتِ حاضرہ پر ان کا یہ شعر پڑھ کر دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں،

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

ڈنمارک سے آسلو (ناروے) پہنچے۔ یہاں بین الاقوامی قانونی کانفرنس کا دوسرا اجلاس منعقد ہو رہا تھا۔ میں نے اس خیال سے کہ ملک کے دونوں حصّے اس کانفرنس میں شامل ہوں، مشرقی پاکستان کی ڈھاکہ بار کو لکھا کہ وہ کم از کم دو نمائندے اس کانفرنس میں بھیجیں۔ تاکہ پاکستان کی شمولیت کل ملکی سطح پر ہو جائے۔ وہاں سے جواب آیا کہ ہمارے پاس توکرایہ کے لیے پیسے نہیں۔ میں نے ایشیا فاؤنڈیشن ASIA FOUNDATION جس سے میرے اچھے مراسم تھے، سے گیارہ ہزار روپے کے دو واپسی ٹکٹ دو نمائندگان کے لیے ڈھاکہ تا آسلو (OSLO) بھیجے۔ وہ صاحبان آسلو تو ضرور پہنچے لیکن افسوس کہ کانفرنس کی کارروائی میں کوئی نمایاں حصّہ نہ لیا جبکہ ان کی شرکت بھی برائے نام تھی۔ مشرقی پاکستان کے بھائیوں کی یہ اُفتادیں نے اس وقت بھی دیکھی تھی جب میں بطورِ وزیر وہاں جایا کرتا تھا۔ مطالبات ان کے بہت ہوتے تھے لیکن اپنی طرف سے

وہ کام کرنے پر راغب کم ہوتے تھے۔ شکایات زیادہ اور اپنی طرف سے ان شکایات کو دور کرنے میں بالکل دلچسپی نہیں۔ ان کی یہی عادت بالآخر مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنا کر رہی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ وہ اب یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ع آغاز سے بدتر ہوا انجام ہمارا

آسلو کانفرنس کے موقع پر ناروے کے اخبارات نے میری تصویر اور انٹرویو چھاپے۔ مجھے کانفرنس کا وائس پریذیڈنٹ منتخب کیا گیا اور خدا کا شکر ہے کہ میں پھر یہ کہہ سکتا ہوں کہ پاکستان نے اپنی بساط کے مطابق قابلِ قدر کردار ادا کیا۔ میرے پرانے ساتھی (حال، مسٹر جسٹس چودھری محمد صدیق (جو ہماری سیکرٹری جنرل تھے،) نے بہت نمایاں کام کیا اور پاکستان کا نام خوب روشن کیا ماشاءاللہ۔

آسلو میں بڑے عجائبات دیکھے۔ مسٹر نوبل کا گھر دیکھا جن کی جائیداد سے ہر سال نوبل پرائز دیا جاتا ہے۔ انہوں نے بھک سے اُڑ جانے والا مادہ دریافت کیا جس کی آمدنی سے لاکھوں روپے ہر سال علم و ادب، امن و امان، انسانی خدمت کے سلسلے میں دنیا میں تقسیم کیے جاتے ہیں KATIK دیکھی جس پر THOR HYERDALE اور ان کے چار ساتھیوں نے لکڑیوں کی ایک ۸ × ۲۵ فٹ RAFT پر ساحل پیرو (PERU) سے ساحل انڈونیشیا تک قریباً چار ہزار میل سمندری سفر کیا تھا۔ یہ قیاس ثابت کرنے کے واسطے کہ POLYNESIAN قوم (جو انڈونیشیا میں آباد ہے) اصلاً جنوبی امریکہ سے آئی تھی۔ ناروے کی نرالی رات دیکھی۔ رات ۱۱ بجے تک ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا شام ہونے والی ہے اور بہت سے نوادر بھی دیکھے لیکن جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا (اور جو اپنے وطن میں مفقود ہے) وہ وہاں کے حاکم اعلیٰ کی سادہ زندگی تھی۔ ناروے کے بادشاہ KING HAA KON بوڑھے گر قد آور تھے۔ ان کے متعلق پڑھا کہ بس میں سفر کر رہے تھے۔ ایک سٹاپ پر ایک معمر خاتون اپنا بیگ اٹھانے میں دقت محسوس کر رہی تھی۔ ایک لمبے بوڑھے آدمی نے اس کی مدد کی۔ بیگ فٹ پاتھ پر رکھا۔ اتفاق سے وہ جگہ بجلی کے کھمبے کے نیچے تھی۔ بڑے میاں بھاری بیگ زمین پر

رکھ کر سیدھے کھڑے ہوئے تو خاتون کی نظر ان کے چہرے پر پڑی۔ کسی قدر حیرت سے کہنے لگیں "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے کہیں دیکھا ہے"۔ بڑے میاں کہنے لگے "ہو سکتا ہے آپ نے میری تصویر دیکھی ہو۔ میں ناروے کا بادشاہ ہاکن ہوں"۔

KING HAA KON اعزازی فوجی افسر بھی تھے۔ جب فوجیوں کے لیے رعایتی ٹکٹ پر سینما شو ہوتا تھا تو وہ فوجی وردی پہن کر رعایت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

ان کا خوب صورت محل ایک دلکشا پہاڑی پر واقع ہے۔ محل کے گرد کوئی دیوار نہیں، کوئی جنگلہ نہیں، صرف ایک نمائشی لوہے کا گیٹ ہے جس پر ایک نمائشی سپاہی کھڑا رہتا ہے۔ پہاڑی پر ہر کوئی جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ آپ ملکہ کی خواب گاہ کے عین نیچے پکنک (PICNIC) منانا چاہیں تو منا سکتے ہیں (یہ علیحدہ بات ہے کہ یہ خیال کسی کے دل میں آتا ہی نہیں) اور ہر شخص احتراماً پہاڑی کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ وہاں بادشاہت کی لوگ دل سے عزت کرتے ہیں۔

اور یہاں!!

یہاں ہر چھوٹے سے چھوٹا حاکم بھی اب بغیر جھنڈے والی کار اور خاص پہرہ داروں کے جھرمٹ کے سوائے باہر نکلنا کسرِ شان سمجھتا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں اس کی کتنی عزت ہے اس کا حال خدا جانے۔

آسلو سے لندن گئے۔ وہاں سے امریکہ جانا تھا۔ تین چار دن لندن قیام کیا۔ مرحوم لے۔ ڈی انگھر اب ہمارے ہائی کمشنر کے فنانشل ایڈوائزر تھے۔ ان کی رفاقت میں بہت پُرلطف وقت گزرا۔ اظہر مرحوم ایک نہایت زندہ دل انسان تھے۔ بذلہ سنج، لطیفہ گو اور لطف یہ کہ پنجابی، اردو، انگریزی کے بیسیوں لطیفے نوک بر زبان تھے۔ جنھیں بیان کرتے وقت میر باقر علی داستان گو کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی تھی۔ یہ ہنسنے ہنسانے والا، پاکستان کا شیدائی آج آسودۂ خاک ہے اللہ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ آمین۔ ❊

پہلا سفرِ امریکا

۸؍ جولائی ۱۹۵۶ء کو ہم دونوں اور جسٹس رحمٰن صاحب لندن سے نیویارک روانہ ہوئے۔ مہمان تو ہم امریکی حکومت کے تھے لیکن بہ کمالِ نوازش ہمارے سفارت خانہ نے نیویارک میں ہمارے سہ روزہ قیام کا اہتمام اپنے ذمّہ لیا اور ہمیں ایک ایسے ہوٹل میں ٹھہرایا جو نہایت تکلیف دِہ اور نامعقول تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ ہمارے سفارتی حلقوں میں یہ ہوٹل اس لیے مقبول ہے کہ اس کے عین نیچے مشہور نائٹ کلب کوپاکبانا (COPACABONA) واقع ہے۔ ہمیں چونکہ اس کلب کے اشغال سے دلچسپی نہ تھی، ہم نے جُوں تُوں کرکے دن کاٹے اور نیویارک کی سیر کی۔ پھر ریل سے واشنگٹن روانہ ہوئے کہ علاقہ دیکھتے جائیں گے۔ سب سے زیادہ متحیّر جس چیز نے کیا وہ کاروں کی بہتات تھی۔ سڑکوں پر کاریں، کارخانوں کے باہر کاریں اور پُرانی خراب شدہ کاروں کے DUMP ڈھیروں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ واشنگٹن میں اس زمانہ میں ہمارے سفیر مسٹر محمد علی بوگرہ مرحوم تھے۔ ان کو چند ماہ پہلے دل کا دورہ پڑا تھا۔ ہمیں چائے پر بُلایا ہُوا تھا۔ ہم نے پاکستان کا حال پوچھا۔ بڑی خوشی سے کہنے لگے کہ چودھری محمد علی موجودہ وزیر اعظم کے برخلاف ایک بڑی پارٹی بن رہی ہے آپ کو معلوم نہیں؟ ہم نے کہا کہ ہم نے تو چند دن سے کوئی پاکستانی اخبار نہیں دیکھا۔ وہ باوجود گزشتہ بیماری کے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر DAWN اخبار کا پرچہ لائے جس میں یہ خبر درج تھی۔ وہ مزے لے لے کر انھوں نے ساری ہمیں سُنائی۔ ہمیں ان کی یہ حرکت کچھ پسند نہ آئی۔ بہر حال وہ پاکستان کے سفیر تھے اور اپنے

ہی وزیر اعظم کے متعلق ان کا رویہ کچھ زیادہ پسندیدہ ہونا چاہیے تھا۔ پھر ہم دونوں کے سامنے پہلی بات ہی مزے لے لے کر یہی کرتی کہ وزیر اعظم کا پتہ کٹ رہا ہے، کچھ زیب نہ دیتا تھا۔ ہمیں بے حد افسوس ہُوا کہ مملکت دولت خداداد پاکستان تو بن گئی۔ لیکن اس کو چلانے اور نکھارنے کا اسلوب ہمیں نہ آیا۔ حفظِ مراتب کا سبق اتنی آسانی سے ہم نے بھلا دیا کہ اس کے کئی تلخ نتائج ہمیں آج تک بھگتنے پڑ رہے ہیں۔

امریکہ میں ہم کل ۲ ماہ ۱۴ دن رہے اور ۱۴ ریاستوں کا دورہ کیا DALLAS ٹیکساس میں امریکن بار ایسوسی ایشن کا سالانہ جلسہ تھا۔ جہاں ہمارے پرانے دوست رابرٹ ڈی سٹوری اور ان کی اہلیہ جو ۱۹۵۵ء میں ہمارے ہاں لاہور ہمارے مہمان ٹھہرے تھے، بڑے تپاک سے ملے۔ ڈاکٹر سٹوری SOUTH WESTERN METHODIST UNIVERSITY کے DEAN اور صدر تھے۔ اور امریکی وکلاء میں انھیں بہت بلند مقام حاصل تھا۔ ڈلاس DALLAS میں ہی مجھے امریکن بار فاؤنڈیشن کو خطاب کرنے کا موقع ملا جو ایک بہت بڑا اعزاز تھا اور بھی بہت سے وکلاء کے اجتماعات سے خطاب کیا۔ اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ پہلی بار پاکستان کا تعارف امریکی وکلاء سے اس اُونچی اور وسیع سطح پر کرایا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ مجھے امریکن بار ایسوسی ایشن کا اعزازی ممبر بھی بنایا گیا۔ یہ اعزاز آج تک قائم ہے، اور میں غالباً اکیلا پاکستانی ہوں جو آج تک یہ اعزاز حاصل کر سکا ہے۔ ہمیں ڈالس شہر کا بھی اعزازی شہری بنایا گیا۔ امریکہ کو "مواقع کا مُلک" LAND OF OPPORTUNITIES پایا۔ جس کے پاس کوئی نیا خیال ہے یا دوسروں سے بڑھ کر کام کرنے کی صلاحیت ہے، اس کے لیے ترقی کا میدان لامحدود ہے۔ جمہوریت کی جیتی جاگتی مُنہ بولتی تصویر امریکہ میں قدم قدم پر دیکھی۔

ریاست نبراسکا (NABRASKA) (جہاں کے چیف جسٹس مسٹر سمنز اور ان کی اہلیہ لاہور میں ہمارے مہمان رہ چکے تھے۔ اور جن کے گھر اب ہم لنکن (صدر مقام ریاست) میں مہمان ٹھہرے ہُوئے تھے) کے گورنر نے ہم تینوں کو ریاست کا اعزازی شہری بنایا۔ سُنا ہوا تھا

AMERICAN ARE A CRAZY PEOPLE ان کی اکثر باتیں نرالی ہیں۔ ہمیں اعزازِ ریاست اس طرح دیا کہ ریاستی مُہر اور گورنر کے دستخطوں سے ہم تینوں کو نبراسکا کی "شاندار بحریہ" کا ایڈمرل ADMIRAL بنایا گیا۔ یاد رہے کہ ریاست نبراسکا اندرونِ ملک اس جگہ واقع ہے کہ اس کے قریب کوئی سمندر چھوڑ جھیل بھی نہیں ہے، وہاں کی بحریہ کا ایڈمرل بنانا۔ یقیناً امریکی دفاع کی اختراع تھی۔ جب سمندری جہاز نہیں تو ایر البحر بنانا۔ کیا معنی!

تقریب کے ضابطہ کے مُطابق گورنر کے دفتر میں ہمیں تینوں کو سرٹیفکیٹ دے دیئے گئے۔ اس کے بعد کافی کے پیالے پیتے ہوئے میں نے مسٹر اینڈرسن جو اس وقت نبراسکا کے گورنر تھے، کو ایک لطیفہ سُنایا جو میری رائے میں حسبِ حال تھا۔

ایک وقت انگلستان میں کھانے پینے کی چیزوں کی سخت قلت تھی۔ قریباً قریباً قحط کی سی حالت تھی۔

لندن میں ایک استقبالیہ میں سوئیٹزرلینڈ کا ایک مہمان بھی موجود تھا۔ کسی انگریز نے پوچھا جناب سوئیٹزرلینڈ میں کیا کرتے ہیں؟ اس سوس (SWISS) نے بڑے فخریہ انداز میں تن کر کہا "میں سوئیٹزرلینڈ کی عظیم الشان بحریہ کا ایڈمرل ہوں"۔ انگریز بولا۔ معاف کیجیے گا۔ سوئیٹزرلینڈ میں تو کوئی سمندر ہی نہیں، نہ بحریہ ہے۔ پھر ایڈمرل کا کیا مطلب؟

سوس نے فوراً جواب دیا۔ تو پھر کیا ہُوا۔ آپ کے انگلستان میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ملتا لیکن آپ نے بھی تو FOOD MINISTER مقرر کیا ہُوا ہے۔

گورنر اینڈرسن ہمیں یونیورسٹی کلب میں لنچ پر لے جا رہے تھے۔ ہم ان کی لفٹ سے نیچے گئے۔ ہال میں ایک بوسیدہ کپڑوں والا شخص کھڑا تھا۔ گورنر کو دیکھتے ہی کہنے لگا:

HI-GOVERNOR (ہائی، ایک امریکی طریقہ تخاطب کرنے کا ہے) میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ مسٹر اینڈرسن نے گھڑی دیکھتے ہُوئے کہا۔ اب تو میں ان دوستوں کو کھانے پر لے جا رہا ہوں۔ آپ ساڑھے تین بجے اگر مجھے مل سکتے ہیں (چلیے ملاقات کا

وقت مقرر ہو گیا، ان دنوں مغربی پاکستان کے گورنر ہمارے پرانے دوست میاں مشتاق احمد گورمانی تھے۔ میں نے رحمٰن صاحب کو کہا۔ بھائی صاحب! میں نے یا آپ نے اپنے گورنر سے ملنا ہو تو اتنی آسانی سے ملاقات ہو سکتی ہے؟ گورنر کی کار پر کافی مٹی پڑی ہوتی تھی۔ وہ ابھی لمبے دورے سے واپس آئے تھے۔ ان کے ڈرائیور کے پاس پستول تھا اور کوئی حفاظتی دستہ یا سپاہی وغیرہ نہ تھا۔ نہ کار میں کوئی علیحدہ سائرن تھا کہ راہ گیروں کو خبردار کر سکے کہ گورنر بہادر کی کار آ رہی ہے۔ میں نے راستہ میں پوچھا کہ جب آپ صدر مقام سے کسی دوسرے شہر جاتے ہیں تو کیا آپ کے لیے سرکاری رہائش کا انتظام ہوتا ہے؟ کہنے لگے۔ نہیں تو۔ اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کسی نہ کسی ہوٹل میں جگہ مل ہی جاتی ہے۔ میں نے کہا آپ جب باہر جاتے ہیں تو آپ کا استقبال ہوتا ہے؟ وہ اس سوال کو شاید سمجھے نہ تھے' بولے استقبال سے آپ کی کیا مراد ہے؟ میں نے بتایا تو ہنس کر کہنے لگے۔ آج تک اس رسم کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

لنچ پر ایک خوش پوش بیرہ کو گورنر نے ہیلو ڈاکٹر کہا۔ ہاتھ ملایا۔ پھر ہمیں بتایا کہ یہ بھارتی طالب علم ہے P.H.D کی ڈگری حاصل کر کے چھٹیوں میں فالتو وقت میں یہاں کام کرتا ہے۔ امریکہ میں خود اپنے ہاتھ سے کام کرنے میں کسی کو عار نہیں۔ صدر ابراہم لنکن کا لطیفہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا۔

امریکن گورنر اور پاکستانی گورنر کا مقابلہ کرنے سے دل کو سخت دکھ ہوتا ہے۔ یہاں کی جھوٹی شان و شوکت مغلیہ اور انگلش دور کے تکلفات کو بھی مات کر گئی ہے۔

ایک دفعہ اپریل کے مہینے میں میں اور میری بیوی سوات سے بذریعہ کار لاہور واپس آ رہے تھے۔ سارے دن کا سفر، پھر موسم بھی گرم ہو گیا۔ گوجرانوالہ اسٹیشن سے آگے بڑھے تو ٹریفک بند تھا۔ بسوں، ٹرکوں، کاروں، سائیکلوں کا اژدہام تھا۔ نہ معلوم کوئی بڑا حادثہ ہو گیا یا کیا۔ ڈرائیور نے پولیس والے سے پوچھا۔ اس نے کہا، گورنر صاحب ڈسکہ سے روانہ

ہونے والے ہیں (ڈسکہ گوجرانوالہ سے ۱۲ میل دور ہے) وہ گزر جائیں گے تو ٹریفک کھلے گا۔ ہم سخت تھکے ہوئے تھے۔ اِدھر اُدھر ٹرکوں کے ڈیزل کی بدبو نے دماغ پریشان کر رکھا تھا۔ کوئی بیس منٹ بعد خدا خدا کر کے گورنر بہادر کی کار گزری۔ ہم نے شکر کیا کہ اب چلنے کی اجازت مل جائے گی۔ لیکن پولیس والوں نے کہا کہ جب تک گورنر صاحب کی کار کامونکے (۱۲ میل دور) نہیں پہنچ جاتی اس وقت تک ٹریفک بند رکھنے کا حکم ہے۔

پاکستان میں اس قسم کے واقعات اکا دُکا نہیں سینکڑوں کی تعداد میں بیان کیے جا سکتے ہیں۔ دعوٰے ہمارا شروع سے یہ رہا کہ ہم عین اسلامی اور جمہوری مملکت ہیں۔ لیکن عمل ہمارا اس کے خلاف رہا۔ اور اب تو ہمارے قول و فعل میں تضاد کی حد ہو گئی ہے۔

امریکی گورنر ہمیں کھانا کھلانے کے بعد نیچے جانے کے واسطے لفٹ کے قریب (قطار) میں اپنی باری کے انتظار میں کھڑے تھے، کئی لڑکے اور دوسرے لوگ ان کو جانتے تھے لیکن کوئی پروا نہ کرتا تھا۔ میری بیوی شلوار قمیص میں تھیں۔ کسی کو خیال آیا کہ باہر سے کوئی مہمان ہیں۔ انھوں نے ازراہِ کرم ہمیں راستہ دے دیا۔ گورنر صاحب بھی ہمارے ساتھ ہی لفٹ میں آ گئے ہماری وجہ سے۔ محض گورنری کی حیثیت سے تو وہ اب بھی کئی منٹ قطار میں کھڑے رہتے۔

اوکلوہوما (OKLAHOMA) کے گورنر کے ہاں استقبالیہ RECEPTION پر ریاست کے (غالباً) سولسٹر جنرل (SOLICITOR GENERAL) نے بلا تمہید مجھ سے پوچھا WHAT YOUTHINK OF MR. NEHRU SIR (آپ مسٹر نہرو کو کیا سمجھتے ہیں؟)

میں نے بلا آنکھ جھپکے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر فوراً جواب دیا WHAT DO YOU THINK OF AN EEL SIR آپ کی رائے ایل (EEL) (مچھلی) کے متعلق کیا ہے؟

ایل ایک سانپ نما مچھلی ہوتی ہے، دو قسموں کی زہریلی اور غیر زہریلی۔ دونوں میں پہچان مشکل ہے۔ لیکن دونوں میں ایک خصلت مشترک ہوتی ہے۔ دونوں پر ایسا چکنا مادہ قدرت نے لگایا ہوا

ہے۔ آپ سمجھتے ہیں کہ آپ نے پکڑی ہوئی ہے اور وہ دس گز پرے جا رہی ہوتی ہے۔ کسی شخص کو EEL سے تشبیہ دیں تو مفہوم یہی ہوتا ہے۔ پھسلنے والا، دھوکا باز، اس پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔)

جب سوال کرنے والے نے میرا مطلب پا لیا تو بہت جوش سے اپنے ساتھیوں سے کہا:

MR. KHAN THINKS MR. NEHRU IS AN EEL

مسٹر خان کا خیال ہے "مسٹر نہرو ایل کی طرح ہیں" سب نے قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا جناب میں نے ابھی بات ختم نہیں کی تھی MR. NEHRU IS A POISONOUS EEL (مسٹر نہرو زہریلی ایل ہیں) اس پر تو وہ بے ساختہ قہقہہ ہوا کہ اس کے بعد چار دن اوسلو ہوما میں رہے، جس دعوت میں شامل ہوتے یہ ضرور پوچھا جاتا۔ مسٹر خان ہمیں مسٹر نہرو والا "ایل" کی کہانی سنائیے۔

امریکن سیدھی صاف بات کو بہت پسند کرتے ہیں۔ ترکی بہ ترکی جواب کے قائل ہیں۔ ان پر اچھا اثر چھوڑنے کے واسطے آپ کو QUICK WITTED یعنی نوک بر زباں بات کہنے والا ہونا چاہیے۔

سان فرانسسکو میں میں اور رحمٰن صاحب ایشیا فاؤنڈیشن کے ڈائریکٹروں سے ملاقات کر رہے تھے۔ باتوں باتوں میں میں نے ان سے کہا کہ اصل میں دنیا میں اگر کوئی CITIZENS OF THE WORLD "ساری دنیا کے شہری" کہلانے کے مستحق ہیں تو ہم مسلمان ہیں۔ ہم رنگ و نسل اور مقام کی حدود سے آزاد ہیں۔ ہم اللہ کی بنائی ہوئی دنیا کو اپنا گھر سمجھتے ہیں "ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست" طارق کا واقعہ اور اقبال کے اشعار ان کو سنائے اور یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ درحقیقت مسلمان کا نظریہ بہت وسیع اور ارفع ہے اور وہ انسانیت کی خدمت کرنے کے لیے خاص موزونیت رکھتا ہے۔ مثلاً ہم کالے اور گورے مسلمان میں کوئی تمیز نہیں کرتے۔ (یاد رہے کہ یہ مسئلہ امریکہ کا سب سے زیادہ متنازعہ مسئلہ ہے، کالے مسلمان اور

گورے مسلمان دونوں بھائی بھائی ہیں۔ لیکن یہاں ہمیں تفریق کا شدید احساس ہوتا ہے۔ اُمید ہے ہمارے امریکی دوستوں نے ہمارے نکتہ خیال کو اہمیت دی ہوگی۔)

امریکہ میں سیاہ فام امریکی آبادی کا قریباً آٹھواں حصہ ہیں اور ایک زبردست جفاکش اور حوصلہ مند قوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ سفید امریکیوں کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ اپنے حقوق پر اڑے رہتے ہیں اور ان سے بات چیت کرتے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ وہ ایک شخصیت کے مالک ہیں۔ محمد علی (کلے) (CLAY) عالمی باکسنگ چیمپئن کی مثال سامنے رکھ لیجیے۔ ان میں سے اکثر اسلام کی طرف جھکنے کے لیے تیار ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد (جنھیں امریکی غلام بنا کر افریقہ سے پکڑ کر لائے تھے، بھی اکثر مسلمان تھے) یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ ان کو اسلام سے فطری رغبت ہے۔ میرا یقین ہے کہ اگر وہاں تبلیغ کی جائے تو سیاہ فام امریکی ان شاء اللہ جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔

امریکہ میں ہمارے اکثر میزبان جج صاحبان، گورنر صاحبان، چوٹی کے وکلا یا قانونی ماہرین ہوتے تھے۔ وہ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آتے تھے۔ اور ہمارا اتنا احترام کرتے کہ جس میز پر ہم ہوتے وہاں سُور کا گوشت نہیں آتا تھا اور شراب نہیں لائی جاتی تھی۔ ہم نے بارہا اپنے میزبانوں کو کہا کہ ہمیں یہ چیزیں کھانا پینا منع ہیں، آپ کو تو منع نہیں ہیں۔ ہمیشہ اخلاقاً یہ جواب ملتا کہ نہیں ہمارے لیے بھی یہ ضروری نہیں ہیں۔

مقصد اس بات کے بیان کرنے کا یہ ہے کہ اگر انسان اپنے مقام پر کھڑا رہے اور سختی سے کھڑا رہے تو دوسرے بھی نہ صرف اس مقام کا تعین کر لیتے ہیں بلکہ اس کا احترام بھی کرتے ہیں۔

میری بیوی تین مہینہ کے متواتر سفر یورپ اور امریکہ کے بیسیوں شہروں میں گئیں۔ جہاں آجکل عریانی کی وبا پھیلی ہوئی ہے۔ لیکن یہ اپنے مخصوص پاکستانی لباس شلوار قمیض دوپٹہ (اور موسم کے لحاظ سے ہلکا یا بھاری کوٹ) پہنتی تھیں۔ خدا شاہد ہے کہ انھیں تو کسی نے حقیر نظروں سے نہیں دیکھا۔ بلکہ جتنے اونچے طبقے میں گئے، وہاں اُن کی اتنی زیادہ عزت ہوئی کہ یہ اپنی قدرلس

کی پابند ہیں اور اخلاق کا تقاضا ہے کہ دوسروں کی قدروں کا احترام کیا جائے۔

دراصل پاکستان کی ایمیج (IMAGE) خدوخال کو صحیح طور پر دنیا کے سامنے پیش ہی نہیں کیا گیا۔ ہمارے سفارت خانے تو اس معاملے میں صفر کا درجہ بھی نہیں رکھتے۔ باقی جو تجارتی یا دوسرے طبقوں کے لوگ غیر ملکوں میں جاتے ہیں، وہ اپنے مخصوص اغراض کے ماتحت "جیسا دیس ویسا بھیس" کے نظریے پر عمل کرتے ہیں۔ ان کو اپنا کام نکالنے سے مطلب ہوتا ہے ملک یا اس کی صحیح تصویر پیش کرنے سے ان کو کوئی غرض نہیں ہوتی۔

ہمارا تجربہ امریکہ کی چودہ ریاستوں میں پھرنے کے بعد ہمیں اس نتیجے پر مجبور کرتا ہے کہ اگر پاکستانی نیک نیتی سے صحیح طور پر پاکستان کے نظریے اور حالات کو دنیا کے سامنے پیش کریں اور اپنا کردار مثالی بنائیں تو غیر ہمیں دلچسپی سے دیکھنا شروع کر دیں گے جس محفل میں ہم گئے تو وہاں سے یہی تاثر لے کر آئے کہ اقبال نے جو کہا ہے:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئے صبح و شام پیدا کر

وہ ایک ایسی تعلیم کا درس دیتا ہے جس کو پاکستانیوں کو اپنانے کی سخت ضرورت ہے۔ خصوصاً اس لیے کہ کئی وجوہات کے باعث ابھی تک پاکستان کو غیر ملکوں میں بہت کم لوگ جانتے پہچانتے ہیں۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ درحقیقت یہ کام اصولاً ہمارے سفارت خانوں کے کرنے کا تھا مگر مجھے افسوس سے یہ کہنا پڑتا ہے کہ میں جس ملک میں بھی گیا، الا ماشاءاللہ وہاں اپنے سفارت خانوں کو ہم نے غیر ضروری مشاغل میں منہمک پایا اور جو ان کے فرائض تھے ان سے ان کو اکثر غافل پایا۔ ۱۹۲۸ء میں فرانس میں ہمارے سفیر نے بتایا کہ ان کا سٹاف چار پاکستانیوں پر مشتمل ہے اور ان کے بھی دو دھڑے ہیں۔

۱۹۵۰ء میں میں نے (موجودہ) جسٹس چودھری محمد صدیق صاحب کو جو ان دنوں پاکستان بار

ایسوسی ایشن کے سیکرٹری جنرل تھے' امریکی حکومت کے مہمان کی حیثیت سے سرکاری دورے پر بھجوایا تو انھوں نے مجھے واشنگٹن سے خط لکھا کہ ہمارے سفارت خانے میں پاکستان کا کوئی بڑا نقشہ دیوار پر لگانے کے لیے دستیاب نہیں ہے۔ (انھوں نے کسی جگہ پاکستان کے متعلق لیکچر دینا تھا)

ہمارا اپنا تأثر بھی یہی رہا کہ ہمارے سفارت خانے مختلف قسم کی اشیا کو سستے داموں پر حاصل کرنے کی کوشش میں مشغول رہتے ہیں تاکہ وطن واپس جا کر اپنے گھروں کو تازہ ترین آرائشوں اور زیبائشوں سے مزین کریں۔

ہمارے سفارت خانوں کی 'کارکردگی' کی داستان نہایت افسوسناک بلکہ المناک ہے۔ اس قابلِ افسوس رویّہ کی جیتی جاگتی مثال پھر ہمیں نیویارک میں (واپسی پر) ملی جبکہ میں اپنے ہمراہیوں کے ساتھ اور جسٹس دین محمد (مرحوم)، (جو کشمیر کے معاملے کے متعلق حکومت پاکستان کے نمائندے کی حیثیت سے گئے ہوئے تھے) کے ساتھ اپنے کونسل جنرل مسٹر سلیم خاں مرحوم کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ سلیم خاں پیغام سننے گئے جو خاصا لمبا تھا۔ تقریباً سات یا آٹھ منٹ تو اُن کے پیغام سننے میں لگ گئے ہوں گے۔ وہ جب ٹیلی فون سن کر ہمارے پاس آئے تو میں نے کہا کہ ہے تو نامناسب! لیکن آواز جانی پہچانی تھی اگر کوئی راز کی بات نہ ہو تو سنائیے۔ حضرت! کیا فرماتے ہیں۔ سلیم خاں کہنے لگے کہ آپ نے ٹھیک پہچانا۔ سفیر صاحب ہی تھے اور حسبِ معمول نائٹ کلبوں اور تھیٹروں وغیرہ کے بعد خریدنے' کاروں میں لگائے جانے نئے عجوبات اور گھروں میں اسی قسم کی نئی چیزیں نصب کرنے کے واسطے فرمائش کر رہے تھے۔ جسٹس دین محمد صاحب کی سفیر صاحب سے صرف ایک ملاقات واشنگٹن میں ہوئی۔ حالانکہ وہ مسئلہ کشمیر کے حل کے متعلق صلاح مشورہ کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ اُس کے بعد ٹیلی فون پر بھی کبھی سفیر صاحب اور جسٹس دین محمد صاحب کی ملاقات نہیں ہوئی۔

ان دردناک واقعات سے آپ خود نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ کہاں تک بیرونِ پاکستان ہمارے نمائندے اپنے فرائضِ منصبی ادا کر رہے ہیں۔ میری رائے میں ہمارا فارن آفس سفارت خانوں کے

ذریعے پاکستان کی صحیح امیج IMAGE پیش کرنے میں ناکام رہا ہے اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ ہم ہر ضروری مسئلہ کی بحث کے وقت بین الاقوامی رائے عامہ کو اپنے حق میں کرنے سے اکثر قاصر رہتے ہیں۔

LEADE'S

امریکہ میں قیام کے دوران ہم مہمان تو وزارتِ خارجہ کے تھے اور EXCHANGE پروگرام کے تحت گورنمنٹ کی دعوت پر امریکہ گئے تھے، تاہم ان کی اُس وقت کی مہمان داری کی ترکیب ایسی تھی کہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں بھی اس پر عمل کرنا چاہیے۔

ہوتا یہ تھا کہ امریکی دفترِ خارجہ ہمارا پروگرام بنا لیتا تھا اور پھر جہاں ہمیں جانا ہوتا تھا غیر سرکاری امریکن ہمارا استقبال کرتے، ہماری دعوتیں کرتے، ضروری لوگوں سے ملاقاتیں کرواتے یا مشہور مقامات کی سیر کرواتے۔ سارا سارا دن وہ ہمارے ساتھ رہتے اور گورنمنٹ سے کوئی مُعاوضہ وصول نہ کرتے اور اس طرح براہِ راست بیرونِ ملک سے آنے والوں سے گھُل مل کر امریکہ کی امیج IMAGE کو بڑی خوب صورتی سے پیش کرتے۔ اُن کا یہ جذبۂ حبُ الوطن قابلِ داد اور قابلِ تقلید ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی اپنے محدود حلقے میں اس پر عمل کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ جو مشہور بیرونی ہستیاں پاکستان آتی رہیں، خواہ وہ کسی ملک کی ہوں، اُن سے ملنا، رابطہ قائم کرنا، کھانے، چائے وغیرہ پر بُلانا اور بعض کو اپنے ہاں مہمان ٹھہرانا ہمارا معمول تھا۔

جسٹس سمنز JUSTICE SIMMONS اور ڈاکٹر سٹوری DR. STOREY کے اپنے گھر ٹھہرنے کا ذکر کر چکا ہوں۔ اس کے علاوہ حسبِ ذیل حضرات ہمارے ہاں ٹھہرے یا ہمارے ہاں کسی تقریب میں شرکت کی۔

امریکہ کی سپریم کورٹ کے مشہور جج WILLIAM-O-DOUGLASS اور ان کی تیسری بیوی کو ہم نے جولائی ۱۹۵۵ء میں بہت بڑا لنچ اپنے گھر پر دیا جس کا ذکر انھوں نے اپنی کتاب WEST OF THE INDUS میں کیا ہے۔ پاکستان ہائی کورٹ کے سو سالہ جشن منانے کے موقع پر کوئی سو کے قریب، پندرہ سولہ باہر کے ملکوں کے مندوبین کو عشائیہ پر بُلایا اور البیرونی کی ہزار سالہ

تقریبات کے موقع پر باہر سے آنے والے تمام مہمانوں کو لنچ کی دعوت دی۔

اکا دکا بیرونی مہمان جس میں چند ایک بڑوں میں SIR LESLIC MIMRA جو ایک زمانہ میں نیوزی لینڈ کے وزیر خارجہ اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے صدر رہ چکے تھے اور ان دنوں انٹرنیشنل تنظیم وکلا کے جنرل سیکرٹری تھے اور ان کی اہلیہ MR. GLEN-R- WINTER جو AMERICAN JUDICATURE کے رسالے کے ایڈیٹر تھے۔ وہ اپنی بچی کے ہمراہ ٹھہرے۔ اسی طرح HERALD SNELLING نیو ساؤتھ ویلز AUSTRALIA کے SOLICITOR GENERAL اور ان کی اہلیہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ بے شمار بیرونِ ملک سے آنے والوں کی خاطر مدارت میں ہم بحیثیت ایک پاکستانی کے اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ میں اس قسم کی مہمان داری پر اس لیے زور دے رہا ہوں کہ اس سے پاکستان کو صحیح رنگ میں باہر سے آنے والی چیدہ ہستیوں کے سامنے پیش کرنے کا نادر موقع ملتا ہے۔

عراقی سفیر، لبنانی سفیر، ترکی سفیر، ایرانی سفیر، انڈونیشیا کے سفیر، جرمن سفیر، امریکن سفیر، برطانوی جج اکثر ہماری تقاریب میں شامل ہوتے رہتے تھے۔ جب روسی فن کاروں کا طائفہ یہاں آیا تو تارا خانم کی پارٹی نے میرے یہاں ہی محفل سرور رچائی۔ مفتیٔ اعظم فلسطین مرحوم دمفتیٔ اعظم یوگوسلاویہ بھی ہمارے مہمان ہوئے اور ان کے علاوہ کئی مشہور غیر ملکی اکابرین بھی۔ جن میں سے خاص طور پر قابلِ ذکر مرحوم شیخ سرور الصّبان سیکرٹری جنرل رابطۂ عالمِ اسلامی (مکہ مکرمہ) اور ان کے رفقا ہیں، جن کے اعزاز میں ہم نے ایک بہت بڑی دعوت کا اپنے گھر پر اہتمام کیا اور انھیں PAN. ISLAMISM اتحاد عالمِ اسلامی کا داعی بننے کی دعوت دی۔

دورانِ سیاحت امریکہ ہمارے غیر سرکاری امریکی میزبانوں نے ہمیں اپنے گھروں، کلبوں، پارٹیوں اور انجمنوں میں بلایا اور ہماری دیکھ بھال کی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ BUFFALO سے نیاگرا آبشار تک جو خاتون (مس کوہنی MISS COHAN) میزبان تھیں، اپنی موٹر میں (خود موٹر

چلا کر لے گئیں۔ ان کی عمر قریباً ۶۵ سال تھی اور انھوں نے اصرار کیا کہ ہم ان کی BABY SISTER کے ساتھ اسی ہوٹل میں کھانا کھائیں جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ چنانچہ وہ کوئی دو گھنٹے میں اپنی ۶۰ سالہ LEGAL SESTER کو بھی ساتھ لے آئیں اور یہ دونوں معمر خواتین رات کے کوئی ساڑھے گیارہ بجے تک ہمیں امریکہ اور امریکنوں کے حالات بتاتی رہیں۔ اس بے لوث خدمت کا جو جذبہ ہم نے امریکہ میں دیکھا وہ بہت کم اور ملکوں میں دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ہم حکومتِ امریکہ اور ان کے تمام غیر سرکاری دوستوں کے بیحد مشکور ہیں جنھوں نے بڑے تپاک سے ہمارا استقبال کیا اور بڑی شفقت سے ہمارے ساتھ پیش آئے۔

پاکستانی حکام کو اس طرف توجہ دینی چاہیے کہ باہر سے جو V.I.P پاکستان آئیں وہ زیادہ تر پاکستانیوں کے پاس ٹھہریں یا کم از کم اُن سے ملنے کے مواقع پیدا کیے جائیں تاکہ اجنبیوں کو پاکستان اور اس کے نظریے سے بہتر واقفیت حاصل ہو سکے۔

امریکہ کے کئی علاقوں میں تمام لوگوں نے پاکستان کا نام بھی نہیں سُنا ہوا تھا بعض تو ہمیں فلسطینی سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم تینوں کوشش کے ساتھ صحیح پاکستان کا تعارف کرانے میں پوری سعی کرتے تھے۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ میری بیوی تو ہمیشہ شلوار قمیص پہنتی تھیں۔ لوگ پوچھتے تھے کہ آپ کہاں سے آئی ہیں اور اس طرح ہمیں پاکستان کے متعلق بات چیت کرنے کا مزید موقع مل جاتا تھا۔

امریکہ میں ظاہری آنکھوں سے بھی بہت کچھ دیکھا لیکن باطنی آنکھ بھی حقیقتوں سے غافل نہ رہی۔

امریکہ میں زندگی کی جدوجہد ناقابلِ بیان ہے۔ وہاں لوگ چلتے نہیں دوڑتے ہیں (اور اب تو اُڑتے ہیں) جینے کی کشمکش میں ہر شخص اس بُری طرح اُلجھا ہوا ہے کہ اکثر کو دُنیا و مافیہا کی پروا تو کیا خبر ہی نہیں۔ ان کے ذہنوں پر ضروریاتِ وقت اس طرح مُسلط ہیں کہ

بعض لوگ تو ان افکار میں اپنا دماغی توازن تک کھو بیٹھے ہیں ۔ واشنگٹن کے ایک دماغی امراض کے ہسپتال کے سپرنٹنڈنٹ نے مجھے بتایا کہ اس وقت پانچ سو سے زائد مریض ان کے ہسپتال میں داخل ہیں اور چھ سو کے قریب درخواستیں داخل ہونے والوں کی زیرِ غور ہیں۔

۱۹۵۶ء میں ابھی ہپی ازم کا چرچا نہیں تھا۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ فرقہ بھی اسی ذہنی کش مکش کی وجہ سے ظہور میں آیا جس میں امریکہ مبتلا تھا۔ مشینی زندگی میں لوگ اس طرح اُلجھ کر رہ گئے ہیں کہ فطرت اور اس کے تقاضوں کو بھُولتے جا رہے ہیں۔ جس سے گھریلو زندگی برباد اور آئندہ نسلیں تباہ ہو رہی ہیں ۔

پاکستان یا کوئی اس جیسا ملک اگر امریکہ بننے کی کوشش کرے تو غلطی کرے گا۔ ہماری ترقی ہمارے مزاج، ہماری روایات اور ہمارے مذہب کے مطابق ہونی چاہیے ۔ دُوسروں کی نقالی میں کچھ نفع نہیں ہے۔ نقالی میں نقصان ہی نقصان ہے ۔ مجھے تو کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔

امریکہ میں ایک نئی چیز جو میں نے دیکھی۔ بطورِ وکیل مجھے اس میں بڑی دلچسپی پیدا ہوئی ۔ وہ LEGAL CENTRE تھا۔ DALLAS میں میرے محترم دوست DR. ROBBRET-G-STOREY نے ایک نہایت شاندار LEGAL CENTER کھولا ہُوا ہے۔ یہاں بے شمار طلبا، بیرونِ ملک سے ریسرچ کرنے کے واسطے آتے ہیں۔ اس طرح کا LEGAL CENTER نیویارک میں دیکھنے کا اتفاق ہُوا اور میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ اگر خدا نے توفیق دی تو نہ صرف اپنے طبقے کی بلکہ خلقِ خدا کی خدمت بھی LEGAL CENTER کے ذریعے وطن واپس پہنچ کر شروع کر دوں گا۔

کئی لحاظ سے امریکہ ایک عجیب و غریب ملک اور واقعی ایک نئی دنیا ہے (کولمبس کو دُنیا نئی تو نے بخشی)

اس کے اپنے اصل باشندے جن کو RED INDIANS ریڈ انڈینز کہا جاتا ہے، تو قریباً قریباً ختم ہو چکے ہیں۔ کہیں کہیں ان کے SETTELEMENTS بنے ہُوئے ہیں، جہاں وہ

کس مپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ کافی آبادی کل دنیا کے ملکوں سے (خصوصاً انگلستان اور یورپ) سے یہاں آکر آباد ہوئی ہے۔ اور تیسرا بڑا طبقہ آبادی وہ ہے جو سیاہ فام (سابقہ غلام) جن کو مہذّب گورے لوگ جبراً پکڑ کر امریکہ لائے' ان پر بے پناہ ستم ڈھائے اور ان سے سنگین ترین مشقت لے کر ان سے حیوانوں سے بدتر سلوک کیا) پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ اب ان کے اوپر ڈھائے گئے مظالم کو خوب اچھی طرح سے جانتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ امریکیوں کے تمام طبقوں میں سب سے زیادہ سخت و گرخت حبشی NEGROES ہیں جو اب ملکی زندگی میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔

لیکن ان سب طبقوں کی سب سے بڑی عجوبہ بات یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ اصل امریکن کوئی نہیں رہا اور کل آبادی باہر سے آکر نو آباد ہونے والوں کی ہے' تاہم سب ایک امریکن قوم ہیں۔ رنگ' زبان' نسل میں علیٰحدہ علیٰحدہ' اپنے رسم و رواج میں علیٰحدہ علیٰحدہ۔ لیکن ملکی معاملات میں سب امریکن (خواہ گورے ہوں یا کالے یا کسی اور رنگ کے)

یہ لوگ ابھی تک اپنے آبائی تعلقات کو نہیں بھولے۔ جرمنوں کی ایک محفل میں ہم گئے جہاں سب ماحول جرمن تھا۔ اس طرح ایک اطالوی محفل میں گئے۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ اٹلی میں بیٹھے ہیں۔ لیکن جب ملکی مفادات کا معاملہ ہو تو سب امریکن ہیں۔

امریکہ نے سائنس کے میدان میں وہ ترقی کی ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اس سے ٹکر نہیں کھا سکتی۔ نیل آرم سٹرانگ (NEIL ARMSTRONG) دنیا کا پہلا انسان تھا جس نے چاند کی سطح پر قدم رکھا۔

ہوا یہ کہ اپنے آبائی وطنوں کو ترک کر کے جو لوگ امریکہ میں آباد ہوئے' انھوں نے اسے ایک جنت ارضی پایا۔ جس کو اپنے خون پسینہ سے رشکِ جنت بنا دیا۔

خصوصاً یہودیوں نے (جو یورپ کے ملکوں سے بدر کیے گئے تھے) اور جو عقل و دانش میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ انھوں نے امریکی زندگی کو وہ تازگی اور روح بخشی کہ پرانی دنیا میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ چنانچہ اب زندگی کے ہر شعبہ میں' سیاست' ثقافت' تعلیم' تجارت' صحافت' صنعت'

حرفت، بنکنگ، ادب، تھیٹر، سینما، کھیل کا میدان، ٹرانسپورٹ غرضکہ ہرافق پر یہودی چھائے ہوئے ہیں۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ امریکہ کی نکیل یہودیوں کے ہاتھ میں ہے جدھر چاہیں موڑدیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسرائیل کو امریکہ کی وہ پشت پناہی حاصل ہے جیسے وہ امریکہ کی ایک ریاست ہو۔ ہم نے امریکہ کی ۱۴ ریاستوں کی سیر کی۔ بہت اُونچے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہُوا۔ یہ لوگ نہایت محنتی، محبّ الوطن اور سخت کوش ہیں۔ مساوات کا درس تو دیتے ہیں لیکن عملاً ابھی تک کالے گورے کی تمیز قائم ہے۔

بہرصورت آزادی کا جذبہ ان میں ضرور موجود ہے اور یہ کہنا کوئی مبالغہ نہ ہوگا کہ جمہوریت اور آزاد زندگی کا جو نقشہ ہم نے یہاں دیکھا وہ اور ملکوں میں کم ہی نظر آیا اور پاکستان میں تو اس کا عشرِ عشیر بھی دیکھنے میں نہ آیا۔

امریکہ کے ایک سابق چیف جسٹس ہیوز (HUGHES) ہوٹل کی BASEMENT (تہ خانہ کی منزل) کے ریستوران میں کھانا کھاتے تھے کہ وہ سب سے سستی جگہ ہوتی ہے اور لفٹ مین، لفٹ چلانے والے یا دیگر ادنٰے کارکنوں میں بیٹھ کر ان سے گھُل مل کر باتیں کرتے تھے جیسے کہ اُن میں اور سابق چیف جسٹس میں کوئی فرق نہیں ہے۔

بعض دفعہ تو گمان ہوتا تھا کہ مساوات کے اسلامی اصول اکثر امریکنوں نے اپنا لیے ہیں۔ (اور ہم ہیں کہ انھیں ترک کرتے جارہے ہیں)

ہم نے قریباً ڈھائی ماہ کے قیام میں امریکی زندگی کا CROSS SECTION اچھی طرح سے دیکھا اور اس سے بہت سے سبق سیکھے۔ ستمبر کے آخر میں ہم وطن واپس آئے۔ کراچی میں کراچی ہائی کورٹ بار نے ہمیں اپنے دورے کے تاثرات بیان کرنے کو کہا۔ رحمٰن صاحب اور میں دونوں نے مختصراً اپنے مشاہدات بیان کیے۔ ایک دوست نے پُوچھا، آپ نے اس دورے میں یورپ کے متعدد ملک دیکھے، امریکہ کی ۱۴ ریاستوں کی سیر کی، ICELAND کو بھی جھانک کر دیکھا، آپ کو ان سب میں سے کون سا ملک زیادہ خوب صورت نظر آیا۔

میں نے بلا تامل کہا، خاکِ پاک۔ پاکستان۔

نہ اس جیسا حسین ملک، نہ اس جیسا اچھا ملک، نہ اس جیسا پیارا ملک دنیا میں ہے، نہ ہوگا۔ یہ سب سے خوب صورت ملک ہے۔

لاہور پہنچنے پر امریکی قونصل جنرل نے امریکن سنٹر میں ہمیں اپنے تاثرات بیان کرنے کو کہا۔ میں نے اپنی تقریر میں خصوصاً نوجوان طبقہ پر زور دیا۔

جب آپ امریکہ جائیں۔ پاکستانی کی حیثیت سے جائیں، وہاں پاکستانی کی حیثیت سے رہیں اور پاکستانی کی حیثیت سے واپس آئیں۔ اپنے مخصوص نظریاتِ زندگی ایک منٹ کے واسطے فراموش نہ کریں۔ شراب پینے میں آپ امریکنوں کو مات نہیں کر سکتے۔ ناچنے کودنے میں آپ ان پر سبقت نہیں پا سکتے۔ ناک کے ذریعے بولنے میں آپ ان کو ہرا نہیں سکتے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں ان کی گھٹی میں پڑی ہیں۔ اگر آپ ان کو اپنانے کی کوشش کریں گے تو بھونڈی نقالی ہوگی۔ ان کی چال سیکھ نہ سکیں گے، اپنی بھول جائیں گے۔ چلا جب چال کوا ہنس کی، اپنا چلن بھولا۔

لیگل سنٹر کی تنظیم کا قیام

لیگل سنٹر کی تنظیم کا میں نے ڈالاس اور نیویارک میں بغور مطالعہ کیا تو میں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ انشاء اللہ العزیز پاکستان میں بھی اسی نمونے کی قانون سے دلچسپی رکھنے والوں کی ایک تنظیم قائم کروں گا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۵۶ء سے ہی میں نے شب و روز کام کیا اور ۱۹۵۷ء کے وسط میں ماشاء اللہ یہ تنظیم وجود میں آگئی۔ اتنا وقت اس کا آئین بنانے اور گورنمنٹ سے اس کے لیے گرانٹ لینے میں صرف کیا لیکن آہستہ روی نے تنظیم کے کئی پہلوؤں کو مضبوط تر کر دیا۔

لیگل سنٹر کا بنیادی خیال یہ ہے کہ تمام وہ لوگ جو قانون میں دلچسپی رکھتے ہیں خواہ وہ جج ہوں، وکیل ہوں، لا کالجوں کے پروفیسر ہوں یا وہاں کے طالب علم ہوں یا محض قانون کی برتری میں دلچسپی رکھتے ہوں، ان سب کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر کے ملک میں قانون کی بالادستی کی کوشش کی جائے، بہترین قوانین بنائے جائیں اور موجودہ دَور کے بڑھتے ہوئے قانونی تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کا آئین میں نے مرتب کیا اور ہائی کورٹ کی جانب سے مرحوم جسٹس شبیر احمد نے اس کے متعلق بہت سے مفید مشورے دیے۔ تنظیم کے مقاصد تو اوپر بیان کر چکا ہوں۔ اس کی شکل یہ قرار پائی کہ ہر وہ شخص جس کا اوپر ذکر آچکا ہے، اس کا ممبر بن سکے گا اور یہ لوگ پندرہ اشخاص پر مشتمل ایک گورننگ باڈی کا انتخاب

کریں گے جس کا چیئرمین ایک وکیل ہوگا اور جس کے تین ممبر جج صاحبان ہوں گے۔ (ایک سپریم کورٹ کی طرف سے، ایک مغربی پاکستان ہائی کورٹ کی جانب سے اور ایک مشرقی پاکستان کی نمائندگی کرے گا) بورڈ کے باقی اراکین میں تمام طبقہ وکلا، پروفیسر صاحبان، قانونی طالب علموں کو نمائندگی دی جائے گی۔ جب یہ تنظیم پاس ہوگئی تو اس کے پہلے جلسے میں مجھے اس کا صدر منتخب کیا گیا۔ سپریم کورٹ کی طرف سے مرحوم جسٹس محمد شریف جج اور مغربی پاکستان ہائی کورٹ کی طرف سے مسٹر جسٹس بی زیڈ کیکاؤس جج اور مشرقی پاکستان کی جانب سے مسٹر جسٹس حمود الرحمٰن (جو آج کل پاکستان کے چیف جسٹس ہیں) بورڈ کے ممبر نامزد ہوئے۔ پہلے اجلاس میں پاکستان بار جرنل PAKISTAN BAR JOURNAL جاری کرنے کا فیصلہ ہوا جو بڑی شان سے شروع ہوا اور جس کے مدیر اعزازی موجودہ جسٹس ایس اے سلام جج ہائی کورٹ مقرر ہوئے۔ یہ رسالہ لیگل سنٹر اور پاکستان بار ایسوسی ایشن کا مشترکہ ترجمان بن گیا اور اس میں بڑے بلند مرتبہ مضامین چھپتے رہے۔

اس بورڈ کے متعدد اجلاس ہوئے لیکن جسٹس حمود الرحمٰن اس میں شریک نہ ہو سکے۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ مشرقی پاکستان والوں نے جسٹس حمود الرحمٰن کو اس لیگل سنٹر میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ چونکہ یہ پکی بات ہے اس لیے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ شروع سے مشرقی پاکستان والے مغربی پاکستان کی برتری کو حاسدانہ نظر سے دیکھتے تھے۔ ان کی کوشش صرف یہ تھی کہ پاکستان میں شامل رہ کر اور یہ شور مچا مچا کر کہ ہمارے ساتھ بڑی ناانصافی ہو رہی ہے، زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کرلو اور پھر بھی یہی ظاہر کرو کہ ہم مطمئن نہیں ہوئے)۔

اس جملۂ معترضہ کی معافی مانگتے ہوئے اور پاکستان لیگل LEGAL سنٹر کی داستان جاری رکھتے ہوئے عرض کرنا ہے کہ ۱۹۵۷ء کے آخر میں جب ڈاکٹر

سٹوری جو ڈلاس میں لیگل سنٹر کے صدر رہتے اور جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، اپنی اہلیہ کے ہمراہ ہمارے ہاں لاہور میں دوبارہ ٹھہرے ہوئے تھے، عین اس وقت جب ان کے اعزاز میں عصرانہ دیا جا رہا تھا، مجھے گورنمنٹ آف مغربی پاکستان کی طرف سے یہ اطلاع ملی کہ اس نے ۵، ہزار روپے کی گرانٹ لیگل سنٹر کے لیے تین سال کے لیے منظور کرلی ہے۔ مس رابعہ قاری بارایٹ لا، جو کہ ایک مشہور سیاسی اور سماجی کارکن ہیں اور لاہور ہائی کورٹ بار کی صدر بھی رہ چکی ہیں کو مستقل سیکرٹری منتخب کیا گیا اور انہی کے مکان واقع بلومر بلڈنگ متصل ہائی کورٹ، لیگل سنٹر کا دفتر قائم کیا، جہاں رفتہ رفتہ میں نے اپنے امریکن دوستوں کے ذریعے کوئی ایک لاکھ روپے کی قانونی کتابیں مفت منگوا کر لیگل سنٹر کی لائبریری کو قانون کے شعبے میں چوٹی کی لائبریری بنا دیا۔ میری کوشش سے گورنمنٹ نے دو کنال زمین گورنمنٹ ہاؤس کے سامنے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں چار سال تک لیگل سنٹر کا صدر منتخب ہوتا رہا اور آخر میں نے اپنے دوستوں سے کہا کہ اب مجھے اس بارِ گراں سے سبکدوش کر دیا جائے۔ چنانچہ مسٹر حسین شہید سہروردی سابق وزیرِ اعظم پاکستان کو صدر منتخب کیا گیا لیکن ان کے مشاغل زیادہ تر سیاسی اور ان کا میدانِ عمل زیادہ وسیع تھا۔ دو سال تک لیگل سنٹر کا کوئی جلسہ ہی نہ ہو سکا اور یہ مفید تنظیم بغیر کوئی مزید کارہائے نمایاں انجام دینے کے آہستہ آہستہ ختم ہو گئی اور زمین بھی گئی اور رسالہ پاکستان بار جرنل بھی آج تک پھر نظر نہیں آیا۔

جُز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار
صحرا مگر بہ تنگیِ چشمِ حسود تھا

پاکستان بار ایسوسی ایشن جو محض وکلاء کی تنظیم تھی، اس کی صدارت کا بھی اب تیسرا چوتھا سال تھا۔ اس لیے میں نے کوشش کی کہ اب کراچی میں اس کا

سالانہ اجلاس بُلا کر کراچی سے کسی صاحب کو اس کا صدر چُنا جائے۔ کراچی بار ایسوسی ایشن نے (جو کراچی ہائیکورٹ بار ایسوسی ایشن سے مختلف تنظیم ہے) اس سالانہ اجتماع کے موقعہ پر ہمارا میزبان بننا قبول فرمایا اور اس تقریب کے اعزاز میں بیچ لگژری ہوٹل کراچی میں ایک شاندار عشائیہ کا اہتمام کیا جس میں اُنھوں نے اس وقت کے صدرِ مملکت میجر جنرل سکندر مرزا کو بھی مہمانِ خصوصی کے طور پر بُلا لیا۔ میں نے کہا کہ یہ تو اچھا نہ ہوا' کیونکہ میں نے جو خطبہ پڑھنا تھا' اُس میں حکومت وقت پر بھی تنقید کی گئی تھی اور یہ نامناسب معلوم ہوتا ہے کہ صدرِ مملکت کی موجودگی میں ان کے منہ پر گلے شکوے کیے جائیں۔ کوئی صورت ایسی نکالیے کہ یہ پیچیدگی پیدا نہ ہو۔ لیکن کراچی بار نے اُس وقت تبدیلی کرنے سے معذوری کا اظہار کیا اور آخر یہی قرار پایا کہ میرا خطبۂ صدارت صدرِ مملکت کی موجودگی میں پڑھا جائے۔ مجھ سے فرمائش کی گئی کہ اس بات کو مدِّنظر رکھتے ہوئے میں اپنے خطبے میں کچھ تبدیلی کر لوں لیکن میں کسی صورت میں اس پر رضامند نہ ہوا اور فیصلہ کیا کہ یہی خطبہ پڑھا جائے گا جس کی کاپی پہلے کراچی بھیجی جا چکی ہے۔ موجودہ جسٹس چودھری محمد صدیق جج ہائی کورٹ سیکرٹری جنرل پاکستان بار ایسوسی ایشن میرے ہمراہ تھے اور باوجود ہماری اس کوشش کے کہ اس دفعہ کراچی سے صدر چُنا جائے' مسٹر چندریگر مرحوم سابق وزیرِ اعظم پاکستان کی تجویز اور ریٹائرڈ مسٹر جسٹس حاتم طیب جی سابق چیف جسٹس سندھ کی تائید و اتفاقِ رائے سے پھر مجھے ہی آیندہ سال کے لیے صدر منتخب کیا گیا' جو احباب کے اصرار پر مجھے قبول کرنا پڑا۔ اُسی شام بیچ لگژری ہوٹل میں کھانے کا اہتمام تھا۔ جب میں وہاں وقت سے کچھ پہلے پہنچا تو صدر کراچی بار ایسوسی ایشن نے صدرِ مملکت کے ملٹری سیکرٹری کی موجودگی میں (جو سب صدرِ مملکت کے استقبال کے واسطے کھڑے تھے) ایک بڑا سا ہار دیا کہ یہ میں نے صدرِ مملکت کو پہنانا ہے۔ میں نے سب کے

سامنے ایسا کرنے سے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔ میں دستار بندی کی رسموں سے سخت متنفر تھا اور یہ ہار پہنانے اور اس قسم کے تکلفات کو ملکی زندگی کے معمولات میں سے بے دخل کرنا چاہتا تھا۔ استقبالیہ کی میٹنگ کے افراد نے کہا کہ صاحب یہ تو رسم ہے، آپ اس سے کیوں انکار کر رہے ہیں؟ میں نے جواب دیا کہ میں صرف آپ کی دعوت میں شریک ہونے آیا ہوں۔ اپنے خیالات آپ تک پہنچانے اور صدرِ مملکت کے ارشادات سننے آیا ہوں اور اس کے علاوہ نہ میرا کوئی کام ہے اور نہ ہی میں کوئی اور خدمت بجالانے کو تیار ہوں۔

عشائیہ پر کوئی ساڑھے تین سو کے قریب مہمان تھے۔ جج صاحبان، وکلاء صاحبان اور بہت سے معززین شامل تھے۔ میں نے نہایت موزوں مگر کھلے الفاظ میں صدرِ مملکت کو بتایا کہ وہ آئین کی حفاظت نہیں کر رہے بلکہ آئین میں کئی رخنہ اندازیوں کی ان پر ذمہ داری عاید ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

وہ سین آج تک مجھے نہیں بھولتا (اور نہ ہی چشمِ بصیرت رکھنے والے شرکاء کو بھولا ہے) میری اس صاف گوئی پر IRONMAN OF PAKISTAN پاکستان کے مردِ آہن، میجر جنرل سکندر مرزا صدرِ مملکت پاکستان اس قدر برافروختہ ہوئے کہ جب وہ جواب دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو ان کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ تقریر والے کاغذ صاف ہلتے نظر آرہے تھے۔ ان کی آواز میں ایک کرختگی اور برہمی پائی جاتی تھی۔ بار بار زبان ہونٹوں پہ پھیرتے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو قابو میں نہ رکھ سکیں گے۔ دیکھنے والوں نے اس تماشہ کا پورا لطف اٹھایا۔ دوسرے دن اخبارات میں عشائیے کی تقریروں کی رپورٹیں شائع ہوئیں۔

جب یہ ساری کارروائی لاہور کے اخبارات کے ذریعے مرحوم مسٹر جسٹس کیانی جج ہائی کورٹ کے نوٹس میں آئی تو اس مردِ مومن نے ایک خط میں مجھے

حسب ذیل الفاظ لکھے :

"آپ پاکستان کے واحد شخص ہیں جس نے شیر کا شکار اس کی کچھار میں جا کر کھیلا ہے۔"

"YOU ARE THE ONLY MAN IN PAKISTAN

WHO HAS DARED THE LION IN HIS OWN DEN"

ان تقریروں کا ذکر دوسرے دن مجھے ایک پریس کانفرنس میں پھر کرنا پڑا اور صدرِ مملکت کے بعض ارشادات کے متعلق میں نے قانونی طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ وہ آئین کی خلاف ورزی کر رہے ہیں یا کر وا رہے ہیں اور اس طرح وہ اپنی آئینی ذمہ داریاں صحیح طور پر نہیں نبھا رہے۔ اس پریس کانفرنس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ چند ہی دنوں بعد میجر جنرل سکندر مرزا نے کسی اور دعوت کے موقع پر اپنی پچ لگژری والی تقریر کی کچھ اس طرح وضاحت کی کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ عذرات پیش کر رہے ہیں۔

اس لمبی کہانی کے بیان کرنے کا مقصد پھر وہی ہے جو میری اس کتاب کے مقاصد کا ایک درس ہے کہ اگر انسان اپنے بلند مقام پر کھڑا رہے اور حق گوئی کی جرأت کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں کے ذریعے اس کی مدد کرتا ہے اور باطل کی کوئی تدبیر اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔

بدقسمتی سے پاکستان میں شروع ہی سے یہ رسم چل نکلی ہے کہ چڑھتے سورج کی پرستش اور اپنے حلوے مانڈے سے کام رکھو، ملک خدا نے دیا ہے اور خدا ہی اس کی حفاظت کرے گا۔

میں یہ نہیں کہہ رہا کہ ہر راہنما نے یہی اسلوب اختیار کیا، لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر و بیشتر اسی راہ پر گامزن رہے۔ تا آنکہ آج ہم اس جگہ پر آ

کھڑے ہوئے ہیں کہ پتہ نہیں چلتا کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے۔ ہر ملت کے لیے یہ امتحان کا وقت ہوتا ہے۔ میں ایک بار پھر دردمندی سے عرض کروں گا کہ اگر ہم نے حق گوئی و بے باکی کو ترک کر دیا تو یہ ملک کبھی بھی ہمارے حسین خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکے گا۔

۱۹۵۸ء میں دوسرا مارشل لاء نافذ ہوا۔ چند روز کے لیے میجر جنرل سکندر مرزا اور پھر جنرل محمد ایوب خاں نے ملک کی باگ ڈور سنبھال لی۔ شروع شروع میں اس نئی فوجی انتظامیہ نے اچھا کام کیا۔ تاہم مجھ جیسے لوگ مارشل لاء کی حکومت کو کوئی مستحکم چیز نہیں سمجھتے تھے۔ البتہ "ضرورت" کے باعث گوارا کرنا پڑا۔

انٹرنیشنل کمیشن آف جیورسٹس میں شرکت

اسی سال کے آخر یعنی دسمبر ۱۹۵۸ء میں نئی دہلی میں انٹرنیشنل کمیشن آف جیورسٹس INTERNATIONAL COMMISSION OF JURISTS (بین الاقوامی تنظیم کا اعلیٰ) اجلاس ہوا جس میں پچاس سے زائد ممالک کے نمایندوں نے شرکت کی۔ پاکستان کی طرف سے میں اور موجودہ مسٹر جسٹس چودھری محمد صدیق جج لاہور ہائی کورٹ۔ موجودہ مسٹر جسٹس سید الشکور سلام، جج لاہور ہائی کورٹ مس رالعبہ قاری اور کراچی سے مسٹر جسٹس فاروقی (سابق جج) شامل ہوئے۔ مجھے یہاں کئی پرانے دوستوں سے جن کو میں دنیا کے مختلف ملکوں میں قانونی اجتماعات میں مل چکا تھا، دوبارہ ملنے کا موقع ملا اور نئی دہلی میں بیٹھ کر پاکستان کے نظریے اور اس کی ایمج IMAGE کو صحیح طور پر پیش کرنے کا بڑا اچھا موقع دستیاب ہوا۔

۱۹۵۹ء میں کچھ ایسی باتیں سامنے آئیں جن سے شک پیدا ہوا کہ اس اسلامی جمہوریہ پاکستان کو کسی اور راہ پر چلایا جانا مقصود ہے اور چونکہ اب پاکستان میں ایک فردِ واحد کی حکومت تھی، اس لیے جب تک ان کو قائل نہ کیا جائے کہ کسی غیر اسلامی نظریہ پر چلنا مہلک ہوگا، اس وقت تک یہ روش نہ بدلے گی۔

چنانچہ ہم پانچ آدمی صدر محمد ایوب خاں مرحوم کی خدمت میں کراچی میں حاضر ہوئے جن میں مولانا غلام محی الدین خاں مرحوم (جو اُن دنوں انجمن حمایتِ اسلام

کے صدر بھی تھے)، محترم ڈاکٹر سید عبداللہ ، میاں بشیر احمد مرحوم ، میں اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ڈاکٹر عبدالوحید آف فیروز سنز شامل تھے۔ ہم نے مرحوم صدر محمد ایوب خاں کی خدمت میں یہ موقف پیش کیا کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا اور اسلام کے اصولوں کے مطابق ہی یہاں زندگی گزارنے کا اہتمام کیا جائے اور اللہ اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے احکام کی پیروی پوری طرح کی جائے۔ ہم نے کہا کہ ہماری قومیت اسلام ہے۔ ہمارا مذہب اسلام ہے اور اس لیے ہم کسی غیر اسلامی آئین، قانون یا ضابطے کو پسند نہیں کریں گے۔ صدر محمد ایوب خاں مرحوم نے کچھ سوالات پہلے لکھ کر رکھے ہوئے تھے جو اُنھوں نے ہمیں دے کر ان کا جواب وضاحت سے دینے کو کہا تاکہ جو مشکلات ان کے سامنے درپیش ہیں ان کو اسلامی نقطۂ نگاہ سے حل کرنے میں اُنھیں مدد مل سکے۔ ہم نے واپس لاہور پہنچ کر یہ جوابات تیار کر کے صدرِ مملکت کی خدمت میں بھیج دیے۔ لیکن خیال آیا کہ بہتر ہو گا کہ اس ضروری مسئلے پر رائے عامّہ کو بھی بیدار کیا جائے۔ چنانچہ نیشنل ازم اور پاکستان کے زیرِ عنوان ایک مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس کی صدارت مسٹر جسٹس ایس اے رحمان (جج سپریم کورٹ) نے کی اور جس میں ہم نے تمام غیر ملکی نمائندوں، مارشل لا کے افسروں اور ملکی اکابرین کو شرکت کی دعوت دی۔ صدرِ جلسہ، میں اور ڈاکٹر سید عبداللہ نے پاکستانی قومیت کا صحیح نظریہ پیش کیا جو صدر محمد ایوب خاں کے سوالات کا تسلی بخش جواب بھی دیتا تھا اور عوام الناس کو یہ یقین بھی دلاتا تھا کہ جب تک پاکستان میں اسلامی آئین رائج نہ ہو گا، اُس وقت تک پاکستان کی سالمیت خطرے میں رہے گی۔

محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کا کہنا ہے کہ ہماری ناچیز کوششوں کا اثر اتنا ضرور ہوا کہ اوپر کے طبقوں میں جو لہر بے دینی کی اُبھرنا شروع ہوئی تھی، وہ دب گئی۔ گویہ

بالکل مفقود تو نہ ہوئی۔ تاہم فی الحال اس کے مضر اثرات سے ہم لوگ بچ گئے۔ اس طرح چند ماہ بعد ایک اور شوشہ چھوٹا کہ دانش وروں کے طبقے سے (یاد رہے کہ اس طبقے کی پیدائش اور نشوونما حکومت کے ذریعے ہوئی) آواز اٹھی کہ پاکستان اس صورت میں ترقی کر سکتا ہے اور اقوامِ عالم کی اوّلین صفوں میں شامل ہو سکتا ہے، جب کہ وہ لاطینی رسم الخط LATIN SCRIPT کو اختیار کرے، رومن میں لکھنا شروع کر دے اور عربی، فارسی اور اردو کے سینکڑوں سال کے جمع شدہ خزینوں کو خیرباد کہہ دے۔ ہمارے ہم خیال احباب نے فوراً اس نئے فتنے کے بڑھتے ہوئے حدودِ اربعہ کو بھانپ لیا اور پھر سینٹ ہال میں بڑی نمایندہ مجلس بُلا کر جسٹس محمد شریف مرحوم جج سپریم کورٹ کی صدارت میں زبردست دلائل لاطینی رسم الخط کے خلاف پیش کیے اور مارشل لا ایڈمنسٹریشن پر واضح کر دیا کہ لاطینی رسم الخط اختیار کرنے سے ہماری تباہی یقینی ہو جائے گی۔

محترم ڈاکٹر سید عبداللہ کا اصرار ہے کہ ہماری اس دوڑ دھوپ کی وجہ سے ہی لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی نامعقول پالیسی ترک کر دی گئی۔

۱۹۵۹ء میں مارشل لا کی انتظامیہ کا رنگ گدلا ہونا شروع ہو گیا اور ہم میں سے کئی لوگوں نے محسوس کیا کہ ہم جمہوریت کی راہ سے ہٹ کر آمریت کے دور میں داخل ہو رہے ہیں اور مؤثر آواز نکالنے کے مواقع روز بروز کم ہو رہے ہیں، اس کی کوئی چارہ سازی کرنی چاہیے۔

۱۹۵۹ء کی گرمیاں ایبٹ آباد میں گزاریں۔ جہاں پہلے بھی جایا کرتا تھا اور آب و ہوا کے لحاظ سے یہ ہمارے لیے بہت موزوں مقام تھا۔ ایبٹ آباد میں میرے نہایت ہی عزیز دوست اور رفیق مسٹر جسٹس سجاد احمد جان جو آج کل پاکستان کے چیف الیکشن کمشنر ہیں۔ سپریم کورٹ کے جج رہ چکے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں مغربی پاکستان کی ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ان کی موجودگی نے ہمارے لیے ایبٹ آباد کو اور بھی زیادہ دلفریب بنا دیا تھا۔ ججی سے پہلے وہ ایبٹ آباد کے ایک ممتاز وکیل تھے۔ جنھوں نے وکالت کے علاوہ ایبٹ آباد کی ادبی دُنیا میں "بزمِ علم و فن" قائم کر کے ایک نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اس بزم کے پلیٹ فارم سے بڑے پُرمغز مقالے پڑھے گئے اور بلند پایہ تقریریں ہوئیں لیکن اس بزم کی غالباً سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے ملت کو مسٹر جسٹس رستم کیانی (جو ان دنوں مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے چیف جسٹس تھے) کے طنزیہ کلام اور ادبی مقام سے روشناس ہونے کا موقع ملا۔ جسٹس سجاد احمد جان کے جج بننے کے بعد بھی بزمِ علم و فن قائم رہی مگر اب اسے لوگ بزمِ علم و فن کہتے ہیں۔

انھیں چھٹیوں کے درمیان بزم علم و فن کا ایک جلسہ ہوا جس میں کیانی صاحب مرحوم نے "خیالاتِ پریشاں" کے زیرِ عنوان تقریر کرنی تھی۔ میں بھی ان کے سامنے کرسیوں کی پہلی صف میں بیٹھا ہوا تھا اور اکثر لوگ مجھے اُس دن یا اس سے ایک دو دن پہلے ایبٹ آباد میں دیکھ بھی چکے ہوں گے۔ میری بیوی بھی خواتین کی گیلری میں موجود تھیں۔ کیانی صاحب کی زبان سے پھلجڑیاں چھوٹ رہی تھیں۔ بڑے دُور رس اور دقیق نکات سے اپنے ہلکے پھلکے مزاحیہ طریقہ سے سامعین کو لطف اندوز کر رہے تھے کہ بیچ میں

یہ فقرہ جڑ دیا۔

"ہمارے ایک دوست تھے چودھری نذیر احمد خان مرحوم !! ......
مرحوم کے الفاظ پر کیانی صاحب ارادتہً کچھ رُک گئے۔ کیوں کہ سامعین میری اچانک موت کی خبر سُن کر ششدر رہ گئے۔ میری بیوی کے ہمراہ خواتین کا تاثر بھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔ کیانی صاحب جو سارے سین سے پوری طرح لُطف اندوز ہو رہے تھے۔ ذرا وقفے کے بعد بولے "مرحوم" سے میری مراد یہ نہیں کہ خدانخواستہ فوت ہو گئے ہیں۔ "مرحوم" سے میری مراد یہ ہے کہ وہ اٹارنی جنرل بن گئے ہیں۔ کبھی کبھی حق بات کہہ دیا کرتے تھے۔ لیکن اب وہ بھی ملازمت کی زنجیروں میں جکڑے گئے۔

قارئین خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اِس تشریح سے سامعینِ جلسہ کتنے لُطف اندوز ہُوئے ہوں گے۔

اصُولاً تو کیانی صاحب کا نقطۂ نظر درست تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ میں نے بطور اٹارنی جنرل ہمیشہ حق کی بات کہنے کی کوشش کی لیکن چونکہ میری شنوائی نہ ہوتی تھی۔ میں نے دوبارہ استعفا پیش کر دیا جو دونوں بار نامنظور ہوا لیکن بالآخر اکتوبر ۱۹۶۱ء میں جب میں نے دیکھا کہ ملکی معاملات میں میری کوئی بات ہی نہیں مانی جاتی تو میں نے تیسری بار استعفاء دے دیا اور اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گیا۔ اس دفعہ میں نے مرحوم صدر ایّوب کو مشورہ دیا تھا کہ وہ صدر کے عہدے کا انتخاب بالغ حقِ رائے دہی کی بنیاد پر کرائیں اور بنیادی حقوق کو عدالتوں کی زیرِ نگرانی کر دیں۔ مرحوم نے یہ دونوں باتیں نہ سنیں تو میں نے آخری بار اِستعفاء دے کر اٹارنی جنرل شپ سے علیحدگی اختیار کر لی۔

تقرر بطور اٹارنی جنرل

جولائی ۱۹۵۹ء میں مرحوم فیلڈ مارشل صدر محمد ایوب خان نے اس وقت کے وزیرِ قانون مولوی محمد ابراہیم مرحوم کی معرفت مجھے کراچی بلایا اور مجھے کہا کہ میں پاکستان کے اٹارنی جنرل شپ کا عہدہ قبول کر لوں۔ میں تو ہر قسم کی ملازمت کا ساری عمر مخالف رہا لیکن اب اس درجے کا اصرار تھا کہ میری ساری شرطیں مان لی جائیں گی۔ اگر ان کی صرف ایک شرط مان لی جائے۔ میں نے پوچھا وہ کون سی؟ انھوں نے فرمایا کہ آپ انکار نہ کریں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ میں مارشل لا انتظامیہ کا گرویدہ نہ تھا۔ میں نے اس اہم مسئلے پر غور کرنے کے واسطے مہلت مانگی لیکن مجھے بتایا گیا کہ نوٹیفکیشن میرے نام کا تیار ہے۔ صرف میرے ہاں کہنے پر صدرِ مملکت اس پر اسی وقت دستخط کر دیں گے۔ پھر میں نے چند منٹ کی مہلت مانگی کہ میں علیحدہ بیٹھ کر اور سوچ کر جواب دوں گا۔

چنانچہ میں ایک الگ کمرے میں بیٹھ کر اس پیش کش پر غور کرتا رہا۔ کچھ اس قسم کی دلیلیں میرے ذہن میں آئیں کہ اب انھوں نے خود اصرار سے بلایا ہے اور بڑی قدر و منزلت کر رہے ہیں۔ میں ان کے قریب

اگر جو بات کلمۂ حق سمجھتا ہوں، بے تکلفی سے کہہ سکوں گا۔ انکار کرنے کی صورت میں خواہ مخواہ ان کے دل میں یہ خیال ہوگا کہ یہ شخص ہمارے مخالف چل رہا ہے۔ میری ہر بات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جائے گا اور قرب کی بجائے بُعد ہونے کی وجہ سے میری آواز ایوانِ سلطنت میں مدھم پڑ جائے گی۔ اگر میں اٹارنی جنرل شپ قبول کر لیتا تو مجھے مالی طور پہ خسارہ تھا لیکن جس چیز نے مجھے آخر رضامندی پہ آمادہ کر لیا، وہ مالی نفع و نقصان کا خیال نہ تھا بلکہ یہ خیال تھا کہ مقربین کے زمرے میں شامل ہو کر بلا جھجک حق بات کہہ سکوں گا۔ چنانچہ اس قسم کے استدلال کے نتیجے میں مَیں نے نصف گھنٹے کے بعد اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا اور ۱۹ جولائی ۱۹۵۹ سے پاکستان کا اٹارنی جنرل مقرر ہو گیا۔

پاکستان کے اٹارنی جنرل کی حیثیت اس وقت کچھ عجیب سی تھی۔ جن ملکوں میں (مثلاً برطانیہ اور اس کے دولتِ مشترکہ کے ممالک میں) اٹارنی جنرل کا عہدہ تھا وہاں آئین کی رُو سے وہ اگر CABINET کا ممبر نہ بھی ہو، اُسے اجلاس میں مشیر کی حیثیت سے شامل ہونے کا حق دیا گیا تھا۔ میں نے چارج لینے کے بعد گورنمنٹ کو لکھا کہ پاکستان کے اٹارنی جنرل کی حیثیت بھی دوسرے ممالک کے اٹارنی جنرل کے مطابق ہونی چاہیے۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پہلی فائل جو میرے پرائیویٹ سیکرٹری نے پیش کی وہ اٹارنی جنرل کی کار کے جھنڈے کے متعلق تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ میرے پیش رو مرحوم اٹارنی جنرل نے بڑی خط و کتابت کے بعد گورنمنٹ سے اپنی کار کو جھنڈا لگانے کی اجازت حاصل کی تھی، اِس کے

متعلق چند ضروری کاغذات پر میرے دستخط ہونے تھے ۔ جس کے بعد میری کار پر پاکستان کا جھنڈا لہرانے لگتا ۔

میں نے کہا کہ اس فائل کو تو ردّی کی ٹوکری میں پھینکیے ۔ میں تو بطورِ وزیر بھی اس جھنڈے کو لگانے کے خلاف تھا اور میں کاروں پر جھنڈے کے سلسلے کو طوالت نہیں دینا چاہتا ۔ چونکہ میں نے اپنی کار پر جھنڈا نہیں لگوایا، اس لیے ان کاغذات پر مزید کارروائی کی کوئی ضرورت نہیں ۔ (اب اٹارنی جنرل کی کار پر بھی جھنڈا لگا ہوا ہے)

میں جتنے ممالک میں پھرا (دنیا کا بیشتر حصہ دیکھا ہے) وہاں جھنڈے اور اس قسم کے تکلفات ایسے نہیں دیکھے جیسے ان رسموں کو پاکستان میں ہی پھلتے پھولتے پایا ۔ حتیٰ کہ اب ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہر چھوٹے بڑے کی کار پر کسی نہ کسی قسم کا ایک عدد جھنڈا ضرور لہرا رہا ہے اور ٹریفک پولیس مینوں کا کافی وقت ان جھنڈوں کو سلامی دینے میں صرف ہوتا ہے ۔ خدا کرے کہ یہ بیہودہ رسم پاکستان سے مفقود ہو جائے ۔ (سوائے چند مخصوص عہدے داروں کی کاروں پر) جھنڈوں کی لعنت کو ترک کیا جائے ۔

ایشین افریقن لیگل کنسلٹیٹو کمیٹی

کے اجلاس میں شرکت

دسمبر ۱۹۵۹ء میں مجھے سری لنکا کے دارالحکومت کولمبو میں ہونے والی تیسری ASIAN AFRICAN LEGAL CONSULTATIVE COMMITTEE میں شرکت کی دعوت ملی۔ باقی آٹھ ملکوں نے بڑے بڑے وفد بھیجے۔ لیکن پاکستان کا وفد صرف دو ممبران پر مشتمل تھا۔ میں اور میرا سیکرٹری۔ جو پاکستان فارن سروس کا نوجوان افسر تھا اور پاکستانی سفارت خانہ بمقام دہلی میں بطور ڈپٹی سیکرٹری کام کرتا تھا۔ یہ حضرت بنگالی تھے۔ ایم اے تھے۔ بی۔ ایف۔ ایس کا امتحان پاس کیا ہوا تھا لیکن پاکستان اور اس کے نظریے سے عدم واقفیت میں ید طولیٰ رکھتے تھے۔ پندرہ دن کی کانفرنس میں مجھے ان سے کئی بار علیحدگی میں گفتگو کا موقع ملا تو میں نے انھیں پاکستان کے جواز اور اس کی وجہ تسمیہ سمجھانے کی کوشش کی۔ ایک دن فرمانے لگے کہ جناب یہ مولانا حالی جن کا ذکر بار بار کرتے ہیں، یہ کون بزرگ تھے اور انھوں نے کیا کام کیا؟ مجھے اپنے نوجوان دوست کی اس بات سے بہت افسوس ہوا۔ اور سر راس مسعود مرحوم کا وہ فقرہ یاد آگیا تھا۔ جو ۱۹۲۹ء میں میرے مکان واقع منٹگمری میں میرے ہاں قیام کے دوران کہا تھا۔

"اگر حالی نہ ہوتے تو میں، آپ اور یہ سب لوگ ٹوکری ڈھوتے ہوتے"۔
پاکستانی سفارت خانہ میں کام کرنے والوں کو جو تعلیم دی جاتی ہے، اس میں شراب پینے پلانے کے آداب اور شراب کے محققین سے ان کو وعظ تو سنوائے جاتے ہیں لیکن ان کو یہ نہیں بتایا جاتا کہ ہمارے بزرگ کون تھے۔ انھوں نے ملّت کے واسطے کیا کچھ کیا اور کون سا نظریہ آخر پاکستان بنانے کا باعث بنا۔ یہ ایک نہایت ہی دردناک المیہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہمارے اکثر سفارت خانوں کی کارکردگی (پاکستان کے متعلق) صفر کے برابر ہے لیکن ہماری ملی زندگی کے جہاں یہ افسوس ناک پہلو ہیں، وہاں یہ بات بھی باعث اطمینان ہے کہ خود نئی پود میں اسلام کی طرف رغبت بڑھتی جاتی ہے۔ اِس کے بزرگان اور مشاہیر کی زندگی میں ان کی دلچسپی زیادہ ہو رہی ہے اور وہ ایک دوسرے کے زیادہ قریب آنے کے خواہش مند ہیں۔

کولمبو کانفرنس میں ہر ایک مندوب نے مقالے پڑھے۔ میں نے زبانی تقریر کی جس میں مغربیت کے چنگل سے آزاد ہونے پر زور تھا اور مشرقیت کی قدروں کو فروغ دینے پر اصرار تھا۔ بعض نظروں میں یہ تقریر جوشیلی تھی۔ چنانچہ حسبِ معمول پاکستانی سفیر مقیم کولمبو نے مجھے کہا کہ جناب آپ نے تو بہت زیادہ تیز تقریر کر دی۔ یہ ردِ عمل تو ایک پاکستانی کا تھا۔ کولمبو کے سابق فنانس منسٹر نے جن کو سر کا خطاب بھی ملا ہوا تھا، جن کا نام اب یاد نہیں رہا۔ دوسرے دن مجھ سے ٹیلیفون پر اپنے لڑکے کو ساتھ لانے کی اجازت لی اور جب مجھے آکر ملے تو کہا کہ میں صرف بچے کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ مشرق میں ایسے

لوگ بھی موجود ہیں جو دوسروں کی طرح طلسمِ ہیچ مقداری میں گرفتار نہیں ہیں اور دنیا میں اپنا کھویا ہُوا مقام اور وقار حاصل کرنے کے متمنّی ہیں۔
شام کو ان کی اہلیہ ایک استقبالیہ میں ملیں اور فرمانے لگیں کہ میں اپنے آپ کو بدقسمت سمجھتی ہُوں کہ آج آپ کی تقریر خود حاضر ہو کر نہ سن سکی۔ لیکن جو کچھ میرے خاوند اور دوسرے احباب نے بتایا ہے' اس سے مجھے آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق پیدا ہوا۔ چونکہ آپ میرے خیالات کی ترجمانی کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری تقریر وہاں کے پریس نے نمایاں طور پر شائع کی کیوں کہ تیسرے دن ہی PERADINIA UNIVERSITY سری لنکا کی مسلم سٹوڈنٹ سوسائٹی کی دعوت وصُول ہوئی کہ آپ یہاں آ کر ہمیں اتحادِ عالمِ اسلامی پر لیکچر دیں۔
کولمبو سے چالیس میل دُور یہ یونیورسٹی نہایت خوبصورت ماحول میں واقع ہے۔ کوئی پچاس ساٹھ کے لگ بھگ میزبان' پروفیسر اور طلبا جلسے میں موجود تھے۔ اور جلسے کے سیکرٹری نے میرا تعارف کراتے ہوئے چند ایک ایسی باتیں میری زندگی کے اہم واقعات کے بارے میں کیں کہ مجھے کہنا پڑا کہ یہ تفاصیل تو میں خود بھی بھُول چکا تھا۔ مجھے ان مُسلمان بچّوں سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور میرا پرانا عقیدہ اور بھی پُختہ ہو گیا کہ دنیا میں ملّتِ اسلامیہ کا ہر فرد ایک دوسرے کا بھائی ہے۔ صرف ہمارے راہنماؤں کی کج فہمی، ناتجربہ کاری، بے حسی اور اسلام سے عدمِ واقفیت کی وجہ سے وہ خود اتحادِ عالمِ اسلامی کے راستے میں رکاوٹ بنے ہُوئے ہیں۔ میری رائے میں جتنی جلدی اس گمراہ لیڈر شپ کو آئینی طور پر راستے سے ہٹایا جائے، اتنے ہی اتحادِ عالمِ اسلامی کے امکانات

روشن ہوتے جائیں گے۔

کانفرنس میں میری تقریر کے باعث مجھے ASIAN AFRICAN تنظیم کا وائس پریذیڈنٹ مقرر کیا گیا اور آخری اجلاس کی صدارت میں نے کی اور سری لنکا میں پندرہ دن کے قیام کے بعد اوائل جنوری میں وطن واپس پہنچا۔

سری لنکا میں مسلمان بہت ابتدائی زمانہ میں آئے تھے۔ وہ زیادہ تر عرب تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابھی تک وہاں کے مسلمانوں میں عرب کے متعلق رسم و رواج اور کھانے عربوں جیسے ہیں۔ مرحوم مسٹر برہان الدین جایا BURHAN-UD-DIN JAYA جو پاکستان میں کسی بیرونی ملک کے پہلے سفیر رہ چکے تھے اور سفیروں کے DEAN تھے، نے کولمبو میں کھانے پر بلایا تو وہاں میں نے خالص اسلامی آداب سیکھے۔

سیلون (سری لنکا) کے سفر سے اور اس سے پہلے انڈونیشیا، ملائشیا اور سنگاپور کے سفر کے دوران یہ معلوم ہوا کہ وہاں نورِ ایمان عربوں کی بدولت پھیلا۔ عرب زیادہ تر تاجر تھے۔ کچھ مبلغین تھے اور چند ایک سیاح تھے۔ ان تینوں کی اجتماعی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ آج تک ان علاقوں میں عربی رسم و رواج کو بڑی قدر و منزلت سے دیکھا جاتا ہے۔ سنگاپور کا تو عربی نام سنغا خورہ تھا اور ۱۹۴۴ء میں سماٹرا (انڈونیشیا کے بڑے جزیرے) کا یہ حال تھا کہ وہاں جب تک کوئی حج نہ کر آئے یا حافظِ قرآن نہ ہو، اس کے لیے شادی کرنا مشکل ہوتا تھا۔ عربوں نے سندھ کے ساحل سے لے کر آسٹریلیا کے کناروں تک تہذیب و تمدن کے وہ موتی بکھیرے ہیں کہ آج تک دوسرے اُن سے فیضیاب

ہو رہے ہیں۔ گو ہم ان کی صحیح قدر و منزلت نہیں متعین کر سکے، میرا یقین ہے کہ عرب آسٹریلیا کے کنارے تک پہنچے ہیں لیکن انھوں نے چونکہ اسے آبادکاری کے قابل نہ پایا اس واسطے اُس کی طرف مزید توجہ نہ دی۔ جزیرہ TIMOR جو سنگاپور اور آسٹریلیا کے درمیان واقع ہے، وہاں تو عرب تمدن کے آثار اب بھی پائے جاتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ عرب سیاح آسٹریلیا کے کنارے تک نہ پہنچے ہوں۔

وطن واپسی پر امریکن بار فاؤنڈیشن (جو امریکہ کی قانون دانوں کی سب سے اونچی تنظیم ہے) کی دعوت وصول ہوئی کہ فاؤنڈیشن کے دوسالہ جلسہ کو چیکاگو امریکہ آ کر ۲۰ جنوری ۱۹۶۰ء کو خطاب کرو۔ پہلے جلسہ میں انگلستان کے LORD CHANCELLOR OF ENGLAND کو بلایا گیا تھا۔ اس دفعہ آپ کو دعوت دی جا رہی ہے۔ سب خرچ فاؤنڈیشن کا ہوگا اور یقین ہے کہ آپ آئے تو آپ کو تنظیم کا اعزازی ممبر بنا لیا جائے گا۔ میں نے صدرِ مملکت سے صلاح کی۔ انھوں نے کچھ ضروری کام سپرد کیے ہوئے تھے، جن سے امریکا کے سفر میں رکاوٹ پڑتی تھی۔ چنانچہ میں نے مجبوراً امریکی دوستوں کو لکھ دیا کہ میں ان اعزازات کے لیے بہت ممنون ہوں لیکن حاضری سے معذور ہوں۔

یہ اتنا بڑا اعزاز تھا کہ آج تک کسی ایشائی یا افریقی کو حاصل نہ ہوا تھا لیکن بہ امرِ مجبوری میں نہ جا سکا۔

نیوزی لینڈ کا سفر

فروری ۱۹۶۱ء میں مجھے نیوزی لینڈ بھیجا گیا کہ اقوامِ متحدہ کے سیمینار میں شرکت کر سکوں جس کا موضوع تھا " فوجداری ضابطوں میں بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ "

اس میں جنوب اور جنوب مشرقی ایشیا کے نمایندگان شامل تھے۔ میں پاکستان کا نمایندہ تھا۔ میری بیوی میرے ساتھ تھیں۔ ہم نیوزی لینڈ کے دارالخلافہ ولنگٹن (WELLINGTON) وسط فروری ۱۹۶۱ء میں پہنچے۔ ولنگٹن کو عرفِ عام میں ونڈی ولنگٹن (WINDY WELLINGTON) کہا جاتا ہے۔ وہاں ہوا اس قدر تیز چلتی ہے کہ موٹر سے اُتر کر ہوٹل کے دروازے تک پہنچنا مشکل ہو جاتا تھا۔ ہم حکومتِ نیوزی لینڈ کے مہمان تھے۔ انھوں نے ہماری بڑی خاطر مدارات کی۔ جس کے لیے مجھے تمام مندوبین نے شکریہ ادا کرنے کا موقع بخشا اور ویسے بھی کانفرنس میں یہ تاثر عام تھا کہ پاکستان نے اس میں سب سے زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔

نیوزی لینڈ ایک نہایت خوبصورت اور دلفریب ملک ہے۔ آسٹریلیا سے ۱۴۰۰ میل دُور کوئی بارہ سو میل لمبا اور ڈھائی سو میل چوڑا یہ ملک انگریزی

نوآبادی ہے اور یہاں کے باشندے انگریزوں کو بھی انگریزیت میں مات کرتے ہیں۔ بھیڑیں پالنا اور ڈیری فارمنگ اور لکڑی بہم پہنچانا یہاں کے مشہور شعبہ ہائے زندگی ہیں۔ ۱۹۶۱ء میں نیوزی لینڈ کی کل آبادی قریباً ۲۲ لاکھ تھی یعنی لاہور شہر کی آبادی کے لگ بھگ۔ لیکن ان لوگوں نے اپنی محنتِ شاقہ سے دُنیا میں سب سے بڑے جنگل اُگائے تھے اور اب وہاں کے جنگلات کی دولت ایسی ہے کہ وہ ملکی دولت کا سب سے بڑا حصّہ ہے۔ نیوزی لینڈ کی ہم نے بڑی سیر کی۔ ایک پنجابی مثل ہے "نہ بندہ نہ پرندہ" اور یہ وہاں سچی ہوتی دیکھی۔ میلوں تک سفر کرنے سے کوئی اِکّا دکّا انسان نظر آتا تھا اور پرندہ تو نام کو نہیں تھا۔ معلوم ہوا کہ یہاں کی اصل آبادی جن کو MAORI کہتے ہیں اور جن کو انگریزی نسل کے آبادکاروں نے اب اس طرح ختم کر دیا ہے۔ جیسے کہ امریکہ میں ریڈ انڈینز "RED INDIANS" کو امریکیوں نے کیا ہے وہ لوگ یعنی MAORI آج سے جب کئی سو سال پہلے جزیرے میں آئے تو انھوں نے پہلے پرندوں اور حیوانات پر ہاتھ صاف کیا اور چونکہ نیوزی لینڈ دیگر مقاماتِ دنیا سے سینکڑوں میل دور ہے، اس واسطے باہر سے کوئی پرندہ اتنی لمبی اڑان کر کے پہنچ نہیں سکتا۔ وہاں کا ایک مقامی پرندہ KIWI کے نام سے مشہور ہے لیکن یہ بھی اب چڑیا گھروں میں ملتا ہے۔ کیونکہ یہ اڑنے والے پر کھو بیٹھا ہے اور زیادہ وقت پتوں یا گھاس پھوس میں چھپ کر گزارتا ہے۔

ایک دعوت پر جو نیوزی لینڈ کے وزیراعظم MR. HOLYOAKE نے دی تھی۔ اکثر وقت گفتگو کا اس بات پر صرف ہوا کہ آج نیوزی لینڈ میں ایک نیا پرندہ دیکھا گیا ہے۔ یہ ایک عجوبہ بات تھی اور یہی وجہ ہے کہ کھانے پر گفتگو کا موضوع بنی رہی۔ عام طور پر کھانے وغیرہ کے موقعوں پر اس بات کا چرچا رہتا تھا کہ فلاں مویشی فارم میں ایک آدمی نے قینچی سے اتنی

بھیڑوں کی اون ایک گھنٹہ میں کاٹی یا فلاں علاقے میں اتنے درخت لگائے۔

نیوزی لینڈ کے جنگلوں کو دیکھ کر جو انسان نے خود لگائے تھے، پاکستان کی حالت زار سے مقابلہ کیا تو کفِ افسوس ملنا پڑا۔ یہاں کے پہاڑوں اور پہاڑوں کے دامنوں سے گزشتہ پچیس برس میں اس بیدردی سے درخت کاٹے گئے ہیں کہ اکثر پہاڑ اب گنجے نظر آتے ہیں۔ ہر سال بڑے شدومد سے ہفتہ شجرکاری منایا جاتا ہے۔ ٹی وی۔ ریڈیو اور اخباروں کے ذریعے لوگوں کو خوشخبری دی جاتی ہے کہ فلاں صاحب نے فلاں جگہ ایک پودا لگایا ہے اور اس سال اتنے کروڑ درخت لگیں گے۔ لیکن سالہا سال گزرنے کے بعد حالت جوں کی توں ہے، بلکہ بدتر کہ پرانے درخت تو کاٹے جا رہے ہیں تو نئے درختوں کا پتہ ہی نہیں ملتا۔ میں نے اوپر عرض کیا تھا کہ نیوزی لینڈ انگریز سے بھی زیادہ انگریزیت کا دلدادہ ہے لیکن جمہوری اور سادہ زندگی بسر کرنے کا یہ عالم ہے کہ جب ہم دونوں میاں بیوی MR HOLYOAKE وزیر اعظم نیوزی لینڈ کی سرکاری رہائش گاہ پر ان سے ملنے گئے تو ان کی کوٹھی پر کوئی پہرہ دار نہ تھا نہ کوئی ملازم وہاں نظر آیا۔ گھنٹی کرنے پر ایک نوجوان لڑکی نے کہا کہ میرے ابا تو دفتر گئے ہوئے ہیں۔ ہم نے اپنا ملاقاتی کارڈ چھوڑا اور اسی شام کو وزیر اعظم کے ساتھ ایک تقریب پر ملاقات کے دوران انھوں نے بتایا کہ آپ میری ذاتی رہائش گاہ آ کر دیکھیں، وہ میری سرکاری رہائش گاہ کے مقابلے میں ایک شاندار محل ہے جو سمندر کے کنارے اونچی جگہ پر واقع ہے۔ لیکن چونکہ مجھے سرکاری رہائش گاہ میں رہنا پڑتا ہے، اس لیے اس مکان میں اٹھ آیا ہوں (ان کو وزیر اعظم بنے چند ہی ماہ ہوئے تھے) اس کے ساتھ ایک موٹر ورکشاپ ہے۔ جہاں سے سارا دن مشینوں کے چلنے کی گڑگڑاہٹ اور شور آتا رہتا ہے لیکن کیا کیا جائے۔ ضابطہ یہی ہے کہ وزیر اعظم سرکاری رہائش گاہ پر رہے۔

ہر بات میں دوسروں سے مقابلہ تو درست نہیں۔ لیکن انسان یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ پاکستان میں کئی اور ایشیائی ملکوں میں فرنگیوں کے سنہری اصول پر عمل نہیں ہوتا اور زیادہ زور

جاہ و جلال و شان و شوکت اور عزت و افتخار پر دیا جاتا ہے۔ پاکستان میں تو اب اس بے معنی اور لغو نمائش کی حد ہو گئی ہے جس کا یہ غریب ملک متحمل نہیں ہو سکتا۔

نیوزی لینڈ سے واپسی پر ہم کچھ دن سنگاپور ٹھہرے۔ سنگاپور بھی دنیا کے عجائبات میں ہے۔ غالباً ۱۶ میل × ۱۲ میل کا رقبہ ہے لیکن دنیا جہاں کی ہر چیز یہاں دستیاب ہے کیونکہ یہ ایک بین الاقوامی منڈی ہے۔

جب ہم ۱۹۵۹ء میں دہلی گئے تھے تو مسٹر LEE KWAN YU موجودہ وزیراعظم سنگاپور کی اہلیہ مسز YU مندوب کی حیثیت سے آئی ہوئی تھی جو کئی تقریبات میں میری بیوی سے مل کر اچھی طرح متعارف ہو گئیں۔ سنگاپور کے قیام کے دوران یہ انہیں ملنے گئیں۔ وہ انہیں گورنمنٹ ہاؤس میں ملیں۔ جسے میری بیوی نے کچھ سنسان پایا اور کوئی گہما گہمی نظر نہ آئی۔ وزیراعظم کی اہلیہ نے غالباً ان کے خیالات کو بھانپ لیا۔ انہوں نے کہا کہ میں اور وزیراعظم اپنی ذاتی رہائش گاہ پر رہتے ہیں۔ گورنمنٹ ہاؤس میں نہیں رہتے جب کسی کو ملنا ملانا ہو تو یہاں آجاتے ہیں۔ اتنی بڑی عمارت کا رکھ رکھاؤ کا خرچ کیوں ملک پر ڈالا جائے۔

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ قدم قدم پر مقابلہ کرنا نامناسب معلوم ہوتا ہے لیکن انسان آخر انسان ہے۔ کرے تو کیا کرے اور کیا نہ کرے جو اپنے ہاں نظر ڈالتے ہیں (اگرچہ تو ایک طرف گندم کے لیے ہم دوسروں کے محتاج ہیں) لیکن ظاہری شان و شوکت کے بہت دلدادہ ہیں۔ ہم ظاہری رکھ رکھاؤ اور تکلفات کو انگریز سے بھی زیادہ پسند کرتے ہیں بلکہ ان کی قائم کردہ حد بندیوں پر مزید اضافے کر رہے ہیں۔

نیوزی لینڈ سے واپسی پر سنگاپور پہنچنے سے پہلے جکارتہ گئے جہاں میں نے مسٹر سوئیکارنو مرحوم صدر انڈونیشیا سے ملاقات کر کے پرانی دوستی تازہ کر لی تھی۔ چنانچہ ان دنوں انڈونیشیا میں سب مسٹر سوئیکارنو اس وقت تک ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت اختیار کر چکے تھے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے اپنی قوم میں ایک بے پناہ جذبۂ زندگی پیدا کر دیا تھا۔ وہ قوم جو تعلیم سے بالکل

جاری رکھی گئی اور اب بھاشا انڈونیشیا کے ذریعے اس کا بچہ بچہ انڈونیشی زبان میں اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر سکتا تھا۔

۱۹۶۱ء میں ہم نے انڈونیشیا کا نقشہ ہی بدلا ہوا دیکھا۔ ترقی کی دوڑ میں انڈونیشیا دوسرے ایشیائی ملکوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلتا نظر آیا۔ مسٹر سوئیکارنو کی پالیسیوں کے باوجود MASJUMI PARTY مس جومی پارٹی کے (وہاں کی جماعتِ اسلامی) پر کڑی پابندی کے باوجود میں جن لوگوں کو ملا اُن میں اسلام اور اخوتِ اسلامیہ کا بے پناہ جذبہ پایا یوں ہی محسوس کیا کہ اپنے بھائیوں کے درمیان وقت گزر رہا ہے۔ اب انڈونیشیا بہت بدل چکا ہوگا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اب بھی وہاں کا مسلمان، مسلمان ہے اور دوسرے مسلمان کو اپنا بھائی سمجھتا ہے اگرچہ مملکت کو لادینی SECULAR قرار دیا گیا ہے لیکن مسلمان سے اسلام کی محبت جدا نہیں کی جا سکتی۔ مسلمان وہاں کا اب بھی ماشاءاللہ مسلمان ہے اور رہے گا انشاءاللہ۔

سنگاپور میں ۵ دن رہے اور اپنے پُرانے احباب حاجی محمد خاں ملک افتخار اور ان کے شریک کار مسٹر جان نمازی کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ نمازی صاحب کے ہاں ہم ٹھہرے اور حاجی صاحب کی معیت میں ملائشیا کا بھی کچھ حصہ دیکھا۔ جوہور (JOHORE) کی ریاست کے صدر مقام میں وہاں کے اکابر سے ملاقات کی۔

سنگاپور میں قیام کے دوران حسنِ قرأت کا مقابلہ دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ گورنر صاحب سنگاپور کے ساتھ ہمیں معمولی کرسیوں پر بٹھایا گیا۔ وہ خود بھی اسی قسم کی معمولی کرسی پر بیٹھے تھے۔ کوئی پُر تکلف مسند اُن کے لیے نہیں بنائی گئی تھی۔ البتہ قاری صاحبان کے لیے اونچا پلیٹ فارم اور خوبصورت شامیانہ لگا ہوا تھا۔ جو بات اس محفل کی مجھے سب سے زیادہ پسند

آئی، یہ تھی کہ سامعین داد دینے کے لیے تالیاں نہ بجاتے تھے۔ بلکہ "مرحبا" اور "طیب" کے کلمات استعمال کرتے تھے۔ مجھے "طیب" کا لفظ خاص طور پر پسند آیا۔ پاکستان میں بھی میں نے اسے رائج کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ہماری قوم کو تالیاں پیٹنے میں مزا آتا ہے اور اب تو عید میلاد النبیؐ کے متبرک تہوار کے جلوسوں میں بھی "تہے جمالو" کی دھن پر بھنگڑا ناچ ہوتا ہے۔ ان لوگوں سے "طیب" جیسے پاکیزہ لفظ اپنانے کی کیسے توقع ہو سکتی ہے۔

۳۔ ۴ سال ہوئے حاجی محمد خاں صاحب نے بتایا کہ سنگاپور کی غیر اسلامی ریاست فطرانہ وصول کرتی ہے اور ۵ا مسلمان اکابرین کی کمیٹی کے ذریعہ مسلمانوں کے مذہبی کاموں پر خرچ کرتی ہے۔ حاجی صاحب اس کمیٹی کے رکن ہیں۔ تجویز ہے کہ زکوٰۃ کی وصولی بھی اسی طریقے سے کی جائے۔

ورلڈ پیس تھرو لا کے اجلاس

منعقدہ ٹوکیو میں شرکت

(قانون کی بالادستی سے امن کا قیام) کی جانب سے دعوت نامہ آیا ہوا تھا، کہ ستمبر ۱۹۶۱ء میں اس کانفرنس کا علاقائی اجتماع ٹوکیو میں ہو رہا ہے، جس میں آپ شامل ہو کر اختتامی نشست کی صدارت کریں۔ پاکستان کے ممتاز قانون دان۔ مسٹر اے۔ کے بروہی کو بھی شرکت کی دعوت تھی۔ چنانچہ میں، میری بیوی اور مسٹر بروہی ہانگ کانگ دیکھتے ہوئے ٹوکیو پہنچے۔

ہانگ کانگ غالباً دنیا کا عجیب ترین علاقہ ہے۔ عملداری انگریزی کی ہے۔ آبادی چینیوں کی ہے اور کمیونسٹ چین سے اس کی حد ملتی ہے۔ یہاں کوئی قابل ذکر فوج نہیں، نہ ہی کوئی خاص دفاعی انتظامات ہیں۔ چین جیسا عظیم الشان ملک اگر چاہے تو ایک دن میں ہانگ کانگ کو اپنے تسلط میں لے سکتا ہے لیکن چین کو اس جزیرہ نما کی ضرورت ہے۔

HONG KONG اور KOWLOAN دونوں قریب قریب واقع ہیں۔ اور دونوں کو عرفِ عام میں ہانگ کانگ ہی کہا جاتا ہے۔ یہاں دنیا بھر کی چیزیں بکتی ہیں اور بنتی ہیں۔ غالباً اس حصہ دنیا میں یہ سب سے بڑی منڈی ہے۔ سنگاپور میری رائے میں نمبر ۲ پر آتا ہے۔

جاپان ہم صرف دس دن رہ سکے۔ وہاں کے قرب و جوار میں اس موسم میں

TYPHONE (طوفان) آتے ہیں۔ وہ اپنی نوعیت کے خاص قدرتی حادثات ہوتے ہیں۔ ان کی رفتار اتنی تیز اور ان کی شدت اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ جدھر سے وہ گذرتے ہیں، اپنے پیچھے تباہی و بربادی کی تصویر چھوڑ جاتے ہیں۔

ہمیں راستہ میں NANAY طوفان کی تندی کا تھوڑا سا مزہ چکھنا پڑا۔ دورانِ پرواز ہمیں بتایا گیا کہ NANAY ہمارے جہاز سے دو سو میل کے فاصلے سے گزر رہا ہے۔ لیکن اس وقت بھی ہمیں حفاظتی پیٹیاں باندھنے کی ہدایت کی گئی۔ کیونکہ جہاز کی پرواز ملائم نہ رہی تھی۔

ٹوکیو میں ہم وہاں کے اس وقت کے مشہور ترین امپیریل ہوٹل میں ٹھہرے جس کے سامنے ایک بہت بڑا پلازہ (چوک) تھا۔ جہاں دن بھر ہزاروں موٹر کاروں کی بھرمار رہتی ہے۔ دوپہر کو ہمیں ہوٹل والوں کی طرف سے ہدایت ملی کہ آج شام ہوٹل سے باہر نہ نکلیے کیونکہ خطرہ ہے کہ NANAY ٹوکیو کی طرف رخ کر رہا ہے لیکن پانچ بجے کے قریب پھر اطلاع ملی کہ NANAY نے رخ موڑ لیا ہے اور ٹوکیو اس کی زد سے بچ گیا ہے۔ چنانچہ چھ بجے کے قریب میں، میری بیوی، بردہی اور ایک امریکی خاتون ہوٹل کی دیوار کے ساتھ ساتھ ہوئے باہر نکلے تو ایک عجیب سماں دیکھا ایک ہُو کا عالم تھا۔ وہ پلازا جہاں موٹروں کی بھرمار کی وجہ سے تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی، بالکل سنسان تھا۔ دور دور تک کوئی بس اور موٹر کار وغیرہ نظر نہ آتی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا، جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارے شہر میں وہ دوسری اطلاع جو ہمیں ہوٹل والوں نے دی تھی، نہیں پہنچی تھی۔ اور وہ پہلی اطلاع پر ہی خائف ہو کر گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔

ٹوکیو میں پہلی "علاقائی بین الاقوامی امن کانفرنس بذریعہ قانون" کے اجتماع میں افتتاحی نشست کی صدارت کی اور خدا کا شکر ہے کہ ایک دو نزعی مسائل کو اس خوش اسلوبی سے حل کیا کہ

کہ نہ صرف چند امریکی مبصرین نے جو کانفرنس میں موجود تھے، اس کی داد دی بلکہ دوسرے دن اخباروں میں بھی میرے TACT فراست اور تدبر کا ذکر تھا۔ میں اس تنظیم میں ۱۹۶۱ء میں شامل ہوا اور آج تک اس میں شامل ہوں۔ حال ہی میں اس کی ۲۱ ممبروں کی ADVISORY کونسل کا ممبر چنا گیا ہوں۔ اتنے سال میں اس تنظیم سے کیوں منسلک رہا، اس کا تفصیلی ذکر بعد میں کروں گا۔ مختصر یہ کہ میں نے اس تنظیم کو امنِ عالم بذریعہ قانون فروغ دینے کے لیے مفید پایا اور اس لیے میں اس میں حتی المقدور شامل ہو گیا۔ ٹوکیو میں پانچ دن کے قیام کے بعد ہم "کیوٹو" (پرانا دارالخلافہ) دیکھنے گئے۔ پھر "نارا" گئے اور خوش قسمتی سے ہی "فیوجی یاما" FUJI YAMA جسے "فیوجی سان" یعنی فیوجی صاحب کہتے ہیں، کوئی پندرہ منٹ تک دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ مطلع بالکل صاف تھا اور اس نظارے کو دیکھنے کے واسطے کئی سیاح کئی کئی دن منتظر رہتے ہیں۔ برف سے ڈھکا ہوا یہ پہاڑ بہت متبرک سمجھا جاتا ہے اور جاپانی زندگی میں اس کا اکثر ذکر آتا ہے۔

کیوٹو کے پرانے محل میں مختلف کمرے اسی طرح سجے ہوئے تھے۔ جس طرح آج سے کئی سو سال پہلے کی معاشرت تھی۔ وہ فوجی اقتدار کا زمانہ تھا۔ شوگم SHOGUM فوجی کمانڈر درحقیقت ملک کے حکمران تھے۔ بادشاہ کا وقار محض ایک افسانہ تھا۔ طاقت فوجی جرنیلوں کے پاس تھی۔ نارا میں گوتم بدھ کا دنیا میں سب سے اونچا بت دیکھا جو ۵۴ فٹ اونچا ہے۔ اور دسویں دن وطن واپس لوٹے۔ جاپان کو دیکھنے کے واسطے دس دن نہیں دس مہینے چاہئیں۔ یہ وہ ملک ہے، جس کے دو شہروں ہیروشیما اور ناگاساکی کو امریکیوں نے دوسری جنگِ عظیم کے آخری دور میں اس وقت کے امریکی صدر مسٹر ٹرومین TRUMAN کے حکم سے ایٹم بم سے اڑایا تھا اور وہ تباہی مچی تھی کہ آج تک اس بربریت کی مثال نہیں ملتی۔ اس عبرتناک تباہی کے بعد جاپان نے شکست مان لی اور کئی سال تک کیلئے جاپان پر امریکیوں کا مکمل اقتدار و غلبہ قائم ہو گیا۔ جنرل میکارتھر

امریکی کمانڈر کے بنائے ہوئے آئین کے مطابق جاپان GEN. MACC ARTHER کو نہتا کر دیا گیا تھا۔ امریکی تہذیب اور تمدن ان پر اس طرح مسلط کیا گیا تھا کہ سوائے نیم امریکن بننے کے جاپانیوں کا زندہ رہنا مشکل تھا۔ لیکن داد دینی پڑتی ہے، اس قوم کی استقامت کی اور پامردی کی کہ جنگی میدان کو چھوڑ کر اس نے صنعتی میدان خصوصاً الیکٹرونک ELECTRONIC شعبے میں وہ حیرت انگیز ترقی کی ہے کہ اب امریکہ جیسے فاتح ملک اقتصادی طور پر اس سے خم کھاتے ہیں۔ جاپانی ساخت کی موٹروں نے تو امریکن موٹر انڈسٹری ہی نہیں، ساری دنیا کی موٹر سازی کی انڈسٹری کو جلا کر رکھ دیا ہے اور اس طرح ٹیلیویژن۔ ریڈیو۔ ٹرانسسٹر۔ کیمرے۔ کمپیوٹرز COMPUTOR۔ مشینیں۔ گھڑیاں غرض کہ ہر ایک شعبۂ صنعت میں دنیا پر سبقت لے گئے ہیں اور وہ جو امریکیوں کا خیال تھا کہ جاپانیوں کی نئی نسل کو امریکن بنا کر ان کو ان کی اس بنیاد سے جدا کر سکیں گے، اتنا غلط ثابت ہوا کہ ہم نے دیکھا کہ بظاہر امریکی تہذیب کا بہت زور شور تھا لیکن ہر جاپانی اندر سے وہی پرانا جاپانی تھا جو جنگِ عظیم سے پہلے تھا۔ اس میں سر مو فرق نہیں آیا اور اس لحاظ سے میری رائے میں امریکہ کا استبدادی تجربہ بالکل ناکام رہا ہے۔ جاپانی اخلاق والی، حوصلہ مند کارکن، ان تھک محب الوطن قوم ہے۔ جو کسی مصنوعی دباؤ میں آ کر اپنا محور چھوڑنے کو تیار نہیں۔ جاپان آج بھی زندہ قوموں میں شامل ہے اور پاکستان کو اس سے کئی اچھے سبق مل سکتے ہیں۔ جن میں سے تین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حب الوطنی۔ انتھک محنت اور خوش اخلاقی جاپان کے ہوائی اڈے ہینڈہ HENDA پر ہوائی ٹریفک کی وہ ریل پیل ہوتی ہے کہ ایک ہی وقت میں دو۔ دو۔ تین تین جیٹ ہوائی جہاز اترتے ہیں اور اس طرح پانچ پانچ منٹ کے بعد پروازیں ہوتی ہیں۔ دنیا کا مصروف ترین ہوائی اڈہ ہے۔ لیکن کیا مجال کہ کسی سے بدسلوکی کی جائے۔ یہ میں پندرہ سال پہلے کی بات کر رہا ہوں۔ آج نا معلوم کیا حال ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ جاپانی اخلاق کی بلندی میں

فرق نہ آیا ہوگا۔

واپسی پھر ہانگ کانگ کے راستے ہوئی۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ ایک عجیب وغریب جگہ ہے۔ ایک تو اس کا ہوائی اڈہ عجائباتِ دنیا میں شامل ہوتا تھا۔ جس رن وے RUNWAY پر جہاز اترتے ہیں، سمندر میں پتھر ڈال کر کوئی دو میل سے زیادہ لمبا، کوئی دو فرلانگ چوڑا بنایا گیا ہے۔ جہاز کا اترنا خطرناک نظر آتا ہے۔ خصوصاً جب جہاز اونچے پہاڑوں سے اتر کر سمندر کے عین بیچوں اس تنگ ٹرک پر اترے۔ اس ہوائی اڈے کا نام کائی ٹیک KAITEK ہے۔ اس زمانے میں تو شام اور صبح کے درمیان کوئی ہوائی جہاز نہ اتر سکتا تھا اور نہ پرواز کر سکتا تھا۔ لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ جدید ترین الیکٹرانک آلات کی مدد سے رات کو بھی ہوائی جہاز اترتے اور چڑھتے رہتے ہیں۔ ہانگ کانگ کی گھریلو صنعت دنیا بھر میں مشہور ہے۔ چیزیں سستی بھی ہیں اور کارآمد بھی۔ خاصی پائیدار بھی ہیں اور خوبصورت بھی۔ ہم نے ٹوکیو سے واپسی پر جہاز پر سے پیغام پہنچایا کہ کوئی اچھا درزی کپڑوں کے نمونے لے کر ہمیں ہانگ کانگ کے ہوائی اڈے پر ملے۔ چنانچہ کسٹم سے نکلتے نکلتے ایک دکاندار نے ہمیں کپڑوں کے نمونے دکھائے۔ ناپ لیے، دوسرے دن ٹرائی TRY دی اور تیسرے دن سوٹ تیار کر کے دے دیئے۔ جو اتنے اچھے، خوبصورت اور مضبوط سلے ہوئے تھے کہ جو سوٹ میں نے لندن کے RUNWAY سے بنوائے (لندن کا سب سے فیشن ایبل اور مہنگا کپڑا سینے والا بازار) تھے۔ ہانگ کانگ کے سوٹ ان کا کامیاب مقابلہ کر سکتے ہیں۔

وطن واپس پہنچ کر وکالت کے پیشے کی شان کو اونچا کرنے کے واسطے جو کچھ مجھ سے ہو سکا، میں نے کیا۔ میرا یہ قول ہے کہ ایک کامیاب وکیل قوم کا خادم ہونا چاہیے اور اس کے ضروری سلسلے میں اس کی خدمت کرنا چاہیئے۔

اسی سال مادرِ ملت مس فاطمہ جناح کے اعزاز میں میرے گھر میں عصرانہ دیا گیا۔ چیدہ چیدہ مہمانوں کا محترمہ سے تعارف کرایا گیا۔ درویش منش جسٹس رستم کیانی (مرحوم) بھی محفل میں موجود تھے۔ ان کو میں نے اشارہ کیا کہ اب آپ کی محترمہ کے پاس بیٹھنے کی باری ہے۔ انھوں نے نہایت انکسار سے انکار کی کیفیت اختیار کی۔ جس پر مجھ سے اور کچھ نہ بن سکا تو میں نے خود محترمہ سے جا کر عرض کی "جسٹس کیانی موجود ہیں، حکم ہو تو بلا لوں۔" محترمہ خوشی سے بولیں۔ "اچھا! ہاں ان کو ضرور میرے پاس بلائیے۔ میں تو ان سے ملنے کی دیر سے منتظر ہوں۔" اب میں نے کیانی صاحب مرحوم سے کہا کہ لیجیے حضرت! اب تو حکم نامہ آ گیا۔ چنانچہ وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور بصد ادب محترمہ کے صوفے پر بیٹھ گئے اور اسی مقام پر مرحوم نے وہ تاریخی فیصلہ کیا جو کہ اگر انھیں قدرت پورا کرنے کی مہلت دیتی تو قائدِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ صحیح رنگ میں ملت کے سامنے نمودار ہو جاتے۔ محترمہ نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کیانی صاحب قائدِ اعظم کی سوانح حیات لکھیں۔ مرحوم نے بخوشی منظور کیا۔ لیکن افسوس کہ موت نے ان کو اتنی فرصت نہ دی کہ وہ ایک لافانی چیز قوم کے واسطے چھوڑ جاتے۔ HECTOR BOLITHO (ایک انگریز مصنف) نے قائدِ اعظم مرحوم کی سوانح عمری لکھی۔ لیکن نہ مرحوم کیانی والا جذبہ اس میں نظر آتا ہے اور نہ ہی پاکستان میں کوئی دوسرا رستم کیانی پیدا ہوا۔

قانون دانوں کے عالمی کمیشن میں شرکت

قانون دانوں INTERNATIONAL COMMISSION OF JURISTS کی عالمی کمشن کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا کہ بنکاک (تھائی لینڈ) میں فروری ۱۹۶۲ء میں کمشن کے اجلاس میں کمیٹی نمبر ۲ کی صدارت کروں۔ میں اور میری بیوی فروری ۱۹۶۲ء میں بنکاک پہنچے۔ کل ۳ کمیٹیاں تھیں۔ میں دوسری کا صدر تھا۔ جس کے ممبران مسٹر ہدایت اللہ جج بھارتی سپریم کورٹ جو بعد میں بھارت کے چیف جسٹس ہوئے۔ SIR GUY PAWELS جو نیوزی لینڈ کے OMBUDMAN تھے (اب بھی ہیں اور ہر سال اپنے محکمہ کی رپورٹ مجھے بھیجتے ہیں) اور مسٹر MARSH سابق سیکرٹری جنرل I.C.G. تھے۔ خدا کے فضل سے میری صدارت بڑی کامیاب رہی۔ اور مسٹر سان میکبرائیڈ SEAN MACBRIDE سیکرٹری جنرل نے اس کا اعتراف اجلاس میں کیا۔ دورانِ قیام بنکاک میں نے وہاں کے مسلمانوں کی تنظیم کے سامنے اتحادِ عالمِ اسلامی پر تقریر کی۔ وزیر مذہبی امور CHALA RAJ MANTRY (چولاراج منتری) صدر تھے۔ تھائی لینڈ (سیام) میں اس وقت تیس لاکھ مسلمان تھے۔ شہر میں ان کی کافی تنظیمیں تھیں۔ میں نے اپنے مسلمان سفیر کو جو میرے پرانے دوست تھے اور پہلے آئی۔سی۔ایس میں تھے) لکھا کہ کسی نمائندہ اسلامی انجمن کے سامنے میری تقریر کا بندوبست کر دیں۔ ساتھ ہی اپنے ایک عزیز مسٹر ایم اے کے

چودھری (جو اس وقت یو این او کی کسی تنظیم میں بنکاک کام کر رہے تھے۔) بعد میں مشرقی پاکستان کے انسپکٹر جنرل پولیس ہوئے۔ جنگی قیدی رہے اور اب اسلام آباد میں ایک بڑے عہدے پر متمکن ہیں، کو بھی لکھا۔ میرے دوست سلمان منظر کا جواب آیا کہ انھیں تو پتہ نہیں کہ کوئی مسلمان انجمن ہے یا نہیں البتہ مسٹر چودھری (جن کو آپ نے خط لکھا ہے) پتہ کر کے آپ کو اطلاع دیں گے۔

خدا خوش رکھے چودھری صاحب کو انھوں نے ایک نہایت اعلیٰ جلسہ کا اہتمام کرا دیا۔ جہاں کوئی چار سو کے قریب سیامی مسلمان بھائی بہنیں جمع تھیں اور جنھوں نے نہایت توجہ سے میری تقریر سُنی۔ جس کا ترجمہ تھائی زبان میں پہلے سے تیار ہو چکا تھا۔ اخوتِ اسلامی کا عجیب روح پرور نظارہ دیکھنے میں آیا جو ہر لحاظ سے حوصلہ افزا تھا۔

لیکن افسوس ہمارے مسلمان سفیر صاحب کو پتہ ہی نہیں تھا کہ مسلمانانِ تھائی لینڈ بھی اپنے سینے میں وہی تڑپ رکھتے ہیں جو ملّتِ اسلامیہ کے ہر فرد کا خاصہ ہے۔ کاش کہ ہمارے سفارت خانے اسلام اور پاکستان سے کچھ بھی تو محبت رکھتے تو قائدِ اعظم کا خواب پورا ہو سکتا تھا۔

دنیا کے اکثر ملکوں (جن میں کئی اسلامی ممالک بھی شامل تھے) کا چکر لگانے، حالات کا مشاہدہ اور مطالعہ کرنے سے مسلمانوں کو کسی ایک متفقہ پلیٹ فارم پر جمع کرنے کا خیال آنا ایک قدرتی امر تھا۔ چنانچہ آیا۔ لیکن قبل اس کے کہ عملی جامہ پہنایا جائے یہ مناسب خیال کیا کہ آب دیارِ غیر کی بجائے دیارِ حبیبؐ میں حاضری دی جائے۔ اور وہاں کے الطاف و فیوض سے مالا مال ہوا جائے۔

ادائیگی عمرۂ اوّل

بس اس خیال کے آتے ہی دل میں ایک تڑپ سی پیدا ہوئی اور ساتھ ہی یہ بھی خیال آیا کہ اتنا وقت کیوں ضائع کیا۔ پہلے ہی اِدھر کیوں نہ رجوع کیا۔ بہرحال اللہ کا فضل شامل حال ہو تو سب کچھ ہو جاتا ہے۔ مارچ ۱۹۶۲ء میں میں اور میری بیوی پہلا عمرہ کرنے کی غرض سے ارض مقدس کی طرف روانہ ہوئے۔ پہلے بیروت گئے کہ وہاں ہمارے ایک بہت پرانے دوست اور ایک عاشقِ رسولؐ مسٹر نسیم حسن (مسٹر فضل حسین مرحوم کے صاحبزادے) پاکستان کے سفیر تھے۔ وہ اسلام کے سچے فدائی تھے اور مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے حالات ان سے سن کر جو لطف آتا تھا وہ کسی بزرگ کامل کی صحبت میں ملے تو ملے۔ عام تعلیم یافتہ مسلمان اس بلندی تک نہیں پہنچا۔ جہاں نسیم حسن مرحوم کو خدا نے پہنچایا تھا۔ جدہ کے ہوائی اڈہ پر جہاز اترا تو ہم دونوں میاں بیوی کے اشتیاق کا یہ عالم تھا۔ کہ RUNWAY کو ہاتھ لگا کر چوما کہ یہ بھی دیارِ حبیبؐ کا حصہ ہے۔ سبحان اللہ عجیب رقت طاری تھی جدہ کو دیکھ کر مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ پہنچ کر کیا حال ہوگا؟

بیروت سے جدہ پہنچے۔ جدہ میں ہم نے اپنے پرانے دوست (مرحوم چودھری علی اکبر خان جو اس وقت جدہ میں پاکستان کے سفیر تھے۔) کے ہاں قیام کرنا تھا۔ ان کے ہاں پہنچ کر ہم نے کہا کہ ایرکنڈیشنڈ تو ہم نہیں لگائیں گے۔ دروازے کھڑکیاں کھلی چھوڑنی پڑیں گی۔ انھوں نے کہا یہاں تو رواج ہی یہی ہے کہ دروازے بند ہی نہیں

کرتے، کیونکہ اس اسلامی ریاست میں چوری نہیں ہوتی ـــــــ
چونکہ ہم بھی ایک اسلامی ریاست کے باشندے تھے۔ ہمیں یہ سن کر تعجب ہوا لیکن حجازِ مقدس کے بار بار سفر کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوگئی کہ یہ حضورؐ کے آئین کا کرشمہ ہے کہ حجازِ مقدس میں اسلامی شریعت نافذ ہونے کی وجہ سے چوری کا نام و نشان نہیں۔

بیروت میں ہمیں میاں نسیم صاحب کہنے لگے کہ مکہ مکرمہ "شہرِ جلال" ہے اور مدینہ منورہ "شہرِ جمال" ہے۔ ہم نے اس کی تشریح مانگی تو کہنے لگے کہ یہ کیفیت الفاظ میں بیان نہیں کی جا سکتی۔ دیکھنے کے بعد آپ کا دل خود بتا دے گا کہ دونوں جگہوں کا اعلیٰ و ارفع مگر جدا مقام ہے۔ ہمارے اصرار پر اتنا کہا کہ مکہ میں اللہ تعالےٰ کی ہیبت، سطوت اور جبروت کا دل پر نقش ہوتا ہے تو مدینہ منورہ میں ایک ایسا دل گداز ماحول ہوتا ہے کہ اللہ کی عظمت برقرار رہتے ہوئے بھی انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے بھیجے ہوئے پیغمبرؐ نے ہمیں امن و آشتی اور محبت کے ساتھ زندگی گذارنے کے وہ سبق سکھا دیئے ہیں کہ مولیٰ کی شانِ جمالی کا پورا مظاہرہ مدینہ منورہ میں نظر آتا ہے۔

۱۹۶۳ء میں جدہ بڑھنا شروع ہوا تھا۔ اب تو وہ ایک عظیم الشان صدر مقام کی حیثیت حاصل کر چکا ہے)۔ تیل کی دولت حجازِ مقدس کے بدوؤں کو اونٹ اور گدھے کی سواری سے ہٹا کر بیش بہا اور قیمتی کاروں میں سوار کرا چکی تھی۔ ملک میں ترقی کے آثار نمایاں تھے۔ سڑکیں بن رہی تھیں۔ عمارتیں کھڑی ہو رہی تھیں۔ سکول اور کالج کھل رہے تھے۔ تجارتی منڈیاں قائم ہو رہی تھیں اور دولت کی ریل پیل نظر آتی تھی۔ جدہ میں ایک دن قیام کے بعد اپنی دیرینہ آرزو پوری ہونے کا موقع آیا۔ اور ہم احرام باندھنے کے بعد (احرام آپ کو معلوم ہے دو چادروں پر مشتمل ہوتا ہے اور جو بدن کے گرد اس طرح لپیٹی جاتی ہیں کہ بایاں شانہ کھلا ہے۔) موٹر میں سوار ہو کر چودھری علی اکبر مرحوم کے

ملازم کے ساتھ مکۂ مکرمہ روانہ ہوئے۔ جب جدہ کے RUNWAY پر ہمارے جذبات کا یہ عالم تھا تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے خیالات اس سڑک کے متعلق کیا ہوں گے جو ہمیں جدہ سے مکۂ مکرمہ لے جارہی تھی۔

لبیک اللّٰھم لبیک ، لبیک لا شریک لہٗ ۔ لبیک ۔ ان الحمد و النعمۃ لک و الملک ۔ ولا شریک لک ۔ کا ورد زبان پر جاری تھا۔ جب دور سے مسجد حرام کے میناروں پر نظر پڑی تو دل کی کیفیت بیان سے باہر ہے۔ شبرا ہوٹل جو اس وقت تین منزلہ تھا (اور اب دس منزلہ ہے) میں قیام کیا پھر خانۂ خدا میں حاضری دی۔ سبحان اللہ کیا روح پرور نظارہ تھا۔ ایک چھتیس فٹ ، انتالیس فٹ کی مکعب عمارت بھاری پتھروں کی بنی غلاف میں لپٹی ہوئی ایک طرف حجرِ اسود ، اس کے ساتھ ملتزم (خانہ کعبہ کے دروازے کی چوکھٹ) جہاں بندگانِ خدا عاجزی اور خشوع و خضوع سے مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ دوسری طرف حطیم وہ نصف گول دائرہ جس میں بیٹھ کر آپ عبادت کر سکتے ہیں۔ ایک کونے پر رکنِ یمانی اور اردگرد سنگ مرمر کا فرش جس پر زائرین چوبیس گھنٹے (سوائے نماز کے اوقات کے) خانہ کعبہ کے طواف میں مشغول رہتے ہیں۔ سات طواف ہوتے ہیں۔ حجرِ اسود کو بوسے دینا سنّت ہے۔ ہر طواف میں دنیا و مافیہا کی بہتری کے لیے اور ہدایت و رشد کے لیے دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ بعض لوگ خود کتابوں سے پڑھ کر دعائیں مانگتے ہیں بعض معلم کے ذریعے دعائیں مانگتے ہیں۔ سات طواف پورے ہونے کے بعد آپ مقامِ ابراہیم پر کھڑے ہو کر دو نفل شکرانہ ادا کرتے ہیں۔ پھر ملتزم چوکھٹ پکڑ کر آنسوؤں کی تاروں میں اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔

" دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا "

یک عجیب شان جلالی رکھتا ہے۔ میں نے اکثر ممالک میں گرجا اور دیگر مذاہب کے معبد دیکھے۔ وہاں صناعی ، آرائش و زیبائش ، تکلف اور اہتمام حد کو پہنچا ہوا دیکھا لیکن

خانۂ خدا کی سادگی دیکھ کر جو اثر دل پر ہوتا ہے، وہ دنیا کی کسی بڑی سے بڑی پرشکوہ عمارت سے بھی نہیں ہوتا۔ آبِ زمزم پیا (اب چاہِ زمزم کی جگہ پانی کے نلوں میں آبِ زمزم آتا ہے) پھر صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی۔ سات چکر کاٹنے ہوتے ہیں جو معذور ہیں وہ آرام دہ ریڑھیوں پر سوار ہو کر سعی کرتے ہیں باقی زائرین پاپیادہ۔

کسی زمانے میں صفا اور مروہ کے درمیان بازار ہوتا تھا۔ گزرنا مشکل تھا۔ اب سعودی حکومت نے توسیعِ مسجدِ حرام کے تحت کوئی ڈھائی فرلانگ لمبی اور اسی فٹ چوڑی گیلری زائرین کے واسطے بنوادی ہے۔ بیچوں بیچ ریڑھیوں کی آمدورفت کی جگہ ہے۔ جس کے گرد جنگلہ بنا ہوا ہے تاکہ پہلے کی طرح پاپیادہ زائرین کو زخمی نہ کرسکیں۔

۱۹٦۳ء میں مجھے آخری دفعہ خانہ کعبہ پر حاضری کا موقع ملا۔ اس وقت مسجدِ حرام تو مکمل ہو چکی تھی اور میرا یہ دعویٰ ہے کہ دنیا میں اس سے بڑھ کر عظیم الشان عمارت شاید ہی پائی جائے۔ ایک اندازے کے مطابق ایک وقت میں پانچ لاکھ نمازی چھتوں کے سائے کے نیچے نماز ادا کرسکتے ہیں اور ویسے بھی مسجد الحرام کے اردگرد تمام مکانات مسمار کر کے حکومت نے بہت کھلے اور کشادہ قطعے اور سڑکیں بنادی ہیں۔ اربوں ریال خرچ ہوئے ہوں گے اور یہ بھی اسلام کا ایک زندہ معجزہ ہے کہ اس نے سعودی عرب کو تیل کی دولت سے ایسے مالا مال کردیا ہے کہ وہ اب خدمتِ دین کی طرف اتنا خرچ کرسکتے ہیں کہ انسان کے وہم و گمان میں بھی نہ آئے اور پھر بھی ان کے خزانۂ عامرہ میں کوئی خاص کمی واقع نہ ہو۔

مکہ مکرمہ کی زیارت اور وہاں کے مقاماتِ مقدسہ جبل ثور، غارِ حرا، جبل بوقبیس مکہ کے قریب منیٰ پھر مزدلفہ اور میدانِ عرفات کے ذکر کے لیے تو کتابوں کی ضخیم جلدیں چاہئیں اور پھر اپنی عقیدت کو اگر حدود کے اندر بھی رکھا جائے۔ کئی سو صفحات لکھے جانے ضروری ہیں اس پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے۔ میں نے اپنے جذبات کا تھوڑا سا عکس پیش کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو ایک بار دیارِ پاکؐ میں ہو آتا ہے۔ اس کی دل کی صورت یہی رہتی ہے کہ وہ پھر بار بار زیارت کو جائے۔

اس زمانے میں مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک براہِ راست سڑک نہیں تھی۔ جدہ آنا پڑا وہاں سے ٹیکسی لے کر چودھری علی اکبر مرحوم کے دوستوں کے نام پیغام لے کر ہم مدینہ منورہ روانہ ہوئے۔ جدے سے مدینہ منورہ کوئی دو سو ساٹھ میل کے فاصلے پہ ہے۔ سڑک اس وقت بھی گو ابھی خاصی تھی مگر کچھ حصہ زیرِ مرمت تھا اب تو دو طرفہ تھری وے THREE-WAY کی صورت میں ہے۔ جہاں ستر اسی میل کی رفتار سے کار چلانا معمول ہے۔ جدے سے رابغ، پھر مستورہ (جہاں سے بحیرہ قلزم (RED SEA) نظر آتا ہے۔ اس کے بعد بدر کا مقام قابلِ ذکر جگہ ہیں۔ جن میں سے آخری مقام کی تاریخی حیثیت تو جنگِ بدر کی وجہ سے ہر مسلمان کو معلوم ہونی چاہیئے۔ کوئی پانچ گھنٹے سفر میں لگ جاتے ہیں۔ راستے میں ٹھہرنا۔ چائے پینی اور پھر بدر کے آگے پہاڑوں میں راستہ دشوار گذار ہے۔ مدینہ منورہ وادی میں واقع ہے۔ چند میل دور سے ہی مسجدِ نبوی کے مینار دھندلے سے نظر آنا شروع ہو جاتے ہیں اور جب آپ شہر میں داخل ہوتے ہیں تو گنبدِ خضرا پر نظر پڑتی ہے اور یہ شعر بے ساختہ یاد آجاتا ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

اب ہم شہرِ جمال میں داخل ہو چکے تھے اور مسجدِ نبوی اور گنبدِ خضرا پر نظر ڈالتے ہی دل میں ایسا سکون اور اطمینان پیدا ہوتا ہے کہ بیان سے باہر ہے۔ مدینہ منورہ کے مقام سے میاں نسیم حسین مرحوم کا قول بار بار یاد آیا کہ مدینہ شہرِ جمال ہے۔ مسجد میں داخل ہوتے ہی اس جمال کی کیفیت سے انسان کچھ اس طرح لطف اندوز ہوتا ہے کہ اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے پھر گنبدِ خضرا پہنچ کر روضۂ مبارک کی جالی کے ساتھ کھڑے ہو کر جو لطف درود و سلام پڑھنے

میں آتا ہے، اس کو بیان کرنے کے واسطے انسانی قلم قاصر ہے۔ ہم نے ریاض الجنت میں بھی نماز ادا کی۔ اس متبرک مقام پر بھی سجدہ دینے کا موقع ملا۔ جہاں حضور سرورِ کائنات نماز پڑھایا کرتے تھے۔ ترک بادشاہوں نے اس جگہ جہاں حضورؐ سجدہ دیا کرتے تھے، اس طرح پتھر لگا دیئے ہیں کہ اب امتِ محمدیہ اس جگہ سجدہ کرتی ہے جہاں حضورؐ کے پائے مبارک ہوا کرتے تھے۔ مسجد کی صفائی کے لیے دو سو ساٹھ آدمی مستقل مقرر ہیں اور اب تو کئی کروڑ ریال کی لاگت سے مسجد کی توسیع کا کام شروع ہو چکا ہے۔ لہٰذا باطنی اور ظاہری صفائی اور تقدس کے لحاظ سے مسجد نبوی میں نماز ادا کرنا یقیناً ایک بہت بڑی سعادت ہے۔

مدینہ منورہ کے پاس جنت البقیع جہاں بزرگانِ دین دفن ہیں۔ ایک طرف جبلِ اُحد اور دوسری طرف مسجد قبا زیارت کے مقام ہیں اور اب تو مدینہ منورہ میں یونیورسٹی قائم ہو چکی ہے۔ جس کے شیخ الرئیس الاستاذ شیخ عبدالعزیز بن باز ہیں۔ جو نابینا ہیں اور اسلام کے بہت بڑے عالم ہیں۔

مدینے کی گلیاں اب وہ روایتی گلیاں نہیں رہیں جن کا عاشقانِ رسولؐ نے اپنی اپنی زبان میں شعروں میں نقشہ کھینچا ہے اردو شاعری میں بھی مدینہ کی گلیوں کو جو مقام حاصل ہے، وہ اہلِ ذوق کو معلوم ہے۔ ہم اس پہلی زیارت میں ہوٹل تعیشیرِ جدید میں ٹھہرے تھے، جہاں سے دو راستے مسجدِ نبوی تک جاتے تھے۔ ایک لمبا اور کشادہ سڑک پر سے اور ایک کچی گلی سے۔ ہمیں اس گلی سے آنے جانے میں جو لطف آتا تھا، وہ صاف ستھری سڑک پر سے گزرنے میں بھی حاصل نہیں ہوتا تھا۔ بیروت کے قیام کے دوران میاں بشیر حسن مرحوم کہنے لگے کہ وہ ایک دفعہ مدینہ منورہ گئے ہوئے تھے۔ انھیں وہاں کچھ دن ٹھہرنا تھا۔ لیکن ایک ضروری سرکاری کام کے لیے دوسری ہی صبح مدینہ منورہ سے رخصت پانے پر مجبور ہوئے۔ فروری کا مہینہ تھا۔ کافی سردی تھی۔ میاں صاحب مرحوم کو قدرے حرارت تھی۔ زکام اور نزلے کی شکایت بھی تھی۔ کہنے لگے کہ خیال آیا کہ کیا معلوم زندگی میں پھر یہ موقع

نصیب ہو۔ آج کی رات کو غنیمت جانو۔ کہتے ہیں۔ میں نے اوورکوٹ بھی پہن لیا۔ مفلر بھی لپیٹ لیا۔ سر کو بھی ڈھانپ لیا اور کمبل لے کر ساری رات مدینہ کی گلیوں میں پھرتا رہا کہ میرا پیارا رسولؐ ان گلیوں میں سے گزرا ہوگا۔ پھرتے پھرتے رات بیت گئی۔ نمازِ صبح مسجدِ نبویؐ میں ادا کی اور پھر مدینے سے رخصت ہوا۔ سبحان اللہ عشقِ رسولؐ کا کیا مظاہرہ ہے!

سینٹروں کے زمرے میں یا سرکاری افسروں اور اہلکاروں کے زمرے میں میں نے میاں نسیم حسن مرحوم جیسا پابندِ صوم و صلوٰۃ اور عاشقِ رسولؐ آج تک نہیں دیکھا۔ ان کا انتقال چند سال ہوئے، بیروت میں ہوا تھا، دفن لاہور میں ہوئے۔ اللہ تعالےٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ہم سب کو توفیق دے کہ جس عشق کی چنگاری نے میاں نسیم حسن مرحوم کے دل کو منور کیا تھا، اس سے ہمارے دلوں میں بھی جلا پیدا ہو جائے۔

حریم کعبہ کی زیارت کر کے اور دنیا بھر سے آئے ہوئے زائرین پر نظر ڈال کر جن میں حبشی بھی تھے، ترک بھی تھے، ایرانی بھی، ملائی بھی، انڈونیشی بھی، تبتی بھی تھے غرضکہ ہر رنگ اور نسل کے پرستار موجود تھے، دل میں وہ پرانا ولولہ پھر تازہ ہوا۔

"ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے"

میں تو ۱۹۳۲ء سے اس بات کا مدعی تھا کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک بین الاقوامی ملّی تنظیم میں منسلک ہو کر دولتِ مشترکہ ممالکِ اسلامیہ قائم کریں۔ خانہ کعبہ کی مرکزیت دیکھ کر میں اس جذبے کا پرستار بن گیا اور دل سے عہد کیا کہ اگر خدا نے توفیق دی تو اس خیال کی تبلیغ میں بقیہ عمر صرف کر دوں گا۔ اقبال کے یہ شعر بے ساختہ یاد آئے:

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

راز دار رازِ ما بیت الحرام!
سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام

جمعیتِ حرم وہ بین اسلام ازم ہے جس کا تصور سید جمال الدین افغانی نے پہلی بار دنیا کو پیش کیا پھر اقبال نے اس کا مفہوم سمجھایا جس کا ادنیٰ داعی یہ خاکسار بھی ہے۔

مسجدِ نبوی کے منبر سے حضور سرورِ کائنات ؐ نے دنیا کو محبت و اخوت اور مساوات کا سبق دیا انسان کو توہمات کی جکڑ بندیوں سے نکال کر علم و عقل و عرفان کی راہ دکھائی۔ دنیا میں روشنی پھیلائی۔ ظلمت دور ہوئی۔ انسان کا رتبہ بلند ہوا۔ اس کو اپنی انسانیت کی پہلی بار قدر معلوم ہوئی۔ رنگ و نسل، رتبہ و مرتبہ۔ بڑے اور چھوٹے، امیر و غریب کے سب امتیازات اٹھا دیئے گئے۔

اقبال کس کے عشق کا یہ فیضِ عام ہے   رومی فنا ہوا حبشی کو دوام ہے

انسانیت کے لیے ایک نیا اور بلند تصور پیش کیا گیا۔ تحقیق اور جستجو کی راہیں تلاش کی گئیں۔ علم نجوم۔ فلسفہ و طب، ہندسہ اور جغرافیہ وغیرہ کے لیے راستے ہموار کیے گئے اور سچی بات تو یہ ہے کہ آجکل کا ایٹمی دور اس پیغام کی تصویر ہے جو پیغمبر خدا نے مسجدِ نبوی ؐ سے ایک متلاشی دنیا کو دیا تھا۔

مدینۂ منورہ پہنچ کر مسجدِ نبوی میں نماز ادا کر کے اور روضۂ مقدس کی زیارت کر کے قدرتی امر تھا کہ اس سچے پیامبر کے افضل ترین پیام کی حقیقت دل پرروشن ہو جائے جس نے پستیوں میں گری ہوئی انسانیت کو عزو شرف کا بلند ترین مقام بخشا۔

وہ دانائے سُبل، ختم الرسل، مولائے کُل جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا

مکّہ اور مدینہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ دونوں کی زیارت کر کے دلوں میں جلا پیدا

ہوتی ہے۔ میں اس جذبے سے مغلوب ہو کر باچشم پُرنم مدینہ منورہ سے روانہ ہوا۔ میری بیوی بھی زار و قطار رو رہی تھیں اور ہم دونوں نے عہد کیا کہ اپنی بقیہ زندگی خدمتِ اسلام کے لیے وقف کر دیں گے۔

مدینہ منورہ سے ہم ۲۳ مارچ کو جدے واپس آئے اور اس خیال سے کہ آج یومِ پاکستان ہے۔ ہمارے دوست چودھری علی اکبر سفیر پاکستان اس دن کی تقریبات میں بہت مشغول ہوں گے اور ممکن ہے کہ ان کے پاس کچھ مہمان بھی ٹھہرے ہوں۔ اس واسطے ہم نے مناسب سمجھا کہ سیدھے کسی ہوٹل میں چلے جائیں چنانچہ ایک اچھے ہوٹل (Red Sea HoTel) میں ایک اچھا کمرہ مل گیا۔ جس کو ہم نے بہت پسند کیا۔ لیکن عین اس وقت جب ہم اپنا سامان کھول رہے تھے۔ ہوٹل والوں میں سے کسی نے ذکر کیا کہ سعودی عریبین مانٹیری ایجنسی SAUDI ARABIAN MONETARY AGENCY - (STATE BANK کے مترادف) کے گورنر مسٹر انور علی جدے میں مقیم ہیں۔ میرے مسٹر انور علی سے ۱۹۴۰ء سے گہرے تعلقات تھے جبکہ وہ اور میں مئی جون ۱۹۴۸ء میں STERLING BALANCES DELEGATION کے سلسلے میں لندن میں ایک ہی گھر میں کوئی ڈیڑھ مہینہ اکٹھے رہے۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ چودھری علی اکبر صاحب ہمارے سفیر کے ہاں مسٹر انور علی کا ذکر ہی نہیں آیا۔ میں نے ان کو ٹیلیفون کیا۔ وہ دفتر میں تھے۔ میری آواز سن کر حیران ہوئے۔ کہنے لگے کہ آپ کہاں سے بول رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں ریڈ سی RED SEA ہوٹل سے بول رہا ہوں خیر ان کو بتایا کہ ہم عمرہ کرنے آئے تھے اور چودھری علی اکبر کے ہاں ٹھہرے تھے اور اس خیال سے کہ وہاں یومِ پاکستان کی وجہ سے ان کو مصروفیت ہوگی، ہم ہوٹل میں اٹھ آئے تو پتہ چلا کہ آپ یہاں ہیں۔ کہنے لگے کہ کتنے دن ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔ میں نے کہا کہ تین چار دن۔ کہنے لگے کہ یہ تو ناممکن ہے کہ میں جدے میں ہوں اور آپ ہوٹل میں ٹھہریں

میں ابھی اپنے ڈپٹی گورنر مسٹر عبد الوہاب کو بھیجتا ہوں۔ آپ ان کے ہمراہ میرے ہاں چلے آئیں۔ چنانچہ ہم انور علی صاحب کے گھر چلے گئے۔ مسٹر انور علی جن کا انتقال پچھلے سال ہوا ہے، دنیائے اسلام کے مالی ماہرین کے سرخیل تھے۔ تمام دنیا ان کی قابلیت کا لوہا مانتی ہے۔ انھوں نے ریال (سعودی سکے) کو دنیا کے بیش قیمت سکوں میں لا شامل کرایا۔ اور ہارڈ کرنسی کے ضمن میں یہ حالت ہے کہ ریال نے ڈالر سے بھی اپنے آپ کو جدا کر لیا۔ یہ سب انور علی مرحوم کی محنتِ شاقہ کا نتیجہ ہے۔ وہ شاہ فیصلؒ کے دستِ راست تھے۔ میں جتنی بار بھی شاہ فیصلؒ سے ملا (سوائے ایک بار کے) ہر دفعہ مسٹر انور علی میرے ساتھ ہوتے تھے۔ ———— پہلی دفعہ مارچ ۱۹۶۳ء میں وہ ہی مجھے ساتھ لے گئے اور پرنس فیصلؒ سے ملاقات کرائی جو اس وقت وزیر اعظم اور سربراہِ مملکت تھے۔ اس وقت بھی وہ عالمِ اسلام کی برتری کے دل سے خواہاں نظر آئے۔ ان کے چہرے پر اس وقت بھی رعب و جلال تھا۔ لیکن طبیعت میں درویشی۔ پہلی ملاقات میں ہی انھوں نے مجھے اپنا گرویدہ کر لیا۔ اس کے بعد کئی دفعہ میں نے ان سے رسمی ملاقات کی اور ہر دفعہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دنیا کے ایک عظیم ترین لیڈر تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے بڑے کارہائے نمایاں کے واسطے منتخب کیا ہوا تھا۔ انھوں نے اپنی ۱۲ سالہ حکومت میں ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف دنیائے اسلام کے سب سے مضبوط ستون ہیں، بلکہ اقوامِ عالم کے اکابرین میں بھی اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ مسٹر انور علی مرحوم خود بھی درویش صفت انسان، سچا مسلمان، محبِ وطن پاکستانی اور مالیات کی دنیا میں غالباً لاثانی ہستی اب آنکھوں سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو چکی ہے۔ ہم ۱۹۶۳ء کے بعد ارضِ مقدس میں کئی بار گئے۔ اور اکثر مسٹر انور علی کے ہاں مہمان ٹھہرے۔ یا ان کی معرفت ہمارا انتظام ہوا۔ ان کی رحلت سے ہماری زندگی میں ایک خلاء پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر کرنا محال ہے۔ ایسے انسان دنیا میں کبھی کبھی آتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب

فرمائیے ۔!

واپسی بیروت کے راستے تھی ۔ بیت المقدس بھی جانا تھا اور بغداد اور دمشق بھی جانا تھا۔ لیکن سیاسی حالات کچھ ایسے بگڑے کہ ہمیں یہ سفر منسوخ کرنے پڑے ۔ دو تین دن میاں نسیم حسن مرحوم کی صحبت میں رہ سکے اور مدینہ منورہ کے فیوض و برکات کے تذکروں سے لطف اندوز ہوتے رہے اور کچھ عجیب جذبات کے ماتحت میاں نسیم حسن کو الوداع کیا۔ کیا پتہ تھا کہ یہ ہماری ان سے آخری ملاقات ہو گی اور وہ تھوڑے عرصے بعد اللہ کو پیارے ہو جائیں گے ۔ اللہ تبارک وتعالےٰ ان کی مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے (آمین)

بیروت کے قیام میں کافی وقت مفتیِ اعظم فلسطین سید امین الحسینی مرحوم کی معیت میں گذارا۔ میں نے اتنا نفیس طبیعت والا درد مند مسلمان بہت کم دیکھا ہے ۔ پیرانہ سالی میں مردانِ مجاہد والا عزم رکھتے تھے اور عالم اسلام کے مسائل پر ہمیشہ گہری نظر رکھتے تھے ۔

قیامِ تنظیم "الاحباء"

پاکستان پہنچ کر اب "ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے" کی خاطر دل سے جدوجہد شروع کر دی۔ جولائی ۱۹۶۲ء میں چند دردمندانِ اسلام کی حمایت سے جن میں سے ڈاکٹر سید محمد عبداللہ اور ڈاکٹر ایس۔ اے رحمان، میاں بشیر احمد مرحوم و بیگم بشیر احمد، میری بیوی، جناب حامد علی خاں۔ مسز زینب کا کاخیل۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید۔ ڈاکٹر مس فیروز دین مرحوم۔ جناب کلیم اختر (جو کئی سال تنظیم کے سیکرٹری رہے۔) پروفیسر حمید احمد خان مرحوم اور میرے پرسنل سیکرٹری چودھری محمد رشید صاحب (جو اس وقت سے آج تک دفتر کا سارا کام سنبھالے ہوئے ہیں۔) خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ تنظیم الاحباء محبانِ عالمِ اسلامی (FRIENDS OF THE MUSLIM WORLD) کی بنیاد رکھی۔ جس کے ذریعے جمعیتِ حرم یعنی پین اسلام ازم کا پیغام اندرون اور بیرونِ ملک نشر کیا اور دولتِ مشترکہ ممالکِ اسلامیہ کے قیام کی طرف وقتاً فوقتاً توجہ دلائی جو غیر ملکی مسلمان طالبانِ علم لاہور میں مقیم تھے، ان کو عیدین کے موقعہ پر "الاحباء" کی طرف سے دعوت دی جاتی جو بڑا مسلمان باہر سے آتا، ان سے ملاقات کا انتظام کرتے۔ غرضیکہ ہر ممکن طریقے سے اپنے محدود وسائل کے پیشِ نظر اسلام کا پرچار کرتے رہتے۔

۵ دسمبر ۱۹۶۲ء۔ لاہور میں شامِ ہمدردی کی تقریر میں، میں نے پہلی بار "دولتِ

مشترکہ ممالکِ اسلامیہ" پر ایک طویل مقالہ پڑھا جس کو اہلِ فکر نے بنظرِ احترام دیکھا جناب رئیس احمد جعفری (جن سے مجھے ذاتی نیاز حاصل نہیں تھا اور جنھوں نے میری تقریر سنی) انھوں نے دوسرے دن مجھے ایک خط لکھا، جس میں انھوں نے بکمالِ مہربانی مجھ عاجز کی نسبت فرمایا۔ "ایسی چنگاری بھی یارب! اپنے خاکستر میں تھی"۔

وہ مجھ سے آکر ملے بھی اور تحریکِ خلافت کے زمانے کی باتیں ہوئیں۔ ہم دونوں اس نتیجے پر پہنچے کہ عالمِ اسلام پھر کروٹ لے رہا ہے۔ شاید مسلمانوں کے پھر بھلے دن آجائیں۔

سفرِ یونان

چار علاقائی کانفرنسوں کے بعد "امنِ عالم بذریعہ قانون" کی تنظیم نے اپنی پہلی عالمی کانفرنس جولائی ۱۹۶۳ء میں ایتھنز (یونان کے دارالحکومت) میں منعقد کی، جس میں ۱۰۵ ملکوں کے مندوبین نے شرکت کی۔ مجھے بھی اس میں مدعو کیا گیا۔

کراچی سے رخصت ہوتے ہوئے مسٹر سعدی ایلدم سفیرِ ترکیہ نے لنچ پر بلایا۔ کہنے لگے: کیا پروگرام ہے؟ میں نے کہا۔ تین دن تہران ٹھہرنے کا۔ ایک دن استنبول۔ فرمانے لگے۔ بالکل غلط! آپ ایک دن تہران ٹھہریں۔ تین دن استنبول۔ ہم نے کہا۔ تہران میں ہم نے اپنے پرانے دوست مسٹر اختر حسین سفیرِ پاکستان کے پاس ٹھہرنا ہے۔ تین دن کا یہ پروگرام بنا ہوا ہے۔ ان کے اصرار پر اختر حسین صاحب کو تار دیا۔ ایک دن کا پروگرام ترک کریں۔ چنانچہ ہم دو دن تہران ٹھہرے اور دو دن استنبول۔ میں اور میری بیوی اس نتیجہ پر پہنچے کہ سفیرِ ترکیہ کی رائے بالکل درست تھی۔ تہران تو زیادہ تر ایک نیا شہر ہے۔ لیکن استنبول جو کہ دو برِاعظموں میں واقع ہے۔ کی اپنی دلکشی ہے۔ جو دنیا کے کسی شہر میں نہیں۔ اسلام کی عظمت، سطوت اور شان و شوکت کی یادگاریں دیکھنی ہوں، تو استنبول سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں۔ حضرت ایوب انصاریؓ کا مزار یہاں ہے۔ یہاں ہم نے حاضری دی۔ ترک باوجود تمام حالیہ تبدیلیوں کے اب بھی ماشاءاللہ پکّے مسلمان ہیں اور ہر مسلمان کو اپنا بھائی سمجھتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی ہر کسی نے عزیزوں جیسا سلوک کیا

استنبول میں قیام کے دوسرے دن ایک سبق آموز واقعہ پیش آیا۔ جس کی اہمیت کی طرف میں پہلے بھی اشارہ کر چکا ہوں۔ ہلٹن HILTON ہوٹل کی تفریحی بس میں کوئی ۴۵ غیر ملکی زیادہ تر امریکن، اور ہم دونوں استنبول کے مشہور مقامات کی سیر کو نکلے۔ سلطان احمد کی نیلی مسجد BLUE MOSQUE میں ہمارا قافلہ پہنچا۔ تو میں نے مسجد کے اندر ہی بنے ہوئے نلکے سے کوٹ، بوٹ اور جرابیں اتار کر وضو کیا۔ ہم دونوں میاں بیوی نے دو نفل نماز ادا کی۔ مسجد سے باہر نکلے تو سارے ہمراہی ہم میں خاص دلچسپی لینے لگے۔ حالانکہ پہلے انھوں نے ہماری طرف ذرا بھی توجہ نہ دی تھی۔ پوچھنے لگے کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ یہ آپ نے کیا کیا؟ جب ہم نے کہا کہ ہم نے نماز ادا کی ہے تو وہ حیرت سے بولے کہ کوئی پادری تو وہاں تھا نہیں۔ ہم نے انھیں بتایا کہ مسلمان کے واسطے سجدۂ شکرانہ ادا کرنے کے لیے کسی مقام یا تکلف کی ضرورت نہیں۔ خالقِ حقیقی کے سامنے جہاں بھی صاف زمین ملے، وہاں سر جھکا دیا۔ وہی ہماری نماز گاہ ہے۔ ہم صرف متعین دنوں میں اللہ تعالےٰ کی پرستش نہیں کرتے بلکہ ہر وقت وحالت اور ہر مقام پر اُس کے سامنے سجدہ ریز ہونے کی آرزو رکھتے ہیں۔ وہ لوگ ہماری باتوں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ دوسرے دن ہوٹل سے روانگی تک وہ ہمارے ساتھ جہاں بھی ملتے خاص توجہ سے باتیں کرتے۔ اس واقعہ سے صرف یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ سلطان اگر اپنے مقام پر کھڑا رہے تو وہ دنیا کی تقدیر بن سکتا ہے۔ استنبول میں دو دن نہیں دو ہفتے بھی گزارے جائیں تو کافی نہیں ہو سکتے۔ دنیا کا یہ تاریخی شہر باسفورس کے مناظر کی دلکشی سے مالامال ہے۔ دو براعظموں میں واقع دنیا کا واحد شہر تاریخ اسلام کی روشن ترین زمانہ کی (ابھی تک) حسین یادگار ہے۔ چپہ چپہ پر سطوتِ اسلام کا ثبوت ملتا ہے۔

"دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز"

علفار کابل۔ قصر یلدیز۔ ڈولما باغچی۔ غرضکہ کون سی جگہ ہے جو دیکھنے کے قابل نہیں۔

یہ شہر صدیوں تک دنیائے اسلام کی طاقت کا مرکز رہا۔ خلافت کا پایۂ تخت ہونے کی وجہ سے یہ شہر مسلمانوں کے روحانی مراکز۔ مکہ، مدینہ۔ بیت المقدس کے بعد اہم ترین شہر تھا۔ یہاں کا TOP KAPI PALACE جو کسی وقت ترک بادشاہوں کا محل ہوتا تھا۔ اب قومی عجائب خانہ ہے۔ جہاں دنیا کے نوادرات کے نمونے ہیں۔ مسلمانوں کی خطاطی CALIGRAPHY. کی خاص طور پر نمائش کی گئی ہے۔ ایک رسم الخط کا نام "خطِ غبار" ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کاغذ پر دھول پڑی ہوئی ہے لیکن دراصل حروف اس طرح لکھے گئے ہیں کہ غبار کا شبہ ہوتا ہے۔ مجھے یہاں کی سب سے اہم چیز ہمایوں بادشاہ کا وہ خط نظر آیا جو اس نے تخت چھن جانے پر خلیفہ کو لکھا تھا۔ خیال آتا ہے کہ اسلام میں مرکزیت پر اسی لیے زور دیا گیا کہ مضبوط مرکز دنیائے اسلام کی خدمت کر سکتا ہے۔

جب تک خلافت قائم رہی۔ اسلام کی نظریں استنبول میں سلطانِ روم کی طرف اٹھتی تھیں۔ لیکن "چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا" خلافت کے خاتمے کے ساتھ ترکی کا جو حشر ہوا، وہ آپ کے سامنے ہے:

چوں رخت خود بربست و برون از مقام شد — عبدالحمید گفت کہ ترکی تمام شد!

سلطان عبدالحمید کا جانا تھا کہ خلافت کا خاتمہ ہو گیا اور غیروں نے دنیائے اسلام کے حصے بخرے کر کے مختلف حصے اپنے تصرف میں کر لیے۔ شکر ہے کہ زمانہ پھر پلٹا کھا رہا ہے اور اب پھر ہم آزاد ممالک دنیا میں موجود ہیں۔ لیکن ان میں مرکزیت نہیں ہے۔ اسی واسطے میں دولتِ مشترکہ ممالک اسلامیہ پر زور دیتا ہوں کہ آجکل کے حالات میں یہی تنظیم خلافت کا خلاء پورا کر سکتی ہے۔

استنبول کی مساجد اور محلات خاص طور پر قابل دید ہیں۔ لیکن افسوس اس میں صرف دو دن یہاں پھرنے کا موقعہ ملا۔ لیکن اس قلیل عرصہ میں بھی یہ ثابت ہو گیا کہ ترک اب بھی دنیا کا بہترین سپاہی ہے اور اب بھی دل سے اسلام کا شیدائی ہے۔ اللہ تعالےٰ ترکوں

کو استقامت بخشے اور ان کی طاقت میں اور وسعت دے۔ (آمین)

ایتھنز قدیم یونان کا قدیم دارالخلافہ وقدیم تہذیب کا مرکز۔ وہ یونان جہاں علم و فضل کی روشنی دنیا میں پھیلی، اس کا صدر مقام ہے۔ ۱۹۶۳ء میں وہاں بادشاہت قائم تھی۔ بادشاہ اور ان کا خاندان بھی کانفرنس میں آیا۔ مندوبین سے ان کا تعارف کرایا گیا۔ ہم ان سے ملے ہیں افتتاحی اجلاس کا صدر تھا۔ جس سے پہلے یونانی چرچ کے لاٹ پادری نے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ انجیل Bible کا کچھ حصہ کتاب سامنے رکھ کر سنایا۔ (جو کچھ ایسا رواں دواں نہ تھا۔) مجھے فوراً خیال آیا کہ ایک عیسائیت ہے، جہاں انجیل کو لاٹ پادری مشکل سے پڑھ سکتے ہیں اور ایک اسلام کا معجزہ ہے کہ دس سے بارہ سال کے بچے بھی قرآن مجید حفظ کر کے زیر زبر کی غلطی کے بغیر دہرا سکتے ہیں۔ ہم جہاں بھی گئے۔ ہمیں تو ہر موقع اور ہر مقام پر اسلام کی عظمت ظاہر ہوئی۔ صرف دیکھنے والا ہونا چاہیئے۔

اجلاس کے پانچویں روز میری تجویز یہ قرار پایا کہ ایک عالمی امن بذریعہ قانون کی مرکزی تنظیم فی الحال واشنگٹن میں قائم ہونی چاہیئے جو اتفاق رائے سے پاس ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے یورپ کے کئی ملکوں کی سیر کی۔ کوئی دو ماہ بعد وطن واپس آئے۔ کوپن ہیگن ڈنمارک کے عجائب خانے میں میری بیوی نے اپنا پاکستانی لباس۔ شلوار۔ قمیض۔ دوپٹہ اور ایک نسخہ قرآن مجید کا، بطور تحفہ پیش کیا۔ جو آج تک وہاں کے نیشنل میوزیم میں موجود ہے۔ اس سے پہلے وہاں کوئی پاکستانی لباس نہیں تھا۔

ادائیگی فریضۂ حج

اپریل ۱۹۶۴ء میں فریضۂ حج ادا کیا۔ اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے یہ مبارک دن بھی دکھایا کہ جب ہم اس اہم ترین اسلامی فریضے سے سبکدوش ہوئے۔ حج کی برکات پر میں نے اپنی کتاب "دولتِ مشترکہ ممالکِ اسلامیہ" میں بہت کچھ لکھا ہے۔ مختصر یہ کہ دینی و دنیوی برکات اور فیوض کے علاوہ حج کے ذریعہ ہم تمام دنیائے اسلام کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کر سکتے ہیں۔ اس کی تفصیل میں نے اپنی کتاب کے علاوہ اور بہت سے مضامین میں پیش کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اتحادِ عالمِ اسلامی کے لیے حج کا مبارک فریضہ بہترین موقعہ ثابت ہو سکتا ہے۔

۳۰ اپریل ۱۹۶۴ء کو مسٹر انور علی مرحوم کی معیت میں جلالۃ الملک شہید شاہ فیصل اعظم سے دوسری ملاقات ہوئی۔ ان کو مل کر ہر دفعہ اقبال کا یہ شعر یاد آتا تھا۔

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند   در شہنشاہی فقیری کردہ اند

اتنا عظیم الشان بادشاہ۔ خادم الحرمین شریفین کے ہاں کسی شان و شوکت اور جاہ جلال کی نمائش نہ تھی۔ آپ بادشاہ سے ملتے وقت ایسا محسوس کرتے ہیں کہ کسی بڑے بزرگ عالی مرتبت درویش سے مل رہے ہیں۔ میں نے بادشاہ کے روبرو مستقل اسلامی سیکرٹریٹ قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔ مکے سے مدینے گئے لیکن افسوس کہ چالیس نمازیں پوری کرنے کا موقع نہ مل سکا اور وطن واپس آنا پڑا۔

شمولیت بہ اجلاسِ رابطۂ عالمِ اسلامی مکہ

۱۹۶۵ء کے مارچ، اپریل میں "رابطہ عالمِ اسلامی مکہ" کی دوسری عالمی کانفرنس مکہ مکرمہ منعقد ہوئی۔ انھوں نے ہماری گورنمنٹ کو میرا نام بطورِ مندوب کے پیش کیا۔ لیکن گورنمنٹ نے اپنی مخصوص مصلحتوں کی بنیاد پر میرا نام نامنظور کر دیا اور ایک خاص شہرت کے مالک ڈاکٹر فضل الرحمٰن ڈائریکٹر اسلامی ریسرچ انسٹیٹیوٹ اسلام آباد کو وفد کا سربراہ مقرر کیا گیا۔ اگر گورنمنٹ میرا وفد میں شامل ہونا منظور بھی کر لیتی تو میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن جیسے عقیدہ رکھنے والے شخص کی سربراہی میں کبھی بھی شرکت نہ کرتا۔ اللہ تعالیٰ بڑا کارساز ہے۔ "مادر چہ خیالیم وفلک در چہ خیال"، جب رابطہ عالمِ اسلامی کو معلوم ہوا کہ گورنمنٹ نے میرا نام اپنے وفد میں سے حذف کر دیا ہے تو انھوں نے میرے اور میری بیوی کے لیے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ بھیج کر ہمیں رابطے کے خاص مہمان ہونے کا اعزاز بخشا۔ جس پر ہم دونوں مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ حج کے فریضے کی سعادت دوبارہ نصیب ہوئی اور اسلامی عالمی کانفرنس میں شرکت کا اعزاز بھی خدا نے بخشا۔ میں نے کمیٹی نمبر ۴ کے سامنے جس کے صدر میرے پرانے اور مخلص دوست علامہ محمد اسد (مشہور ادیب عالم اور مصنف) صدر تھے۔ میں نے "دولتِ مشترکہ ممالکِ اسلامیہ" سکیم کو کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔ اللہ کی شان دیکھیے، رات ہوٹل میں کھانے پر قطر کے ایک شیخ صاحب ہمراہی تھے جو انگریزی جانتے تھے۔ میں نے اپنی سکیم کا ان سے تذکرہ کیا تو وہ جوش میں کرسی سے اچھل پڑے اور بآوازِ بلند کہا۔

EXCELLENT, EXCELLENT - "نہایت اعلیٰ - نہایت اعلیٰ" پھر پوچھا کہ آپ نے یہ انگریزی میں لکھا ہے کہ عربی میں - میں نے کہا کہ انگریزی میں۔ کہنے لگے کہ میں راتوں رات اس کا عربی ترجمہ کر دوں گا۔ چنانچہ انھوں نے ایسا کیا اور گو انھیں ۱۰۲ درجے بخار بھی ہوگیا تھا تاہم یہ عربی ترجمہ کمیٹی نمبر ۴ کے ممبران کے سامنے تقسیم ہوسکا اور پاس ہوا۔

یہ کانفرنس اگرچہ اس تنظم و ضابطہ کے ساتھ منعقد نہ ہوئی جیسا کہ یورپی یا امریکی کانفرنس ہوتی ہیں، تاہم اس لحاظ سے مفید ثابت ہوئی کہ دنیا کے کونے کونے سے آئے ہوئے مسلمانوں کے ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہی ہوئی۔ کشمیر کے موجودہ کٹھ پتلی وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ بھی وہاں موجود تھے۔ لیکن اس وقت بھی وہ ہندوستانی ایجنٹوں کے زیر سایہ ہوتے تھے اور ہم سے آنکھ ملاتے ہوئے بھی کچھ احتیاط سے کام لیتے تھے۔ حج کے بعد اور کانفرنس کے بعد مدینہ منورہ آنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن افسوس کہ مسجد نبویؐ میں بیک وقت چالیس نمازیں ادا کرنے کی صورت اس دفعہ بھی پوری نہ ہو سکی۔

وطن واپسی پر گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کے واسطے ہم حسبِ معمول ایبٹ آباد چلے گئے۔ وہاں پاکستان ملٹری کاکول کے قریب ایک پُرفضا مقام پر مکان ۱۹۶۲ء میں بنایا تھا جس کا نام "دامنِ کوہ" رکھا جو بننے سے لے کر آج تک پنجاب اور سرحد کے مشاہیر کے قدموں سے فیض یاب ہوتا رہا ہے۔

شرکت بہ اجلاس عالمی امن بذریعہ قانون

منعقدہ واشنگٹن

ستمبر ۱۹۶۵ء "عالمی امن بذریعہ قانون" کانفرنس دو سال بعد واشنگٹن ڈی سی میں منعقد ہوئی تھی۔ مجھے اس وقت کانفرنس کی انسانی حقوق کی کمیٹی کا مستقل صدر مقرر کیا جا چکا تھا اور بہت اصرار کے ساتھ دعوت دی گئی کہ میں اس کانفرنس میں ضرور شریک ہوں اور اس کمیٹی کی صدارت کے فرائض انجام دوں۔ میں نے اس وقت کی حکومت سے FOREIGN FXCHANGE کی سہولت مانگی اور ساتھ ہی میں نے کہا کہ میں واپسی پر مراکش، الجیریا اور مصر میں اتحادِ عالمِ اسلامی کا پیغام دیتا ہوا وطن واپس جاؤں گا۔ گورنمنٹ نے نہ FOREIGN EXCHANGE کی اجازت دی اور نہ کسی اسلامی ملک میں جانے کی سہولت دی۔ میں نے دوبارہ ایک ذاتی خط وزیر مالیات کو لکھا، جن سے میرے مراسم تھے کہ میرے نہ جانے سے انسانی حقوق کی کمیٹی کی صدارت سے پاکستان محروم رہ جائے گا اور میرا ارادہ ہے کہ میں وہاں کشمیریوں کے حقِ خود ارادیت کا سوال اٹھاؤں جو میری عدم موجودگی میں اور کوئی پاکستانی اس مقام LEVEL پر نہیں اٹھا سکے گا۔ اس کا جواب پھر مجھے یہ ملا کہ آپ کا جانا کوئی ضروری نہیں ہے کیونکہ پاکستان کے وزیر قانون اور چیف جسٹس صاحب جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ ان کے جانے کے باوجود پاکستان انسانی حقوق کی کمیٹی کے سربراہ کے اعزاز سے محروم ہو جائیگا اور یہ پایا ہوا اعزاز کھونا مناسب نہیں۔ لیکن اس کا سرکاری جواب پھر وہی ڈھاک کے تین پات۔ صاف انکار۔

ان حالات میں میں نے کانفرنس میں شمولیت کا ارادہ بہت حد تک فسخ کر دیا تھا۔

اگست ۱۹۶۵ء میں محترم جسٹس رحمان صاحب اور ان کے بچے میرے ہاں" دامنِ کوہ" میں ٹھہرے ہوئے تھے کہ عالمی صدر کانفرنس کا ایک ضروری خط امریکہ سے آیا کہ کانفرنس میں آپ کی شمولیت ازبس ضروری ہے۔ اگر آپ بذاتِ خود شامل نہ ہوئے تو یہ کانفرنس ادھوری رہ جائے گی۔ میں نے یہ خط رحمان صاحب کو دکھایا تو انھوں نے کہا کہ بھائی صاحب! اب تو نہ جانے کا کوئی جواز نہیں۔ اللہ مالک ہے۔ میرے بڑے بھائی نیویارک میں تھے۔ ان کو تار دیا کہ وہ وہاں کے اخراجات کا بندوبست کریں۔ انھوں نے تسلی دلائی۔ چنانچہ ہم دونوں میاں بیوی کانفرنس میں شرکت کے لیے ۳ ستمبر ۱۹۶۵ء کو لاہور سے کراچی روانہ ہوئے۔ جہاں میرے دونوں لڑکے رہتے تھے۔ ان کے پاس ٹھہرے۔ عین اُنھی دنوں میں ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑنے کی خبریں گرم تھی۔ ہم نے سوچا کہ اگر ہماری روانگی تک جنگ نہ چھڑی تو ہم امریکہ جائیں گے ورنہ ارادہ فسخ کر دیں گے۔ چنانچہ ہم چھ ستمبر صبح ۶ بجے پین امریکن سروس سے بذریعہ استنبول اور ڈنمارک (جہاں ہمارے پوتا۔ پوتی رہتے تھے) سے ہوتے ہوئے لندن، واشنگٹن کے سفر پر روانہ ہوگئے۔ عزیز و اقارب ہوائی اڈہ پر رخصت کرنے آئے ہوئے تھے۔ اس وقت تک کراچی میں کسی کو کوئی خبر نہ تھی کہ جنگ شروع ہو چکی ہے۔ چنانچہ ہم ہنسی خوشی روانہ ہوئے۔ استنبول میں ہمارے پرانے کرم فرما مسٹر شریف الحسن نے ہمیں ہوائی اڈہ پر ملنا تھا۔ وہ اس وقت ہمارے پریس اتاشی تھے (اور آجکل گورنمنٹ آف پاکستان محکمہ تعلیم میں ایک بڑے عہدے پر فائز ہیں) خلافِ توقع ان کو ہوائی اڈے پر موجود نہ پاکر ہلٹن HILTON ہوٹل پہنچتے ہی ان کو ٹیلیفون کیا۔ وہ دفتر ہی میں تھے۔ ہماری آواز سن کر چونک پڑے۔ کہنے لگے کہ آپ کیسے پہنچ گئے آپ کو پتہ نہیں کہ آج صبح ہی پاکستان اور ہندوستان میں جنگ چھڑ چکی ہے۔ میں ابھی آتا ہوں۔ لیفٹیننٹ جنرل الطاف قادر صاحب بھی وہاں اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ محترم سید حکیم نیر واسطی صاحب بھی ہمارا سن کر ہوٹل میں تشریف لے آئے۔ سوچتے رہے کہ وطن واپس جائیں۔

یا امریکہ جائیں۔ آخر کار طے یہ پایا کہ ۹ ستمبر کو کوپن ہیگن تو جائیں اور اپنے لڑکے سعید احمد کو تار دیا کہ کوپن ہیگن میں ہمیں صحیح مشورے سے آگاہ کریں۔ کیونکہ اس وقت بی.بی.سی نے یہ خبر دی تھی کہ ہندوستان ریڈیو کا یہ دعویٰ ہے کہ انھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا ہے۔ عجیب بات ہے کہ گو ہم پردیس میں تھے اور ایسی منحوس خبر بھی سنی تاہم دل متفکر نہیں تھا۔ یہ یقین تھا کہ پاکستان کو اللہ تعالےٰ محفوظ رکھے گا اور دشمنوں کے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ چنانچہ ہم ۹ ستمبر کو کوپن ہیگن پہنچے تو سعید میاں کا تار آیا ہوا تھا کہ یہاں بالکل خیریت ہے۔ لاہور بھی خیریت ہے۔ آپ سفر ملتوی نہ کریں باوجود اس کے کہ سارے خاندان کے ممبران لاہور میں تھے۔ اللہ تعالےٰ نے کچھ ایسا حوصلہ دیا تھا کہ ہم کوپن ہیگن بچوں سے مل کر لندن اپنے ہائی کمشنر مسٹر ہلالی اور چند اور احباب سے مشورہ کر کے گیارہ ستمبر کو واشنگٹن روانہ ہوئے۔ اس وقت تک سرکاری طور پر تصدیق ہو چکی تھی کہ ہندوستانیوں کے بہت سے دعوے بالکل غلط اور بے بنیاد ہیں۔ لندن کے ایک اخبار میں بڑا مزے دار کارٹون دیکھا۔ ایک شخص دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ "جو کچھ میں سمجھا یہ ہے کہ پاکستان کے کل ۳۶۹ ہوائی جہازوں میں بہادر ہندوستانیوں نے ۷۰۰ مار گرائے ہیں۔!

خیر ہم خیریت سے واشنگٹن پہنچ گئے۔ میرے بھائی صاحب نے اور ایک دوست نے وہاں ہوٹل وغیرہ کا انتظام کر دیا تھا۔ پاکستان کے وزیر قانون اور چیف جسٹس صاحب تو نہ پہنچ سکے کیونکہ انھیں ۸ ستمبر کو کراچی سے روانہ ہونا تھا جو جنگ چھڑنے کی وجہ سے نہ چل سکے۔ البتہ کچھ پاکستانی جو یورپ اور امریکہ میں تھے، بطور مندوب کانفرنس میں شامل ہوئے۔

جنگ کی تازہ ترین خبریں ہر وقت ٹی.وی. ریڈیو پر آتی تھیں۔ لیکن یہ واقعی معجزہ ہے کہ ہمارے دلوں کو ذرا بھی تردّد نہ ہوا۔ حالانکہ سارا خاندان لاہور اور کراچی میں تھا۔ ہمیں ان کے متعلق کوئی تشویش لاحق نہ ہوئی۔ خدا نے کچھ ایسی تسلی دی ہوئی تھی کہ انشاءاللہ پاکستان صحیح سلامت برقرار رہے گا۔

۱۵ ر ستمبر کو حقوقِ انسانی کی کمیٹی کا اجلاس تھا۔ یہ اس کانفرنس کی سب سے بڑی کمیٹی تھی اور اس میں حاضری بھی سب سے زیادہ ہوتی ہے۔ میں نے اپنے صدارتی کلمات میں حقِ خود ارادیت کی اہمیت پر زور دیا اور کہا کہ اقوامِ متحدہ بھی اس کو تسلیم کر چکی ہے اور ہماری ایتھنز کانفرنس میں بھی اس پر زور دیا گیا ہے لیکن افسوس کہ چند ممالک جو اقوامِ متحدہ کے ممبر بھی ہیں اور یہاں موجود بھی ہیں، دیدہ دانستہ ان لوگوں کو اس حق سے محروم کر رہے ہیں جو ان کا پیدائشی اور قانونی حق ہے۔ اس کانفرنس کو اپنے ممبران پر زور دینا چاہیئے کہ وہ کم از کم اپنے فیصلوں کے تو پابند رہیں۔ ساتھ ہی میں نے یہ بھی ذکر کیا کہ اسلام نے جو حقوقِ انسانی عطا کیے ہیں، ان کا بغور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ تاکہ ہم ان سے فائدہ اٹھا سکیں۔

ابھی تک مجھے پتہ نہ چلا کہ کیوں مجھے بہ صد اصرار ذاتی طور پر کانفرنس میں حاضر ہونے پر زور دیا گیا تھا۔ ۱۵ ر ستمبر صبح کو جب ہماری ۲۱ ممبران کی مجلسِ انتظامیہ کا اجلاس ہو رہا تھا، جس کا میں ممبر تھا۔ (بھارت اور اسرائیل بھی اس کے ممبر تھے) کانفرنس کے سیکرٹری جنرل نے میرے کان میں کہا کہ میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک منٹ کے لیے باہر آئیے۔ میں ان کے ساتھ باہر نکلا تو وہ ہنس کر کہنے لگے کہ کوئی خاص بات نہیں مجلسِ انتظامیہ کوئی فیصلہ کرنا چاہتی ہے جو آپ کے حق میں ہے۔ اس واسطے وہ نہیں چاہتی کہ آپ وہاں خود موجود ہوں۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں جب اندر گئے تو صدر کانفرنس MR. CHARLES RHYNE نے بتایا کہ اس اجلاس میں پہلی بار دنیا کے ایک وکیل کو اس کی عظیم الشان خدمات کے عوض جو اس نے "امن بذریعہ قانون" حاصل کرنے کے واسطے کی ہیں، دنیا کا ممتاز ترین وکیل قرار دیا جائے گا اور اسے WORLD LAWYER AWARD دیا جائے گا۔ ہمیں سب کو خوشی ہے کہ انتظامیہ کمیٹی نے تمام ذریعوں سے چھان بین کر کے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ عظیم الشان اعزاز پاکستان کے چودھری نذیر احمد خاں صاحب کو دیا جائے۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ کیوں میری ذاتی موجودگی پر اس قدر بضد اصرار کیا جا رہا تھا۔ مجلسِ انتظامیہ میں اعلان کیا گیا کہ یہ اعزاز ۱۷ ستمبر کو عالمی ضیافت کے بعد دیا جائے گا۔ جہاں تقریباً ڈیڑھ ہزار مندوبین موجود ہونے کی توقع ہے۔ ۱۱۰ ملکوں سے ڈیڑھ ہزار مندوبین کھانے پر موجود ہوں گے۔

۱۶ ستمبر ۱۹۶۵ء کو میرے بڑے بھائی Z. H. KHAN صاحب نے نیویارک سے ٹیلی فون کیا کہ کیا تم نے اپنی تقریر پر نیویارک ٹائمز کا ادارتی نوٹ پڑھا ہے۔

ہمارے ہوٹل میں چونکہ واشنگٹن پوسٹ WASHINGTON POST آتا تھا۔ لہٰذا میں نے نیویارک ٹائمز خاص طور پر منگوایا۔ واقعی انھوں نے اپنے ایک ادارتی نوٹ میں میرے صدارتی ریمارک کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا تھا کہ مسٹر خان نے کشمیر کا نام نہیں لیا لیکن ظاہر ہے کہ وہ کشمیر کے اسی ۸۰ فیصد مسلمان باشندوں کی حق تلفی کی طرف توجہ دلا رہے تھے اور بھارت کو سنا رہے تھے کہ وہ U.N.O کے فیصلوں پر اور اس کانفرنس کے فیصلوں پر عمل نہیں کر رہا۔ ستمبر ۱۹۶۵ء کی جنگ میں ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۱۶ ستمبر کو مسٹر لنڈن بی جانسن جو اس وقت کے امریکی صدر تھے کانفرنس کو خطاب کرنے آئے۔ ہم انتظامیہ کمیٹی کے ممبران DIAS پر بیٹھے ہوئے تھے۔ مسٹر جانسن نے ہر ایک ممبر سے ہاتھ ملایا جب میری باری آئی (میری کرسی صدر جانسن کی میز کے عین پیچھے تھی) میں نے رسمی معانقہ کے بعد صدر جانسن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑے رکھا۔ اور کہا جناب صدر! آپ کو ذاتی طور پر کوشش کرنی چاہیئے کہ بھارت اور پاکستان کا تنازعہ بڑھنے نہ پائے۔ جنگ بندی کی کوشش کی جائے۔ مسٹر جانسن دراز تھے اور بہت تیز قسم کے سربراہ تھے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے "I SHALL TRY TO DO MY BEST" (میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا)۔

۱۷ ستمبر ۱۹۶۵ء کو رات کے کھانے پر کوئی ڈیڑھ ہزار سے زیادہ مندوبین ملے۔ جس میں دنیا بھر کے چیف جسٹس صاحبان، جج صاحبان، اٹارنی جنرل صاحبان، سلسٹر صاحبان

وزرائے قانون، مشہور وکلاء۔ قانون دان پروفیسر اور دنیائے قانون کی مشہور ترین ہستیاں موجود تھیں۔ کھانا ختم ہوتے ہی ڈاکٹر رابرٹ جی۔ سٹوری نے WORLD LAWYER AWARD عالمی اعزازنامہ کی عبارت پڑھ کر سنائی۔ مجھے ڈائس پر بلایا اور اعزاز پیش کیا OUT STANDING LAWYER OF THE WORLD یعنی دنیا کا ممتاز ترین وکیل۔ میں نے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد میری بیوی کو ڈائس پر بلایا گیا اور سب مجمع نے اٹھ کر ان کو مبارک باد دی۔

مسٹر گولڈ برگ جو اس وقت اقوامِ متحدہ میں امریکہ کے نمائندہ تھے، نیویارک سے خاص طور پر واشنگٹن ضیافت کے بعد تقریر کرنے آئے تھے۔ ان کی تقریر کا ایک تاثر بعض لوگوں نے یہ لیا کہ غالباً بھارتی پاکستانی CEASE FIRE یعنی جنگ بندی کی کوئی تجویز زیرِ غور نہیں۔!

یہ تقریب کوئی ساڑھے گیارہ بجے کے قریب ختم ہوئی۔ اس کے بعد ٹی۔ وی اور پریس والوں نے ہمیں گھیر لیا۔ اور ہم کوئی ایک بجے کے قریب اپنے کمرے میں پہنچے۔ تین دفعہ دوگانہ ادا کیا۔ پہلی بار اس شکرانے کے طور پر کہ اتنا بڑا اعزاز جو کہ قانون کی دنیا کا نوبل پرائز NOBEL PRIZE سمجھنا چاہیئے، ایک مسلمان کو ملا ہے۔ دو نفل اس شکرانے کے تھے کہ یہ اعزاز ایک پاکستانی کو ملا ہے۔ اور تیسری بار اس شکرانے میں کہ ہمیں یہ اعزاز ملا ہے۔

اس کانفرنس میں جو عہد خدمتِ اسلام کا مدینہ منورہ سے ۱۹۶۲ء میں رخصت ہوتے ہوئے کیا تھا اس کا نہایت اچھا موقع ہاتھ آگیا۔

بطور چیئرمین HUMAN RIGHT COMMITTEE (حقوقِ انسانی کمیٹی) میں نے اپنے افتتاحی کلمات میں امریکہ کے دارالحکومت واشنگٹن ڈی سی میں ایک بہت بڑے غیر مسلم اجتماع میں غالباً انھیں پہلی بار اس بات سے روشناس کرایا کہ دنیا میں

سب سے پہلے حقوقِ انسانی اسلام نے عطا کیے تھے۔ اور پیغمبرِ خدا نے اپنے خطبۂ حجۃ الوداع میں کالے اور گورے، عربی اور عجمی امیر اور غریب کی تفریق کو مٹا کر انسانیت کو پہلی بار درسِ مساوات دیا تھا۔ میں نے مندوبین سے اپیل کی کہ وہ بلا تعصب اس بات کا مطالعہ کریں کہ اسلام نے انسانیت پر کتنے احسان کیے ہیں۔

یہ کوئی مذہبی محفل نہ تھی۔ جس میں تقریر کر رہا تھا۔ اس کانفرنس میں تقریر مقررہ قواعد اور ضوابط کے مطابق حدود کے اندر ہونی لازمی ہوتی ہے لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے توفیق دی کہ (غالباً) پہلی بار اتنے اونچے مقام سے غیر مسلموں کے اعلیٰ سطح کے مجمع میں اسلام کی برکات اور فیوض ایسے پیرائے میں بیان کیے کہ کسی کو اعتراض یا اختلاف کا موقع نہ ملا۔ بلکہ میرا تاثر یہ ہے کہ انھوں نے دلچسپی سے اس بات کو سنا۔

اس سے مجھے خیال آتا ہے کہ ہم نے مشرق میں تو خیر جس طرح اسلام کو پیش کیا۔ کیا مغرب میں ہم اسلام کو اس کے حقیقی روپ میں کماحقہ طور پر پیش نہیں کر سکتے۔ میرا دعویٰ ہے کہ اگر اسلام کو اس کے صحیح رنگ میں مغربی قوموں کے سامنے پیش کیا جائے تو اسلام کے خلاف ان کے بہت سے تعصبات مٹ سکتے ہیں۔ بلکہ ان کو اسلام کے قریب لایا جا سکتا ہے

۱۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کی صبح کو سفارت خانۂ پاکستان سے کسی اہلکار (جو مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔) نے ٹیلیفون کیا۔ گزشتہ رات جو اعزاز مجھے دیا گیا، اس پر مبارک باد دی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ حکومتِ پاکستان کا حکم آ گیا کہ سرکاری سطح پر اس خبر کو BLACK OUT کیا جائے (یعنی اس کو دبایا جائے۔)

امریکہ کے سب اخبارات۔ ٹیلیویژن۔ ریڈیو پر تو یہ خبر اور اس کے متعلق تصاویر نشر ہو چکی تھیں۔ سرکارِ پاکستان کے اس کو دبا لینے سے کیا فرق پڑے گا۔ یہ کسی کو خیال نہیں آیا۔ لیکن چونکہ آمریت کے دور میں شخصیت پرستی یعنی صرف ایک شخص کی Image

کی وبا عام ہو چکی تھی، اس واسطے چڑھتے سورج کی پرستش کرنے والی قوم کے عمّال بھی اسی پالیسی پر گامزن تھے کہ کوئی اور چراغ نہ جلنے پائے۔ صرف ایک شخص منبعِ نور قرار دیا جائے۔ ملت میں اپنے اوپر انحصار کرنے کی طاقت آہستہ آہستہ سلب ہوتی جاتی ہے۔ تاآنکہ بالکل مفلوج ہو جاتی ہے۔

عالمی جنگ دوئم میں (مسٹر انورین بیوان ANEURAN BEVAN (جو پہلے لیبر گورنمنٹ کے وزیر تھے) سر ونسٹن چرچل WINSTON CHURCHILL (کنزرویٹو وزیراعظم کی بعض پالیسیوں کے سخت خلاف تھے۔) جنگ کا زمانہ تھا۔ ہٹلر برطانیہ پر دباؤ ڈال رہا تھا۔ مسٹر بیوان BEVAN کے ایک دوست نے ان سے کہا۔ آپ چرچل کی اتنی مخالفت کر رہے ہیں۔ آپ کو یہ احساس نہیں اگر چرچل نہ ہو تو کیا ہوگا۔ مسٹر بیوان نے جواب دیا۔ "کیا ہوگا؟" آپ کا کیا خیال ہے کہ ہم ہٹلر کو خط لکھ دیں گے کہ آؤ اور انگلستان پر قبضہ کر لو؟ جنگ اسی طرح جاری رہے گی۔ جس طرح اب ہے۔" اور مزید کہا "جمہوریت کی روح کو کبھی تباہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ کبھی پوری کی پوری دشمن کی زد میں نہیں ہوتی۔

افسوس کہ پاکستان میں نام جمہوریت کا لیا جاتا ہے۔ کام زیادہ تر آمرانہ ہو رہے ہیں۔ ہم کہتے کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ قول و فعل میں تضاد خطرناک حد تک بڑھ گیا ہے۔ اللہ تعالٰے کی پرستش کی بجائے شخص پرستی نے لے رکھی ہے۔ ہمیں اس غلط روش سے ڈرنا چاہیئے۔ ورنہ کسی وقت ہمیں روزِ بد دیکھنے کے واسطے تیار ہو جانا چاہیئے۔

حاکمیت صرف اللہ تعالٰے کی ہے۔ بقا صرف اسے ہے۔ ہم سب اس کے غلام ہیں۔ کسی انسان کی غلامی اختیار کرنے سے شرفِ انسانی کھو بیٹھیں گے۔

قومی سطح پر یہ پالیسی کسی وقت سخت نقصان دہ (بلکہ مہلک ثابت ہو سکتی ہے) اور اس موقعہ پر تو اس خبر کے بلیک آؤٹ کرنے میں سراسر پاکستان کا نقصان تھا۔ اس وقت بحیثیت

یہ تھی کہ ۱۹۶۵ء کی بھارتی ۔ پاکستانی جنگ میں پہل کس فریق نے کی ہے۔ عالمی تنظیم وکلا اگر ایک پاکستانی کو عالمی امن قائم رکھنے کے صلہ میں سب سے بڑا اعزاز دیتی ہے تو اس کا فائدہ ہماری حکومت یہ اٹھا سکتی تھی کہ پاکستان جارحیت کیسے کر سکتا ہے۔ ہم تو امن کے پرستار ہیں۔

بہر حال اس وقت کے مشیروں نے اس رسم پر عمل کیا کہ صرف ایک شخص کی تصویر ہے IMAGE ۔ اور ہماری بدقسمتی ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک یہ مذموم طریقہ ترک نہیں کیا گیا بلکہ اب تو شخصیت پرستی، خوشامد اور کاسہ لیسی کا گھناؤنا مظاہرہ اس طرح ہر روز دیکھنے میں آتا ہے کہ طبیعت اچاٹ ہو جاتی ہے۔ جب حالت یہاں تک پہنچ جائے کہ کوئی سڑک نئی بنے یا پل بنے یا ٹیوب ویل لگے یا چھوٹی موٹی عمارت بنے، تو سرکاری اعلان ہو کہ یہ فلاں صاحب کے حکم کے مطابق ہوا ہے تو قومی صلاحیت کا خدا حافظ!

ستمبر ۱۹۶۵ء کے اواخر میں جنگ بندی منظور ہو گئی۔ ہم وطن واپس آئے اور یہاں آکر پاکستانیوں کے اونچے کردار کی وہ روایتیں سنیں کہ دل کو یقین ہو گیا کہ اگر یہ مملکت دشمنوں کے منصوبے سے بچی ہے تو صرف ایک صورت میں کہ ہمارا مذہب اسلام ہو۔ ہماری معیشت اسلامی ہو۔ ہمارے قوانین اسلامی ہوں۔ ہمارا معاشرہ اسلامی ہو۔ ہمارا کردار اسلامی ہو۔ ہم جو کچھ بھی کریں اللہ اور رسولؐ کے احکام کے مطابق کریں اور پاکستان کو صحیح معنوں میں ایک اسلامی فلاحی مملکت بنا دیں۔ جنگ میں شہید ہونے والے غازیوں کی پامردی اور استقلال اور بہادری کے روح افزا واقعات سن کر دل کو تقویت پہنچتی تھی اور یہ سن کر مزید خوشی ہوتی تھی کہ عام شہریوں نے بھی دورانِ جنگ ایسے اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کیا جو روایتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ملک میں سائنٹیفک سوشلزم اور مساواتِ محمدیؐ جیسے "بظاہر" دل خوش کن نعروں سے قوم آزمائش کی گھڑیوں میں پوری نہیں اتر سکے گی۔ بلکہ خالص اسلام اور صرف اللہ اور رسولؐ کے احکام کی پیروی سے ہی یہ قوم مشکلات کو عبور کر سکتی ہے۔

۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء تک الاحیاء کے کام کو اندرون اور بیرون ملک فروغ دیا۔ متعدد مقالے لکھے۔ تقریریں کیں۔ مذاکرات کیے۔ جلسے کیے۔ اخباروں میں مضامین لکھے۔ تجویزیں پیش کیں اور آہستہ آہستہ الاحیاء کا نام اور کام آگے بڑھنا شروع ہوا۔ ۱۹۶۶ء میں مختلف سیاسی جماعتوں نے ایک متحدہ محاذ کی NATIONAL CONVENTION صورت میں مرحوم صدر محمد ایوب کی حکومت کے اقدامات کی مخالفت میں چودھری محمد علی صاحب (سابق وزیراعظم پاکستان اور میرے پرانے دوست) کے ہاں لاہور میں ایک شاندار دو روزہ جلسہ منعقد کیا جس میں حزب مخالف کے چوٹی کے لیڈروں نے تقریریں کیں۔ مجھے کہا گیا کہ میں نے پہلے دن تقریر نہیں کرنی دوسرے دن ایک ریزولیوشن پیش کرنا ہے اور ایک تقریر بھی کرنی ہے۔

پہلے دن متعدد تقاریر ہوئیں۔ جنرل محمد اعظم خاں نے بھی نیم پشتو میں نیم اردو میں تقریر کی اور بھی کئی صاحبان نے تقریریں کیں۔

دوسرے دن جب میری باری آئی تو میں نے کہا۔ "میں کل سے یہاں موجود ہوں۔ متعدد تقریریں ہوئی ہیں۔ ادبی لحاظ سے۔ فصاحت کے لحاظ سے۔ سیاسی لحاظ سے۔ حتیٰ کہ عسکری لحاظ سے ہر تقریر بلند پایہ تھی اور تان ہر تقریر کی اس بات پر ٹوٹتی تھی کہ صدر ایوب اپنی کرسی چھوڑ دیں اور اپنے عہدۂ صدارت سے مستعفی ہو جائیں۔ میں یہ تقریریں سنتا تھا اور دل ہی دل میں اپنے اس پنجابی دوست کی بات دہراتا تھا جو مجھے کہنے لگا "چودھری صاحب! ہزارہ کا تو مولوی مسجد میں داخل ہو جائے تو بارہ سال تک نہیں نکلتا۔ یہ تو با اختیار صدر ہے۔ یہ کب چھوڑے گا۔!

اس پر جلسہ میں جو قہقہے بلند ہوئے، وہ ابھی تک زندہ دلوں کی یاد گرماتے ہیں (یاد رہے کہ صدر ایوب ریحانہ ضلع ہزارہ کے رہنے والے تھے۔) اور پنجاب میں اکثر امام مسجد ضلع ہزارہ سے آئے ہوتے ہیں۔

میں نے حاضرین کو بتایا کہ اس کہانی سے کسی کی تحقیر مقصود نہیں۔ میں خود بھی ضلع ہزارہ میں تھوڑی سی زمین کا مالک ہوں اور گرمیاں ایبٹ آباد میں گزارتا ہوں۔ کیونکہ کاکول میں کوٹھی بنائی ہوئی ہے۔ لہٰذا اس رعایت سے میں خود بھی ہزاروی ہوں۔

جون ۱۹۶۷ء میں عرب اسرائیل جنگ عربوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی۔ سارا یروشلم ہاتھ سے نکل گیا۔ صحرائے سینا، گولان کے پہاڑ دشمن کے قابو آگئے۔ ۶؍ دن کے بعد جنگ بندی ہوئی اور صدر جمال عبدالناصر مرحوم نے مصری عوام کو شکست قبول کرنے پر راضی کرلیا۔ یہاں یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جہاں میرے دل میں ذاتی طور پر صدر جمال عبدالناصر کی بہت قدر و منزلت تھی، وہیں میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ انھوں نے عرب ازم Arabism کے خیال کو فروغ دے کر عالمِ اسلام کو عرب اور غیر عرب حصوں میں بانٹ کر ملّتِ اسلامیہ کی کوئی خدمت نہیں کی بلکہ ایک ذہنی خلفشار پھیلا دیا جس کے مضر اثرات دیر تک اسلامی دنیا چکھتی رہی۔ اللہ تعالےٰ انھیں غریقِ رحمت کرے۔ غالباً انھوں نے یہ سوچا ہوگا کہ عرب جو کہ دنیائے اسلام کے قلب کی حیثیت رکھتے ہیں اگر متحد اور مضبوط ہو جائیں تو سارے عالمِ اسلام کو اس سے تقویت پہنچے گی۔ بہرصورت میری رائے میں صدر جمال ناصر مرحوم نے اسلامی ملکوں کو قریب تر لانے میں کچھ دشواریاں ہی پیش کیں، آسانیاں وہ پیش نہ کرسکے۔

شرکت بہ تقریب عالمی یومِ قانون

مُنعقدہ جنیوا

عالمی امن بذریعہ قانون کانفرنس دو سال بعد منعقد ہوتی ہے۔ اس کا تیسرا اجلاس جولائی ۱۹۶۷ء میں جنیوا میں منعقد ہوا۔ اس وقت تک کانفرنس کے دو جلسے ہو چکے تھے۔ ایک وکلاء کا اور دوسرا جج صاحبان کا۔ مجھے ایک پاکستانی جج نے بتایا کہ جب اسرائیل کا یہودی چیف جسٹس ہال میں داخل ہوا تو شرکاء نے کھڑے ہو کر اور تالیاں بجا کر ان کا بڑے احترام سے استقبال کیا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ مغربی لوگوں کے دلوں میں اسلام سے کتنی دوری اور اسلام کے دشمنوں سے کتنا قُرب موجود ہے۔

میں اس کانفرنس میں بھی انسانی حقوق کی کمیٹی کا چیئرمین تھا جو لیگ آف نیشنز کی عمارت میں I.L.O کے وسیع ہال میں منعقد ہوئی۔ جس میں شہزادی اشرف پہلوی شہنشاہِ ایران کی محترم ہمشیرہ نے بھی نہایت اعلیٰ تقریر انسانی حقوق کے متعلق کی۔ میں چونکہ چیئرمین تھا۔ مجھے نسبتاً آزادی تھی۔ میں نے یہاں واشنگٹن ڈی سی کی کانفرنس میں جو کچھ اسلام کے متعلق کہا تھا، اس سے ذرا آگے قدم بڑھایا اور مندوبین کو دعوت دی کہ وہ میرے اس نظریئے کو پرکھیں کہ جو حقوقِ انسانی اقوامِ متحدہ نے یونیورسل ڈیکلریشن آف رائٹس "عالمی رائے حقوقِ انسانی" کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کی ہیں۔ اُن میں سے سب ضروری حقوق اسلام آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے نہ صرف پیش کر چکا ہے بلکہ عمل بھی کر چکا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک حد تک تعجب ہوا کہ اس غیر مسلم اکثریت کے مجمع نے نہ صرف میری باتوں پر اعتراض نہ کیا بلکہ کسی حد

تمک غور سے سنا۔ جس سے میرا حوصلہ اور بھی بڑھ گیا اور اب میں یہ کہنے کے قابل ہو گیا ہوں۔
کہ اگر ہر مسلمان دنیا میں مبلغ کی حیثیت سے باہر نکلے اور اللہ اور اللہ کے رسولؐ کا پیغام غیر ملکی دنیا
کو اس کے حقیقی رنگ میں پیش کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ لوگ اس کی بات پر کان نہ دھریں۔
اسی اجلاس میں موجودہ جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ موجودہ چیف جسٹس پاکستان مسٹر جسٹس کارنیلیس، سید
ایس ایم ظفر وزیر قانون کے علاوہ قاضی ایم سلیم ایڈوکیٹ بھی ساتھ تھے۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوتی ہے کہ ہمارے بہت سے نوجوان جو امریکہ اور کینیڈا وغیرہ ملکوں
میں گئے ہوتے ہیں، اپنی اپنی انجمنیں بنا کر اسلام کا نور مغرب کے اندھیرے میں پھیلانے کی
کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ مستقل مزاجی سے اپنے عمل پر ڈٹے رہیں، اللہ تعالیٰ
انہیں یقیناً کامیابی دے گا۔ امیر مسلم ملکوں کا فرض ہے کہ مالی معاونت سے ان کا حوصلہ بڑھائیں
اور ان کے کام کو فروغ دیں۔

عالمی امن بذریعہ قانون کانفرنس

منعقدہ جینوا میں شرکت

جینوا کانفرنس کے بعد انگلستان، ڈنمارک اور یورپ کے دوسرے ملکوں کا دورہ کرکے ستمبر میں واپس وطن آئے اور پھر الاخبار کا کام شروع کر دیا۔ ۱۶ر ستمبر ۱۹۶۸ء کو WORLD LAW DAY عالمی یوم قانون کی تقریب جینوا میں منعقد ہوئی۔ جس کا چیئرمین مجھے مقرر کیا گیا۔ چنانچہ وہاں جاکر بھی میں نے امن عالم کو فروغ دینے کے لیے اسلامی تعلیمات کا خاص طور پر ذکر کیا۔ ایک اونچی سطح کے بین الاقوامی مجمع کے سامنے اسلام نے جو احسان بنی نوع انسان پر کیے ہیں، ان کا مختصر ذکر کیا۔ خصوصاً حقوقِ انسان کے متعلق۔ اور خدا کا شکر ہے کہ میری تقریر نہ صرف اخباروں میں بلکہ کئی کتابوں میں بھی نوٹ کی گئی۔ جینوا سے واپسی پر بیروت ٹھہرتا ہوا جدہ پہنچا۔ جہاں میری بیوی اور ایک عزیزہ عمرہ کرنے کی نیت سے پہلے ہی پہنچ چکی تھیں۔ بیروت میں سارا دن مجاہدِ اسلام مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی کے ساتھ گزارا۔ ہم نے عمرہ ادا کیا اور بعد ازاں مدینہ منورہ گئے۔ واپسی پر شاہ فیصلؒ سے پھر ملاقات کی اور اس دفعہ انھیں اس بات پر زور دیا کہ یہودیوں کی بدنظریں مکہ اور مدینہ کی طرف بھی اٹھ رہی ہیں۔ کمیونسٹ دنیا بظاہر تو نہیں لیکن درحقیقت ان کے عزائم کو فروغ دے رہی ہے۔ اس لیے آپ سب سے اوّلیں توجہ اپنی فضائیہ کو اور میزائلوں کے نظام کو مضبوط بنانے کی طرف توجہ دیں تاکہ کسی بدبخت کو ارضِ مقدس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ شاہ شہیدؒ نے بڑی توجہ سے میری معروضات کو سنا اور فرمایا کہ وہ اس کو خاص اہمیت دیتے ہیں:۔

اجرأ رسالہ "الاحباء"

وطن واپس آکر جولائی ۱۹۶۳ء میں رسالہ "الاحباء" کا اجرا کیا جو دو زبانوں یعنی انگریزی اور عربی میں ہر سہ ماہ کے بعد چھپتا ہے اور جس میں اعلیٰ پائے کے لکھنے والے اتحادِ عالمِ اسلامی کے متعلق بلند پایہ مضامین لکھتے ہیں اور اس اہم مسئلے کے پہلو پر مختلف سمت سے روشنی ڈالتے ہیں۔ اگر میں غلطی نہیں کر رہا تو یہ دنیا میں پہلی کوشش ہے کہ عربی اور انگریزی میں کوئی تصنیف صرف اس بات کے لیے وقف کی گئی ہے کہ ہر تین ماہ کے بعد بین اسلام ازم (اخوتِ عالمِ اسلامی) جس کو اقبال نے "جمعیتِ حرم" کا نام دیا ہے، کا پیغام نشر کیا جائے۔

رسالہ الاحباء بڑی تعداد میں چھاپا گیا اور اس کی کاپیاں مفت تمام سربراہانِ ممالکِ اسلامیہ کو (خواہ وہ بادشاہ ہوں یا صدر ہوں) بھیجی گئیں۔ وزرائے اعظم، وزرائے خارجہ، وزرائے امورِ داخلہ، جیدہ یونیورسٹیاں بڑے بڑے اخباروں اور دنیائے اسلام کی نامور ہستیوں کو ارسال کی گئیں اور خدا کا شکر ہے کہ اس وقت سے لے کر آج تک یہ رسالہ (باوجود کئی مالی اور نئی مشکلات کے) جاری ہے اور اپنا پیغامِ اخوت بلا معاوضہ دنیائے اسلام کے کونے کونے تک پہنچا رہا ہے۔ میں خود ہی اس کا آنریری ایڈیٹر ہوں اور ایک مشاورتی کمیٹی محترم جسٹس ڈاکٹر ایس اے رحمان۔ محترم ڈاکٹر سید عبداللہ، محترم جناب حامد علی خاں۔ محترم ڈاکٹر جناب عبدالسلام خورشید۔ محترم ڈاکٹر ظہور اظہر (جو عربی حصہ کے انچارج ہیں) پر مشتمل اس رسالے کی نگرانی کرتی ہے اور خدا کا لاکھ شکر ہے کہ موجودہ ملکی مکدر فضا کے باوجود اس رسالے کا نام دنیائے اسلام کے کونے کونے میں پہنچ چکا ہے، اور اس کے پیغام کو دردمندانِ اسلام توجہ سے پڑھتے ہیں یہ رسالہ اب بھی خدا کے فضل سے جاری ہے اور مدینہ منورہ سے واپسی پر اسلام کی خدمت کا جو عہد کیا تھا اس کی تجدید کرتا رہتا ہے۔

شرکت بہ اجلاس عالمی امن بذریعہ قانون

منعقدہ بنکاک

ستمبر ۱۹۶۹ء میں عالمی امن بذریعہ قانون کی دو سالہ کانفرنس بنکاک (تھائی لینڈ) میں BANGKOK THAILAND میں منعقد ہوئی جہاں میں عرض کر چکا ہوں کہ اس سے پہلے میں انٹرنیشنل کمیشن آف جیورسٹ کے اجلاس کی صدارت کر چکا تھا اور مسلمانان THAILAND (سیام) کے ایک بڑے جلسے سے ملک کے صدر مقام بنکاک میں خطاب کر چکا تھا۔ ۱۹۶۹ء میں ہمارا وفد خاصا بڑا تھا۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک جج صاحبان کا، ہمارے لاہور کے ہائیکورٹ کے چیف جسٹس محترم سردار محمد اقبال اور مسٹر جسٹس ابوسعید چوہدری ہائی کورٹ ڈھاکہ کے جج تھے (جو لبعد میں بنگلہ دیش کے پہلے صدر بنے) دوسرا وکلا کا وفد جس کا میں سربراہ تھا۔ اس وفد میں موجودہ جسٹس ذکی الدین پال جج ہائیکورٹ لاہور اور ڈاکٹر کمال حسین (موجودہ وزیر خارجہ بنگلہ دیش) بھی ممبر تھے۔ اس دفعہ بھی میں نے اپنے دوستوں کی معیت میں بنکاک کے مسلمانوں سے خطاب کیا۔ وہاں کے مذہبی امور کے وزیر چولاراج منتری جلسے کے صدر تھے۔ جہاں میں نے اتحادِ عالم پر انگریزی میں تقریر کی جس کا ترجمہ تھائی زبان میں ساتھ ساتھ سنایا جاتا تھا اور میں دیکھ رہا تھا کہ تقریر کا ہر فقرہ حاضرین کے دلوں میں پیوست ہو رہا ہے۔ اس مشاہدے سے میرا پرانا یقین اور بھی راسخ ہو گیا کہ ملتِ اسلامیہ کا ہر فرد ایک دوسرے کے قریب آنے کے لیے بیتاب ہے۔ اگر اس عمل میں کچھ رکاوٹیں ہیں تو یا وہ بیرونی سازشوں کا نتیجہ ہیں یا ہمارے کوتاہ بین الاسلامی سربراہوں کی ذاتیات کا نتیجہ ہیں جو اپنی ذات کو اپنے مقاصد سے بھی بلند رکھنا چاہتے ہیں۔

میں پہلے کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ ایسے سربراہوں کو راستے سے ہٹانا

ملّت کا فرض ہے کیونکہ خود وہ دشمن ہوں یا دوست جو بھی دو بھائیوں کے نزدیک آنے کی راہ میں رکاوٹ ہے، وہ مفادِ ملّت کے خلاف کام کر رہا ہے۔

بنکاک کانفرنس میں بھی بحیثیت CHAIRMAN HUMAN RIGHTS COMMITTEE کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کی۔ جس میں تھائی لینڈ کے ولی عہد بھی موجود تھے۔ وہاں میں نے پھر واشنگٹن والا پیغام دہرایا کہ دنیا کی نجات اسی میں ہے کہ انسانی حقوق کو اسلام کی تعلیمات کے قالب میں ڈھالا جائے اور انسان کو وہ بلند مرتبہ دیا جائے جو اسلام سے پہلے کسی تعلیم نے نہ دیا تھا اور واقعہ یہ ہے کہ اس کے بعد بھی جو حقوق دیئے گئے، وہ خالی خولی دل خوش کن وعدے تھے۔ آخر اس طرح سے عمل نہیں ہوا جس طرح سے اسلام نے کرایا تھا۔

بنکاک سے واپسی پر ڈھاکہ ٹھہرے۔ جسٹس سردار محمد اقبال صاحب، جسٹس ابوسعید چودھری کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میرے ان سے پرانے مراسم تھے۔ میں اور میری بیوی صبح ان کے ہاں گئے۔ دورانِ گفتگو میں نے اشارۃً پوچھا کہ مشرقی پاکستان سے یہ کیا آوازیں اٹھ رہی ہیں۔ "علیحدگی" کی سرگوشیاں ہو رہی ہیں۔ جسٹس چودھری نے پرزور الفاظ میں کہا یہ سب بکواس ہے۔ مشرقی پاکستان ہمیشہ مغربی پاکستان کے ساتھ رہے گا، آپ مطمئن رہیں۔ ہم ان سرپھرے لوگوں کو راہِ ہدایت پر لے آئیں گے۔ کس قدر بدقسمتی ہے کہ یہی حضرت بنگلہ دیش کے صدر بنے۔

ڈاکٹر کمال حسین وکلا کے وفد کے ممبر تھے، جس کا میں لیڈر تھا۔ ان کو ہم نے کبھی علیحدگی کی بات کرتے نہ سنا۔ بلکہ یہ تاثر لیا کہ یہ تو ہماری طرح محب وطن پاکستانی ہیں۔ لبعد میں یہی حضرت بنگلہ دیش کے وزیر خارجہ بنے (اور اب بھی ہیں۔) اور پاکستان دشمنی اور بھارت نوازی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

ایک ہی سال کے عرصہ میں یہ قلبِ ماہیت کیسے ہوگئی۔ وجہ تو کوئی تاریخ دان ہی بتا سکتا ہے۔ میری (نسبتاً مختصر) داستان میں شاید اس کی گنجائش نہ ہو:

آغاز تحریر کتاب

کامن ویلتھ آف مسلم سٹیٹس

۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء کے شروع تک پھر تنظیم الاخبار کو مضبوط تر اور وسیع تر بنانے میں وقت گزارا۔ یہاں یہ ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ اس وقت کی حکومت نے تین سال سے زائد عرصہ رسالہ الاخبار جاری نہیں ہونے دیا۔ کیونکہ اس کے مدیروں وغیرہ کے چال چلن کی تصدیق ہوتی رہی۔

اسی زمانہ میں خدا نے توفیق دی اور میں نے اپنی تمام مصروفیتوں اور کوتاہیوں کے باوجود وہ کتاب لکھنی شروع کی، جس کا خیال پہلی بار مجھے آج سے کئی سال پہلے آیا تھا اور جسے لکھنے پر اب اقبالؒ کے اس شعر نے مجبور کردیا۔

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

مجھے خیال آیا کہ میں اللہ کے حضور پیش ہوں گا تو اپنا کون سا عمل پیش کرسکوں گا۔ کیونکہ زندگی تو کوتاہیوں اور گناہوں سے پُر ہے۔ یہ دُنیوی نعمتیں جو خدا نے دی ہیں یہ اسی کی دین ہے ان کو کون پوچھے گا؟ کوئی ایسی بات کوئی ایسا عمل پیش کرنے کے خدا قابل کر دے کہ اس کی بارگاہ میں اس کو قبولیت کا شرف ملے۔

بس یہ خیال دل میں مضبوط جگہ پکڑتا گیا اور میں نے کتاب لکھنے کا مصمّم ارادہ کرلیا جس کا نام میں نے COMMONWELATH OF MUSLIM STATES

(A PLEA FOR PAN ISLAMISM) تجویز کیا۔ کتاب انگریزی میں لکھی تھی کیونکہ "جمیعتِ حرم" یعنی پین اسلام ازم PAN ISLAMISM کا پیغام صرف پاکستان کو ہی نہیں بلکہ سارے اسلامی ممالک کو دینا تھا۔ ابتدائی مشکل یہ تھی کہ انگریزی میری مادری زبان نہ تھی بلکہ مجھے اس پر اتنا عبور بھی حاصل نہ تھا کہ کوئی کتاب لکھ سکوں اور ویسے اس سے پہلے میں نے کوئی کتاب لکھی بھی نہ تھی (مسلمان ملکوں کے متعلق) اعداد و شمار آسانی سے دستیاب نہ تھے۔ بعض ضروری دستاویزات موجود نہ تھیں اور نہ آسانی سے مل سکتی تھیں اور سب سے بڑھ کر مشکل یہ کہ مضمون بالکل نیا۔ جس پر اس رنگ میں آج تک کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ پھر طباعت اور اشاعت کی قیمتیں اور اخراجات غرضکہ کئی جھمیلے تھے جو سدِ راہ بن سکتے تھے (اور بنے بھی) لیکن بر مصداق "ہر چہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم" میں نے اللہ کا نام لے کر کتاب شروع کر دی۔ کس طرح میری مشکلات غیب سے حل ہوتی گئیں اور گتھیاں سلجھتی گئیں، یہ وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں جو کبھی صدقِ دل سے اللہ اور اس کے رسولِ برحق کے راستہ پر چلے ہوں۔ آپ یقین جانیے، اس راہ میں چلنے والوں کی حقیقتاً اللہ کے فرشتے مدد کرتے ہیں۔ جس کا ایک مظاہرہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور اس کے منہ اور قلم سے ایسی باتیں نکلتی ہیں کہ اس کو خود بھی تعجب ہوتا ہے۔ بہر صورت کتاب لکھنے کے واسطے "دامنِ کوہ" میں جا بیٹھا۔ وہ دامنِ کوہ (کاکول) جو اسی نیت سے بنایا تھا کہ یہاں فراغت سے یادِ خدا ہو سکے گی۔

وہ دامنِ کوہ جہاں میں نے اپنے پرانے شاگرد اور دوست اور سابق جسٹس اے۔ آر۔ چنگیز جج ہائی کورٹ کو چائے کی دعوت دی تو دعوت نامہ کے خط کے پیچھے ہی وہ ایک رباعی اور قطعہ لکھ کر لے آئے۔ ملاحظہ ہو رباعی۔

دامنِ کوہ میں بسے ہیں وہ
تیرے جلوؤں کو دیکھتے ہیں وہ

نور بکھرا ہوا ہے چاروں سمت
تیری تصویر تک رہے ہیں وہ

اور قطعہ ملاحظہ ہو:-

دامنِ کوہ میں آبسے ان کو مقام مل گیا
گوشۂ کوہسار میں دارالسلام مل گیا
ان کو سکون مل گیا، ان کو قرار مل گیا!
جیسی تھی ان کو آرزو، ایسا مقام مل گیا
ان کو بھی تیری جستجو پھرتے رہے وہ کوبہ کو
جس نے ترا پتہ دیا ایسا امام مل گیا
پی کے وہ لاالٰہ کی مے یادِ خدا میں محو ہیں
ان کو سُرور مل گیا وحدت کا جام مل گیا
مجھ کو نذیر مل گئے "دامنِ کوہ" میں لے گئے
کتنا میں خوش نصیب ہوں ان کا مقام مل گیا

اور یہ وہی "دامنِ کوہ" ہے۔ جہاں ۱۰ ستمبر ۱۹۷۳ء کو مرحوم پروفیسر حمید احمد خان سابق وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی اپنے بچوں کیساتھ چند دن ٹھہرے تھے اور وہاں پہنچتے ہی انھوں نے ذیل کی نظم ارقام کر کے مجھے بھیجی تھی۔

مرحبا پیکرِ اخلاص نذیر احمد خاں!
صاحبِ صدق و صفا جس کے ہوئے ہم مہماں
"دامنِ کوہ" کو یوں تو نے سجا رکھا ہے
ہر روش جنتِ فردوس کا ہوتا ہے گماں
فرحتا حسنِ تخیل کہ جدھر اٹھے نگاہ روکشِ باغِ جناں ارض و سما کا ہو سماں

ذوقِ تعمیر ترا دیکھ کے حیران ہوں میں
کیوں نہ کہہ دوں تجھے ہم مرتبۂ شاہِ جہاں
تو وہ خوش فکر ہے جذبۂ تزئینِ جہاں!
کبھی شوقِ چمن آرا میں لگا لیتا ہے
کبھی رکھتا ہے پئے خدمتِ اسلام رواں

ایسے ماحول میں کتاب لکھنی شروع کرنا محض اللہ کی رحمت تھی اور اسی ذاتِ باری کی مہربانی سے میری ناچیز کوشش پوری ہوئی۔ خدا اسے بارآور بھی کرے۔ آمین۔ اگست ۱۹۶۹ء کے شروع میں تھیاگلی میں سابق جسٹس فضل اکبر مرحوم سے جاکر ملا۔ جو ان دنوں DECENTRALIZATION COMMITTEE کے چیئرمین تھے۔ جنھوں نے ONE UNIT کے انتظامی ڈھانچہ میں تبدیلیوں کی سفارش کرنی تھیں۔ انھوں نے بالوضاحت اپنی تجاویز مجھے بتائیں جو کم از کم بادی النظر میں مجھے بہت مقبول اور قابلِ عمل نظر آئیں اور جن پر عمل کرنے سے صوبوں اور مرکز کے درمیان جو تفاوت پیدا ہو گیا تھا اور جو مشکلات رونما ہوئی تھیں وہ کافی حد تک اور آسانی سے دور ہو سکتی تھیں۔

۲۲ اگست ۱۹۶۹ء کو میں ایبٹ آباد سے راولپنڈی گیا اور اس وقت کے سربراہِ مملکت صدر جنرل محمد یحییٰ خاں سے ملا۔ اس وقت کچھ لوگ ون یونٹ توڑنے کے درپے تھے۔ مجھے ان سے پہلے ذاتی تعارف نہ تھا۔ میں انھیں صرف یہی کہنے گیا تھا کہ یہ جو "ون یونٹ" کے خلاف مہم چلائی جا رہی ہے، یہ ایک سیاسی چال ہے جس میں کئی طالع آزما اپنا فائدہ سوچتے ہیں۔ آپ ون یونٹ توڑنے والوں کے کہنے میں نہ آئیں۔

میری ملاقات کوئی گھنٹہ بھر سے زیادہ جاری رہی جس میں پون گھنٹہ میں نے ون یونٹ کو برقرار رکھنے کے دلائل پر صرف کیا۔ یہ بھی کہا کہ جسٹس فضل اکبر صاحب کی سفارشات سے آگاہ ہو کر آیا ہوں۔ آپ ون یونٹ توڑنے کی اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر نہ لیں اور

وقت حاصل کرنے کے لئے توڑنے کا مشورہ دینے والوں سے کہیں کہ فضل اکبر رپورٹ کا مطالعہ کرنے کے بعد فیصلہ کیا جائے گا۔ وہ فرمانے لگے کہ ملک کے تمام سیاسی لیڈر بضد ہیں کہ ون یونٹ توڑا جائے۔ میں نے پوچھا وہ حضرات کون ہیں؟ سب سے پہلے انھوں نے شیخ مجیب کا نام لیا۔ تو میں نے ذرا جھمک کر کہا کہ شیخ مجیب کو ہمارے معاملات میں اس طرح دخل دینے کا کیا حق ہے؟ وہ کبھی خود یہاں آکر ہمارے دکھ درد میں شریک نہیں ہوئے۔ ان کی عوامی لیگ کی کوئی فعال شاخ مغربی پاکستان میں موجود نہیں۔ یہاں کے لوگ شیخ مجیب کو ہرگز ہرگز اپنا لیڈر تسلیم نہیں کرتے۔ آپ کو ان کی رائے اس معاملے میں مسترد کر دینی چاہیئے۔ کہنے لگے کہ نہیں مجیب کے علاوہ خود مغربی پاکستان کے کئی سیاسی لیڈر ون یونٹ توڑنے پر زور دے رہے ہیں۔ کچھ نام انھوں نے بتائے جو اکثر ان اصحاب کے تھے، جنھوں نے ون یونٹ بنوایا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ کسی وقت تو یہ ون یونٹ کے حامی تھے اور اگر آپ کو ون یونٹ توڑنے پر زور دیتے ہیں تو اس کی کیا اہمیت۔ بہر صورت جمہوری اقدار کے مطابق دیکھا جائے تو یہ ان کی ذاتی رائے نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی جماعتوں سے اس معاملے پر کوئی فیصلہ طلب نہیں کیا ہے اور نہ ہی کسی سے مشورہ کیا ہے۔ میں خود ایک جماعت (مسلم لیگ کی زونل ورکنگ کمیٹی) کا ایک ممبر ہوں۔ مجھ سے کسی نے اس مسئلے پر کوئی گفتگو نہیں کی۔ آپ ان کی شخصی آرا کو نظر انداز کریں اور ہماری وحدت کی جیتی جاگتی نشانی ون یونٹ کو توڑنے کا اقدام نہ کریں۔ گفتگو بے تکلفانہ ماحول میں ہوئی۔ انگریزی میں بھی اور اردو میں بھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں نے انگریزی کے یہ الفاظ استعمال کیے تھے:۔

"YOUR REGIME SHOULD NOT GIVE ITS BLESSINGS TO THE DISINTEGRATION OF ONE UNIT BECAUSE IT COULD LEAD TO THE DISINTEGRATION OF EVERY THING IN THE COUNTRY INCLUDING THE

BRICKS OF HOMES."

"آپ کی حکومت کو ون یونٹ توڑنے کی منظوری نہیں دینی چاہیے۔
کیونکہ ون یونٹ پارہ پارہ ہونے سے ملک کی ہر ایک چیز ٹوٹ جائے گی،
حتیٰ کہ ہمارے گھروں کی اینٹیں بھی بکھر جائیں گی۔"

میں یہ تاثر لے کر اٹھا تھا کہ غالباً جنرل محمد یحییٰ خاں، فضل اکبر کمیٹی کی رپورٹ کا انتظار کریں گے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان پر سیاسی دباؤ اس قدر زیادہ ہو گیا کہ تھوڑے عرصے کے بعد ہی ون یونٹ توڑنے کا اعلان کرنا پڑا۔

میری اپنی رائے میں ہماری موجودہ کمزوریوں کا آغاز اسی دن سے ہوا ہے، جب سے طالع آزما لوگوں نے مغربی پاکستان کی اکائی کو ختم کرایا ہے۔ اب جئے سندھ۔ سندھو دیش آزاد بلوچستان، آزاد پختونستان اور اس قسم کے خطرناک نعرے عام طور پر سننے میں آرہے ہیں۔ صوبائی اور علاقائی تعصبات اور بڑھ رہے ہیں۔ ایک ملتِ اسلامیہ (جس نے پاکستان حاصل کیا تھا) کی بجائے اب چار قومیتوں کے نعرے لگ رہے ہیں۔ صوبوں صوبوں کے گورنروں، وزرا اعلیٰ، ان کے وزیروں اور ان کے سیکرٹریوں کی فوجِ ظفر موج کے بے پناہ اخراجات حکومت پر آپڑے ہیں۔ حالانکہ اس کا پیسہ پیسہ دفاع اور ملکی ترقی پر خرچ ہونا چاہیئے تھا۔ لیکن ہو یہ رہا ہے کہ لمبی لمبی ایرکنڈیشنڈ کاروں، صوبوں کے گورنروں گورنمنٹ ہاؤسوں اور وزراء کرام کی کوٹھیوں کی آرائش و زیبائش پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جارہا ہے۔ جس صوبے میں انگریزی حکومت کے پانچ پانچ وزیر ہوتے تھے۔ اب گیارہ گیارہ اور بارہ بارہ وزیر ہیں۔ پھر ان کے پارلیمانی سیکرٹری ہیں۔ پھر ہر ایک صوبے کی اسمبلی کے ممبر صاحبان ہیں۔ ان کو بھی کاروں کی مراعات دی گئیں ہیں۔ ظاہری شان و شوکت کا یہ عالم ہے کہ ملک کی سب سے بڑی ضرورت (دفاع) سے توجہ ہٹنے کا اندیشہ ہے۔ جب میں مرکز میں وزیر تھا، ہمیں کوئی سرکاری گاڑی نہ ملی ہوئی تھی۔ سب وزیر

اپنی کار استعمال کرتے تھے لیکن اب تو وزیروں کی کاروں کو دیکھ کر ریلوے ٹرین کے ڈبے کا گمان ہوتا ہے۔ اور سٹاف کاروں STAFF CARS کی تو پرائیویٹ مقامات پر بھی وہ بھرمار ہوتی ہے کہ دکھ آتا ہے کہ اس غریب ملک پر یہ بے معنی اور زائد بوجھ کیوں روا رکھے جا رہے ہیں اور دفاع اور ترقی کی طرف کیوں وہ اولین توجہ نہیں دی جا رہی، جس کی ہمیں سخت ضرورت ہے؟ ❖

سفرِ مکۃ المکرّمہ

دیارِ حبیبؐ کی دیدار کی تڑپ نے پھر سے بے چین کر دیا۔ چنانچہ میں، میری بیوی اور چار اور عزیز عمرہ کی نیت سے مارچ ۱۹۷۱ء کے وسط میں مکہ مکرمہ پہنچے۔ ان میں میرے مرحوم برادرِ نسبتی میاں مشتاق احمد (سابق ڈائریکٹر تعلیمات لاہور) ان کی بیوی (میری سالی وحیدہ) میری بھوبی بی گل اور نواسی عمیرا شامل تھیں۔ میری سالی کے لڑکے رشید مرتضیٰ ایڈوکیٹ بھی ہمارے ہمراہ کچھ وقت رہے۔ چار دن مکہ مکرمہ میں عمرہ کر کے اور اکثر وقت خانۂ خدا میں حاضری دے کر جو روحانی لطف حاصل ہوا، اسے کوئی عارف ہی بیان کر سکتا ہے۔ مجھ جیسا گنہگار ان برکتوں کا کیا اندازہ کر سکتا ہے۔

دورانِ قیام مکہ مکرمہ اپنے پرانے دوست محترم محمد صالح قزاز (جو آجکل رابطۂ عالمِ اسلامی مکہ مکرمہ کے سیکرٹری جنرل اور اُس وقت توسیعِ حرم کعبہ کمیٹی کے صدر تھے) کے ہمراہ تمام تر نئی عمارات کا معاینہ کرنے کا موقعہ ملا۔ سبحان اللہ! کیا مسجد بنی ہے۔ عظمتِ اسلام کی منہ بولتی تصویر۔ اللہ تعالےٰ شہید شاہ فیصل المعظم کو غریقِ رحمت فرمائے۔ وہ صحیح معنوں میں خادم الحرمین الشریفین تھے۔ انھیں اسلام اور خدمتِ اسلام سے والہانہ الفت تھی۔ انھوں نے توسیعِ حرمِ کعبہ پر بے دریغ روپیہ صرف کیا اور زائرین کی سہولتوں کے لیے حرم کے اردگرد وسیع سڑکیں اور چوراستے بنوائے۔ ٹریفک کا بہترین انتظام کیا۔ خانۂ خدا کے ساتھ حرمِ کعبہ کی مسجد دنیا کی عظیم الشان عمارتوں میں شمار ہوتی ہے

اس کی وسعت، خوبصورتی، پاکیزگی، نفاست، شان غرضکہ اس کی ہر صفت نرالی ہے۔ پانچ لاکھ زائرین کے واسطے ایک وقت میں چھت کے نیچے نماز ادا کرنے کا اہتمام پورا ہونے کو تھا۔ سب کام سعودی معمار خود کر رہے تھے۔ دیکھنے والے کے دل پر اللہ تعالیٰ کے جلال کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی۔ اللہ تعالےٰ اس سلطنت کو قائم و دائم رکھے اور اس کے مرحوم درویش صفت سربراہ شاہ فیصل شہید کے درجات بلند کرے۔ جنھوں نے خدمتِ اسلام اپنے تن من، دھن سے کی اور سعودی عرب کو اس مقام پر پہنچایا جو رشکِ عالم ہے۔ آمین ثم آمین۔

مکہ مکرمہ سے نبی کریمؐ کے شہر مدینہ منورہ میں گئے۔ اس دفعہ یہ دعا مانگ کر گئے تھے کہ یا اللہ! چالیس نمازیں مسجد نبوی میں ادا کرنے کی سعادت عطا فرما۔ ہم رابطہ کے مہمان تھے۔ انھوں نے ہمیں ہمارے پرانے ہوٹل تغشیر الجدید میں بڑے اہتمام سے ٹھہرایا۔ وہاں سے مسجدِ نبوی بالکل قریب ہی ہے۔ اللہ تعالےٰ کا شکر ہے کہ ہم متواتر گیارہ دن مدینہ منورہ میں رہ سکے اور چالیس نمازیں مسلسل مسجد نبوی میں ادا کرنے کی سعادت نصیب ہوئی (بلکہ پچاس سے بھی زائد نمازیں مسجد نبوی میں پڑھنے کی توفیق خدا نے دی۔)

دورانِ قیام مدینہ منورہ میں اور میاں مشتاق احمد مرحوم مدینہ یونیورسٹی کے رئیس الجامعہ شیخ الاسلام شیخ عبدالعزیز بن باز کو ملنے گئے۔ جنھوں نے بہ کمال مہربانی ہمیں دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ کھانے کا طریقہ خالص اسلامی تھا۔ چھوٹے بڑے مالک اور آقا کی کوئی تمیز نہ تھی۔ سب ہی ایک رکاب میں سے کھا رہے تھے۔ صحیح مساوات کا نقشہ آنکھوں کے سامنے اُجاگر تھا۔ خیال آیا کہ ہمارے قول و فعل میں کتنا تضاد ہے۔ ہم کہتے تو یہ ہیں کہ ہم مساواتِ محمدیؐ پر عمل پیرا ہیں لیکن درحقیقت امیر اور غریب کے درمیان فرق بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

شیخ صاحب نے ایک بڑی پتے کی بات کہی۔ مختصر مگر پُرمغز! فرمانے لگے:

"جو ملک اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا، اب اس میں سوشلزم پھیلایا جا رہا ہے"۔ مدینہ منورہ میں گیارہ دن کے قیام کے بعد جدّہ واپس آئے۔

جدّہ اب جدّہ نہیں رہا تھا۔ تیل کی دولت نے ایک عظیم انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ جو اقتصادی، تمدنی، تجارتی، صنعتی شعبوں پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ سعودی عرب دن دوگنی، رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ تعلیم کے میدان میں تجارت کے میدان میں، زراعت کے میدان میں، سیاست کے میدان میں، غرضکہ مکہ کے باشندوں کو جو خوشخبری اللہ تعالیٰ نے خانہ کعبہ کے محافظین کے صلے میں دی تھی، وہ اب آپ آنکھوں سے پوری ہوتی دیکھ رہے ہیں اور زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ مرحوم شاہ فیصل شہید نے نہ صرف اتحادِ عالمِ اسلامی کی سب سے نمایاں خدمات سرانجام دیں بلکہ انھوں نے ملک میں اسلامی قوانین رائج کر کے خدمتِ اسلام کے تقاضے کماحقہ پورے کیے۔

مقدس مقامات، مدینہ منورہ، خانہ کعبہ وغیرہ کو تو چھوڑیئے، اب بھی جدّے جیسے تجارتی شہر میں نماز کے وقت کروڑہا روپے کا مال دکانوں میں کھلا پڑا ہوتا ہے اور سب دکاندار نماز ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ اور تو اور صرّاف جن کی ریڑھیوں پر لاکھوں روپے کا زرِ مبادلہ دنیا کی تمام کرنسی میں جو لاکھوں کی رقم میں موجود ہوتا ہے، وہ بھی محض ایک چادر کے نیچے دے دیا جاتا ہے۔ تاکہ سمندر کی ہوا سے اڑ نہ سکے۔ اوپر ایک پتھر رکھ دیا جاتا ہے۔ کیا مجال کسی کی کہ کوئی ایک نوٹ بھی وہاں سے اٹھا سکے۔

سطوتِ پیغمبرؐ اگر دیکھنی ہو تو شاہ فیصل شہید کی عملداری کا رخ کیجیے۔ دینی برکتوں سے تو آپ فیض یاب ہوں گے۔ دُنیوی نکتۂ نگاہ سے بھی ایک صاف اور پاکیزہ معاشرہ دیکھ سکیں گے۔

مدینہ منورہ ہی میں تھے کہ ریڈیو پر یہ خبر سنی کہ شیخ مجیب کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں نے وہاں سے ہی صدر یحییٰ کو مبارک باد کا تار دیا اور دعا کی کہ اللہ تعالیٰ پاکستان کو

غداروں کی سازشوں سے محفوظ رکھے۔ میری نظر میں شیخ مجیب پاکستان کے غدار اور بھارت کے ایجنٹ اور اس کے زیر اثر پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے پر تلے ہوئے تھے حکومت وقت بھی اس کے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہی تھی۔ اگرتلہ کی سازش کا کیس (جس کے متعلق معتبر ذرائع سے سنا ہے کہ بالکل سچا کیس تھا) واپس لے لیا گیا تھا اور مجیب کو گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کی دعوت بھی دی گئی تھی میری رائے میں سارے اقدامات غلط تھے۔ ان کا جو خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑ رہا ہے، وہ خدا جانے کہاں تک پہنچ کر ختم ہوگا۔ ہمارے اکثر سیاسی لیڈروں نے اس وقت مجیب کی ہاں میں ہاں ملانا شروع کر دیا۔ ون یونٹ توڑ دیا اور پھر مشرقی پاکستان میں اسے من مانی کارروائیوں کی کھلی چھٹی دے دی۔ جس کا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیں وہ روزِ بد دیکھنا پڑا کہ ہمارا مشرقی بازو کٹ کر بنگلہ دیش بن گیا۔ جس کی حیثیت بھارت کے ایک صوبے اور روس کے کفش بردار سے زیادہ نہیں ہے۔ میں ان تمام افسوس ناک واقعات کا ذمہ دار کسی ایک شخص کو نہیں ٹھہرا سکتا۔ میری رائے میں ہمارے اکثر اکابرین پاکستان کو دو ٹکڑے کرانے کے ذمہ دار قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

زیادہ افسوس یہ دیکھ کر ہوتا ہے کہ اس عظیم المیے کے بعد بھی ہماری آنکھیں نہیں کھلیں اور اب بھی ہم علاقائی زبانوں، علاقائی تاریخ، علاقائی ثقافت، علاقائی ضروریات اور علاقائی اہمیت پر زور دے رہے ہیں۔ ون یونٹ کو توڑ کر اب سرائیکی اور پوٹھوہاری علاقوں کا ذکر بھی سننے میں آتا ہے۔ اگر یہ روش نہ بدلی گئی تو مجھے خطرہ ہے کہ پاکستان کا مستقبل (خدانخواستہ) تاریک سے تاریک تر ہو جائے گا۔ پاکستان ہم نے ملتِ اسلامیہ کے وطن کے طور پر حاصل کیا تھا، کسی خاص قومیت کے واسطے نہیں۔

مدینہ منورہ سے واپسی پر پھر جدہ میں مسٹر انور علی کے ساتھ شہید شاہ فیصل المعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ارضِ مقدس کے دفاعی انتظامات پر زور دیا۔

اپریل ۱۹۷۱ء میں وطن واپس پہنچا۔ اس وقت تک مشرقی پاکستان کے حالات بہت

بگڑ چکے تھے۔ غیر مسلم دنیا میں پاکستان کے خلاف بنگالیوں پر ظلم کی من گھڑت داستانیں مشہور ہو رہی تھیں۔ لیکن افسوس کہ ہماری حکومت بالکل خاموش تماشائی بنی بیٹھی تھی۔ نہ ہمارے سفارتخانے کچھ کر رہے تھے اور نہ حکومت جواب دہی کی تکلیف گوارہ فرما رہی تھی۔ یہ حالات دیکھ کر میرا دل کھولتا تھا۔ میں نے پھر ۱۹۷۱ء میں صدر یحییٰ خاں سے ملاقات کی اور ان سے کہا کہ ایک تو مظالم کی خود ساختہ داستانوں کی تردید کریں اور ایک قرطاسِ ابیض جاری کریں، جس میں اعداد و شمار کے ذریعے یہ ثابت کیا جائے کہ مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کو نچوڑا نہیں ہے بلکہ جو ترقی وہاں صنعت و حرفت اور تجارت میں ہوئی ہے، وہ تمام تر مغربی پاکستانیوں کی کوششوں اور سرمائے سے ہوئی ہے۔ دوسری رائے میں نے ان کو یہ دی کہ غداروں سے نرمی کا سلوک نہ کیا جائے بلکہ جس کسی کے خلاف بھی قانونی ثبوت موجود ہو ان کو فوراً اس کے کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے۔

افسوس کہ ہمارے حالات اس وقت تک ایسے بگڑ چکے تھے کہ نہ کسی نے جواب دہی کی اور نہ کوئی قرطاسِ ابیض جاری ہوا اور نہ ہی غداروں کی سرکوبی کی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ روزبروز مغربی پاکستان والوں کے مبینہ مظالم کی داستانیں ساری دنیا کے پریس میں غیر مسلم اخبار نویسوں نے مزے لے لے کر دھرائیں۔ ان پر حاشیہ آرائیاں کیں۔ مشرقی پاکستان والوں کو کھلم کھلا بغاوت پر اکسایا۔ ہماری فوجوں کو وحشی اور درندے ثابت کیا۔ قتل اور زنا اور غارت گری کی وہ جھوٹی کہانیاں دنیا کے سامنے پیش کیں (اور متواتر کرتے رہے) کہ غیر ممالک کے اکثر لوگ اس خیال سے متفق ہو گئے کہ مغربی پاکستان کے لوگ وحشی ہیں ظالم ہیں اور مشرقی پاکستان کے خلاف پاکستانی فوجوں نے وہ ظلم و ستم روا رکھا ہے جو انھیں علیحدہ ہونے پر مجبور کر رہا ہے۔

یہ تو تھا ہماری فوجی حکومت کا رویہ۔ ہمارے اکثر سیاسی لیڈروں نے بھی مشرقی پاکستانیوں کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس کا نتیجہ جو نکلا، وہ آپ دیکھ رہے ہیں:۔

شرکت بہ اجلاس عالمی امن بذریعہ قانون

منعقدہ بلغراد

۱۹۷۱ء میں جولائی کی ۱۹ سے لے کر ۲۳ تاریخ تک "عالمی امن بذریعہ قانون" کی پانچویں دو سالہ کانفرنس یوگوسلاویہ میں منعقد ہونا قرار پائی۔ گو میں اسکی HUMAN RIGHTS کمیٹی کا چیئرمین اب بھی تھا لیکن اپنی صحت کے تقاضوں کے مدنظر اور اس خیال سے کہ مجھے سکون کے ساتھ اپنی کتاب ختم کرنے کا موقعہ زیادہ ملنا چاہیئے، میں نے CHARLES RHYNE صدر عالمی تنظیم کو لکھ دیا کہ میں شاید اس دفعہ بلغراد حاضر نہ ہوسکوں۔ اگر میں نہ آیا تو آپ انسانی حقوق کی کمیٹی کے چیئرمین کا کوئی اور بندوبست کرلیں۔ میرا ارادہ تھا کہ "دامنِ کوہ" میں اطمینان سے بیٹھ کر اپنی کتاب جو ۱۹۷۰ء میں شروع کی تھی، مکمل کروں گا۔

جب میں یہ فیصلہ کرچکا تو حکومتِ پاکستان نے زور دینا شروع کردیا کہ میں بلغراد کی کانفرنس میں ضرور شریک ہوں۔ کیونکہ وہاں انسانی حقوق کی کمیٹی میں جس کا میں مستقل چیئرمین ہوں، ممکن ہے بہت سے متنازعہ فیہ مسائل اٹھائے جائیں۔ میں بوجوہاتِ متذکرہ بالا بلغراد جانے پہ رضامند نہ تھا۔ لیکن حکومت کا اصرار اس قدر بڑھ گیا کہ آخر مجھے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اس نازک وقت میں شاید میں بلغراد جاکر پاکستان کی کچھ خدمت کرسکوں (اگرچہ ماحول اس کے بالکل خلاف تھا) بہرصورت مجبوراً میں نے ہاں کردی۔ گورنمنٹ نے مجھے تین رُکنی وفد کا لیڈر بناکر تمام سفارتی مراعات دے کر اور سارے مصارف خود برداشت کرکے آخرکار

بلغراد پہنچا ہی دیا اور گو میرا یہ مطالبہ تھا کہ جانے سے کم از کم پندرہ دن پہلے مجھے تمام سرکاری دستاویزات، ٹکٹ وغیرہ مل جانے چاہئیں۔ ہوا یہ کہ ۱۸ر جولائی ۱۹۷۱ء کو گیارہ بجے ایبٹ آباد میں تار ملا کہ صدر مملکت نے آپ کو وفد کا لیڈر چنا ہے اور آپ فوراً بلغراد کانفرنس میں شریک ہوں۔ مزید ہدایات دفترِ خارجہ اسلام آباد سے حاصل کریں۔ ۱۹ر جولائی کو میں دفترِ خارجہ پہنچا۔ وہاں میری ہدایت کے واسطے کوئی کاغذ موجود نہ تھے۔ ہوائی جہاز کا ٹکٹ اور زرِ مبادلہ بھی میں نے سارا دن بھاگ دوڑ کر خود حاصل کیے۔ ۱۹ر جولائی کی شام کو کراچی پہنچا اور ۲۰ر جولائی کی صبح کو بلغراد روانہ ہوا جہاں اسی دن کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ہو رہا تھا۔ میرے وفد کے دوسرے ممبر مسٹر حمید الحق چودھری (سابق وزیر خارجہ پاکستان) تھے اور تیسرے ممبر ہمارے بلغراد کے سفارت خانے کے سیکنڈ سیکرٹری تھے۔ جنھوں نے اتنی بڑی بین الاقوامی کانفرنس پہلی مرتبہ دیکھی تھی۔ ان کا ہونا نہ ہونا ایک برابر تھا۔ مسٹر حمید الحق چودھری نے نیویارک سے آنا تھا۔ وہ جس دن پیرس پہنچے اس دن کانفرنس ختم ہو چکی تھی۔ انھوں نے پیرس سے مجھ سے پوچھا کہ میرے لیے کیا ہدایات ہیں؟ میں نے کہا کانفرنس تو ختم ہو رہی ہے، اب آپ کو بلغراد آنے کی ضرورت نہیں۔

گویا کہ میں پاکستان کے واحد مندوب کی حیثیت سے گرتا پڑتا وہاں پہنچا (گرتا پڑتا اس لیے کہ بیروت سے ایتھنز اور ایتھنز سے بلغراد تک میری سیٹ بھی منتقل نہ تھی) پاکستان کے مندوب کی حیثیت سے اپنے پرانے دوست ہمارے سفیر حکیم محمد احسن جو افتتاحی اجلاس میں شرکت کر کے واپس آ رہے تھے، کو ملا۔ میں نے ہوٹل یوگوسلاویہ میں ٹھہرنا تھا، جہاں کانفرنس ہو رہی تھی۔ چونکہ میں ۱۹۶۰ء سے اس کانفرنس کے ساتھ منسلک تھا اور ایک دفعہ WORLD LAW DAY کی صدارت بھی کر چکا تھا، اس واسطے کانفرنس کے اکثر مندوبین میرے ذاتی واقف تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ایک نہیں، دو نہیں، چار نہیں، بیسیوں نے سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔

WHAT ABOUT THESE MASSACRES MR KHAN

"مسٹر خان یہ آپ لوگ قتل عام کیوں کر رہے ہیں؟ (مشرقی پاکستان میں)

AND WHAT ABOUT THOSE REFUGEES'

"اور ان پناہ گزینوں کی کیا صورت ہے، جن کو آپ نے نکال دیا ہے۔ (مشرقی پاکستان سے) جدھر جاؤں، سوالات کی بھرمار۔ میں اکیلا جواب دینے والا۔ ہندوستانی وفد کے چودہ ممبر تھے۔ جن میں مسٹر سکری SIKRI جو اس وقت چیف جسٹس تھے اور مسٹر ہدایت اللہ سابقہ چیف جسٹس بھارت بھی شامل تھے۔ (دونوں میرے پرانے واقف تھے) گیارہ نمائندے اسرائیل کے تھے جن میں اور بھارتیوں میں بڑا گٹھ جوڑ تھا اور ویسے بھی فضا عام طور پر مغربی پاکستان کے خلاف پائی گئی۔ چند مصری دوستوں نے (جو پہلی کانفرنسوں میں شامل ہونے کی وجہ سے میرے واقف تھے) مجھ سے علیحدگی میں آ کر کہا کہ آپ کی عدم موجودگی میں آپ کے خلاف بہت پروپیگنڈہ ہو رہا ہے کہ آپ نے مشرقی پاکستانیوں پر بہت ظلم ڈھائے ہیں اور ان کو تارک الوطنی پر اور بھارت میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔

یقین جانیئے کہ میں ہر روز دو دو خواب آور گولیاں کھا کر سوتا تھا۔ کیونکہ سارا دن جواب دے دے کر دماغ بالکل تھک جاتا تھا۔

حکومت پاکستان کی ہدایات تو مجھے کیا پہنچنی تھیں۔ میں اپنی حکومت کی اہلیت سے خوب واقف تھا۔ میں نے خود ہی اپنے سفارت خانے کی معرفت انسانی حقوق کی کمیٹی کے چیئرمین کی حیثیت سے جو افتتاحی تقریر کرنی تھی، ٹائپ کروائی اور خدا کے فضل سے پورے یقین اور اعتماد سے (یہ جانتے ہوئے کہ مخالفین بڑی تعداد میں موجود ہیں) کرسیٔ صدارت پر بیٹھا اور کچھ اس طرح سے مندوبین کو خطاب کیا۔

"میں آپ سب کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ اس دفعہ ہم نے اس کمیٹی کا دائرہ بحث ذرا وسیع کر دیا ہے۔ پہلے ہم صرف انسانی

حقوق پر بحث کرتے تھے۔ اب وہ فرائض بھی زیر بحث آ سکتے ہیں جو ایک فرد پر معاشرے یا حکومت کی طرف سے عائد ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ہماری بحث بڑی معنی خیز رہے گی اور اس میں کئی ایسی الجھنیں جن کے پیدا ہونے کا امکان ہے، دور ہو جائیں گی۔ مثال کے طور پر تارک الوطن کی تعریف۔ آپ نے سوچا ہوگا کہ اگر کوئی شخص یا جماعت اپنی حکومت کے خلاف بغاوت کے جرائم کا ارتکاب کر کے کسی دوسرے ملک میں جا چھپے اور وہاں سے تخریب کاری کا سلسلہ جاری رکھے اور اس کی اپنی حکومت اسے یقین دلائے کہ اگر تم واپس آجاؤ تو تمھارے ساتھ ہرگز بدسلوکی نہیں کی جائے گی لیکن وہ شخص یا جماعت واپس نہ آئے تو کیا وہ رفیوجی یا تارک الوطن کی تعریف میں آتے ہیں؟ اس طرح اور بھی چند مسائل آپ کے سامنے آئیں گے جن پر آپ کی قیمتی رائے سے ہمیں رہنمائی ملے گی۔ اور ساتھ ہی میں نے کانفرنس کے ایک سٹینڈنگ STANDING آرڈر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ مجھے امید ہے کہ تمام مقررین اپنی تقریروں میں کسی سیاسی صورتِ حال کا یا کسی خاص ملک کا تذکرہ نہ کریں گے کہ اس کی اجازت نہیں ہے۔"

میں اس قسم کے افتتاحی کلمے کہہ رہا تھا کہ ایک دم ہندوستان اور اسرائیل دونوں کو ہال میں اکٹھے داخل ہوتے دیکھا۔ باقی کسی نے تو مخالفانہ دلچسپی نہ دکھائی لیکن ایک بالکل نوخیز ہندوستانی مندوب نے اگر تقریر کرنا چاہی اور ایسی مجالس کے آداب کے خلاف یہ کہہ دیا کہ میں چیئرمین کے ریمارکس پر نکتہ چینی کرنے آیا ہوں۔ میں نے قواعد وضوابط کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ کو ایسا کرنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ وہ مُصر ہوئے تو میں نے انھیں کہا کہ اگر آپ میری جائز ہدایات پر کان نہیں دھریں گے تو آپ کو حکم دیتا ہوں کہ آپ اپنی جگہ پر واپس چلے جائیں۔ وہ اس قدر بوکھلا گئے کہ چپ سادھ کر واپس

اپنی کرسی پر جا بیٹھے۔ اتنی دیر میں مسائل کا کوئی اور پہلو زیر بحث آ گیا اور میں نے جو تارکین الوطن کے متعلق کیا تھا، وہ زیر بحث نہ آ سکا۔ اگرچہ سمجھنے والوں نے سمجھ لیا کہ یہ تارک الوطن لوگوں پر ظلم کرنے کے قصے جو ہیں، ان کی حقیقت کیا ہے ؟

دورانِ کانفرنس چند چیدہ چیدہ مندوبین کو دو خاص ہوائی جہازوں کے ذریعے مارشل ٹیٹو MARSHALL TITO صدر یوگوسلاویہ سے ملاقات کے لیے بلغراد سے ساڑھے تین سو میل دور جزیرہ BRIONI میں لے جایا گیا۔ میری بھی مارشل ٹیٹو سے ملاقات ہوئی۔ تصاویر بھی لی گئیں۔ جس بات نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا، یہ تھی کہ اگرچہ مارشل ٹیٹو کئی سال سے یوگوسلاویہ کے ڈکٹیٹر کی حیثیت رکھتے ہیں تاہم ہماری ملاقات کی جگہ پر کوئی خاص حفاظتی اقدام نہیں کیے گئے تھے۔ ساتھ کے گاؤں کے لوگ اسی طرح گیسٹ ہاؤس کے قریب نہا رہے تھے جس طرح روز نہاتے تھے اور سب سے زیادہ حیران کن بات یہ دیکھی کہ حاتی دفعہ خود مارشل ٹیٹو اپنی کھلی کیڈلک گاڑی چلا رہے تھے۔ ان کے پیچھے ایک کار میں ان کا ذاتی سٹاف تھا۔ نہ کوئی حفاظتی عملہ تھا، نہ کوئی مشین گنوں سے بھری ہوئی جوانوں کی جیپیں تھیں۔ نہ ہوٹرز HOOATERS نہ سائرن SIRON نہ کوئی موٹر سائیکلوں کا جھرمٹ تھا۔ ان کے ہمراہیوں کے پاس بندوق کی قسم کی کوئی چیز میں نے نہ دیکھی۔ پستول اگر ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ یاد رہے کہ یہ قریباً غیر آباد جزیرہ ہے۔ جس میں بیشمار جھاڑیاں اور درخت ہیں۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ہیں جہاں بہترین کمین گاہیں بن سکتی ہیں اور اکثر جگہ سے کار پر آسانی سے فائر ہو سکتا ہے۔

وطن واپس پہنچ کر یہ ساری رپورٹ من و عن میں نے اپنی حکومت کے حوالے کر دی آج تک یہ پتہ نہیں چلا کہ میری اس رپورٹ کو کس رنگ میں دیکھا گیا اور حکومت کا ردِ عمل کیا تھا۔ بظاہر تو یہ نظر آتا ہے کہ ہم انگریز کیا مغلیہ دور کی شان و شوکت کو بھی مات کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور ظاہری شان و شوکت میں دنیا کے سارے ملکوں کو مات کرتے ہیں۔

میں نے COMMONWEALTH OF MUSLIM STATES
(A PLEA FOR PAN-ISLAMISM)

۱۹۶۹ء کی جولائی میں شروع کی تھی اور فروری ۱۹۷۲ء میں ختم کی تھی۔ اس کا پیش لفظ علامہ محمد اسد (ROAD TO MECCA) کی شہرت والے اور دنیا کے مسلّم اور جید عالمِ دین (جو آجکل تنجیر (مراکش) میں مستقل طور پر اقامت پذیر ہیں) نے لکھا۔ یہ کتاب فیروز سنز لاہور نے نہایت دیدہ زیبی سے (اگرچہ کچھ اغلاط رہ گئیں) جون ۱۹۷۲ء میں چھاپی اور اسی وقت میں نے اس کی ۲۰۰ کاپیاں تمام سربراہان ممالکِ اسلامیہ کو ان کے وزیراعظموں، وزرا خارجہ، وزرا اطلاعات، مشہور یونیورسٹیوں اور اخباروں کو "تحفتہً" ارسال کردیں کہ انھی تک یہ پیغام پہنچانا مقصود تھا۔

میری توقع سے زیادہ اس کتاب کی قدرو منزلت ہوئی، اور اگرچہ بعض اسباب کے باعث اندرونِ ملک اس کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی گئی لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ فجی۔ ویسٹ انڈیز۔ برلن۔ لندن۔ جنیوا۔ مارشیس سے کئی پڑھنے والوں نے اس کی تعریف کی۔

جن حکومتوں کو کتاب ارسال کی گئی، ان میں سے اکثر نے نہایت حوصلہ مند جواب دیئے اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بقول بعض اصحاب، دنیا میں پہلی مرتبہ دولتِ مشترکہ ممالکِ اسلامیہ کا خیال، اس کے حق میں دلائل و اعداد و شمار، اس کی اہمیت پر سیر حاصل بحث، اس کے قیام کے واسطے مختلف تجاویز اور اس کا تنظیمی ڈھانچہ صرف ۲۵۰ صفحات میں اس خوبی سے بیان کیا گیا ہے کہ اس کی مثال نہیں ملتی ہے۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میری ناچیز محنت ٹھکانے لگی اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ شاید میرے لیئے "عرصۂ محشر" میں میری یہ حقیر خدمتِ اسلام میرے گناہوں کا کفارہ بن سکے۔ چند بزرگوں کی ہدایت کے مطابق فیصلہ کیا کہ اس کتاب کا عربی اور فرانسیسی زبان (جو افریقہ کے اکثر ملکوں میں اب تک زیادہ استعمال ہوتی ہے) میں ترجمہ ہونا چاہیئے۔

بہ ظاہر تو پاکستان میں رہ کر یہ کام بہت کٹھن نظر آیا لیکن جیسا میں پہلے عرض کر چکا ہوں، اللہ کی راہ میں چلنے کے لیے وہ مولا کریم، وہ مسبب الاسباب خود بخود مشکلات حل کر دیتا ہے چنانچہ سات آٹھ ماہ کے اندر عربی ترجمہ بھی ہو گیا۔ فرنچ میں بھی یہ کتاب تیار ہو گئی اور فروری ۱۹۷۳ء تک بقول ایک نامور عالم فاضل ہستی کے عربی کا ترجمہ رواں دواں ہوا (فرنچ ترجمہ کے متعلق مجھے کسی کی رائے سے واقفیت نہیں ہو سکی) عربی اور فرنچ کتابیں بھی وسط فروری تک چھپ گئیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہر جگہ سے کتاب کی افادیت کے متعلق حوصلہ افزا جواب ملے۔

عربی اور فرنچ میں کتاب چھپ رہی تھی کہ مجھے خیال آیا کہ اگر یہ کتاب اسلام کے سب سے بڑے خادم اور اتحادِ عالمِ اسلام کے سب سے بڑے داعی کی خدمت میں خود پہنچانے کی سعادت نصیب ہو جائے اور ان کو پسند آ جائے تو شاید میری محنت ٹھکانے لگے اور یہ کتاب ان کی بدولت شائع ہو کر سستے داموں پر (جس میں میرا کوئی منافع نہ ہو) دنیائے اسلام کے کونے کونے میں پہنچ سکے۔

چنانچہ میں نے جلالۃ الملک شہید شاہ فیصل المعظم سے درخواست کی کہ وہ مجھے کتاب کے تینوں ایڈیشن خود پیش کرنے کی اجازت بخشیں۔ انھوں نے میری اس پیشکش کو بخوشی قبولیت کا شرف بخشا بلکہ مزید احسان خسروی یہ کیا کہ مجھے اور میری پارٹی کو شاہی مہمان بننے کی عزت عطا فرمائی۔

مُلاقات شاہ فیصل مرحوم

بسلسلہ پیش کرنے کتاب کامن ویلتھ آف مُسلم سٹیٹس

چنانچہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۳ء کو میں، میری بیوی، میرے برادرِ نسبتی شیخ مُعین الدین سابق پرنسپل لارنس کالج گھوڑا گلی، ان کی بیگم (میری سالی) محمودہ۔ میری پوتی عائشہ اور میری نواسی سارہ جدّہ پہنچے۔ شاہی مہمانوں کی حیثیت سے ہمارا استقبال کیا گیا۔ شاہی کار جہاز کے ساتھ آ کر کھڑی ہو گئی اور ہمیں بادشاہ کے مہمانوں کے شایانِ شان طریقہ سے ہوٹل تک پہنچایا گیا۔

دوسرے دن عمرہ کیا۔ تین دن مکّے میں قیام کیا۔ محترم شیخ محمد صالح قزاز (جو سابق سیکرٹری جنرل شیخ سرور الصّبّان کے انتقال کے بعد اب رابطۂ عالمِ اسلامی مکہ کے سیکرٹری جنرل مقرر ہو چکے تھے۔) سے لمبی ملاقات کی۔ وہ میرے پرانے اور مخلص دوست ہیں اپنی کتاب کو دوبارہ چھپوانے اور بہت سستی قیمت پر فروخت کرنے کے لیے، ان سے صلاح مشورے لیے (جن کی تکمیل کے لیے ابھی تک کام جاری ہے) خدا کرے اس کا بندوبست ہو جائے تو میری محنت ٹھکانے لگے۔

مکّے سے جدّے واپس آ کر مدینہ منورہ بذریعہ کار گئے اور وہاں صرف دو دن رہ کر وہ روحانی لطف اٹھایا کہ بیان سے باہر ہے۔ واپسی پر میں اور میری بیوی تو ہوائی جہاز پر آئے۔ باقی ہمراہی دوسرے دن کار پر آئے۔ اب مدینے سے جدّہ تک دوہری سڑک تیار ہو چکی تھی اور دنیا کی اعلیٰ ترین سڑکوں میں شمار ہو سکتی ہے۔ ستر اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار،

سے وہاں کاریں چلانا تو معمول ہے۔ اور اللہ کا کرم ہے کہ کوئی سنگین حادثہ اس متبرک سڑک پر کم ہی پیش آیا ہے۔ اب سعودی عرب وہ ملک نہیں رہا۔ جس کو پہلے ۱۹۶۲ء میں دیکھا تھا۔ اس وقت اس کی فضائی سروس مضحکہ خیز تھی۔ اب بالکل نئے بوئنگ ۷۳۷ چلتے ہیں۔ نہایت تیز اور آرام دہ۔ غالباً بیرونی یا مصری ایر ہوسٹس لڑکیاں جہاز پر مسافروں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ زمانہ بدل نہیں رہا، بدل چکا ہے۔ ہر جگہ، ہر شہر میں کئی منزلہ عمارتیں بنانے کا رواج عام ہو چکا ہے۔ جدہ تو کراچی کو مات کر جائے گا۔ جدے میں بعض مقامی افسران کو مل کر میں اور بھائی معین الدین بذریعہ ہوائی جہاز ۲۷ مارچ کو ریاض پہنچے جہاں دوسرے دن کتابیں شہید شاہ فیصل المعظم کو پیش کرنا تھیں۔ ہوائی جہاز پر کوئی ۵۰ فی صدی غیر ملکی مسافر تھے جو تجارت وغیرہ کے سلسلے میں جدے اور ریاض میں سینکڑوں کی تعداد میں روزانہ آتے جاتے ہیں۔ ۲۸ مارچ ۱۹۷۳ء میری زندگی میں وہ تاریخی دن ہے جب ساڑھے دس بجے کے قریب میں نے اپنی کتاب کے تینوں ایڈیشن انگریزی۔ عربی۔ اور فرانسیسی زبان میں نہایت خوبصورت جلدوں میں شاہ فیصل دنیا کے سب سے بڑے خادم اسلام، شہید اعظم کو پیش کیں۔ بھائی معین میرے ساتھ تھے۔ اس دن ملاقاتیوں کا ہجوم تھا۔ لیکن بادشاہ نے کمال مرحمت سے سب سے پہلے مجھے شرفِ ملاقات بخشا۔ کوئی ۲۲ منٹ تک گفتگو ہوتی رہی۔

ان کے چہرے پر ایک روحانی جلال اور تقدس تھا۔ طبیعت میں بردباری اور آواز دھیمی۔ الفاظ صاف، پُرمعنی اور تھوڑے لیکن حرفِ مطلب کو ادا کرنے کے لیے کافی۔ درویش صفت انسان، لیکن رعب و دبدبہ قدرت نے عطا کر رکھا تھا۔ دعا نکلتی ہے کہ خداوند تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے۔ شہید شاہ فیصل المعظم مرحوم انگریزی جانتے تھے۔ لیکن غیر ملکی زبان بولنے والوں سے مترجم کے ذریعے گفتگو کرتے تھے۔ مجھے کمالِ شفقت سے فرمایا: "آپ کی کتاب میں خود پڑھوں گا۔ جس کا میں نے شکریہ ادا کیا اور رخصت ہوتے

ہوئے ایک بار پھر صیہونیت کے بڑھتے ہوئے خطرات کے متعلق ان کو توجہ دلائی اور عرض کیا کہ اپنے بیشتر وسائل ملکی دفاع کو مضبوط بنانے میں صرف کریں۔ خصوصاً فضائیہ کو ناقابلِ تسخیر بنا دیں۔ باقی ترقی کے پروگرام بیشک جاری رہیں۔ لیکن فضائیہ اور میزائیلوں کے نظام کو اوّلیں حیثیت دی جائے۔ شہید شاہ فیصل المعظم مرحوم کی ہستی عالم اسلام کے لیے ایک مضبوط ستون کا کام دیتی تھی۔ انھوں نے باوجود اپنی پیرانہ سالی کے اکثر ملکوں کا دورہ کیا۔ افریقہ کے مسلم ممالک گئے۔ انڈونیشیا، ملیشیا، پاکستان گئے۔ حتیٰ کہ ترکی اور ایران (عجم) کے سربراہوں سے ملاقاتیں کیں۔ (باوجودیکہ پہلی جنگِ عظیم میں عربوں کے ذریعے فرنگیوں نے ترکی سلطنت کو ختم کروایا تھا) اور عرب اور عجم کی گردان اب بھی دنیا میں سنائی دیتی ہے لیکن اس سچے اور دردمند اور غمخوار مسلمان نے جو واقعی حرمین شریفین کا سچا خادم تھا، کسی بات کی پرواہ کی اور خود جا جا کر اسلامی دنیا کے کونے کونے میں اتحادِ اسلام کا پیغام دیا۔ جن لوگوں نے لاہور کی ۱۹۷۴ء کی مسلم سربراہی کانفرنس کی تصویریں ٹی وی پر (جب سربراہان مملکت نے جمعہ کی نماز شاہی مسجد میں ادا کی تھی) دیکھی ہے۔ ان کو ابھی تک احساس ہے کہ کس خشوع و خضوع کے ساتھ شاہ فیصل دعا مانگ رہے تھے۔ ان کے ڈھلکتے ہوئے آنسو تصویر میں صاف نظر آ رہے تھے۔ جس سے اس عظیم مسلمان کی دردمندی کا پورا یقین ہو جاتا ہے۔ باوثوق ذرائع سے پتہ چلا ہے کہ اخیر وقت تک شاہ فیصل نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے حق میں اپنی رائے نہیں دی تھی۔

تازہ ترین خبروں کے مطابق اب وہ ایٹمی ری ایکٹر لگوا رہے تھے۔ جو میری رائے میں نہایت صحیح قدم ہے کیونکہ ایٹمی توانائی کو فروغ دینے کی مسلمان ملکوں میں بہت ضرورت ہے۔

جلالۃ الملک سے رخصت ہونے کے بعد ہم ریاض یونیورسٹی گئے۔ اس کے کئی شعبے ہیں، جہاں موجودہ علوم کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ سعودی عرب کس قدر تیزی سے ترقی کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ملک میں تمام تعلیم مفت ہے اور بیرون

ملک تعلیم حاصل کرنے والوں کے تمام اخراجات حکومت خود برداشت کرتی ہے۔ گزشتہ دو سالوں میں تیل کو ایک سیاسی حربے کے طور پر استعمال کرنے کے واسطے جو کردار شہید شاہ فیصل المعظم نے ادا کیا، اس سے تمام دنیا میں ان کی دھاک بیٹھ گئی۔ مشہور امریکی ہفتہ وار رسالہ "ٹائم" نے انھیں ۱۹۷۴ء کا عظیم ترین انسان قرار دیا اور ان کی دانائی، فراست، دور بینی بزرگی، استقلال، ذہانت اور طاقت کے متعلق عجیب و غریب انکشافات کئے۔ وہ یقیناً دنیا کی ان عظیم ہستیوں میں سے ایک تھے، جن کے متعلق اقبالؒ نے لکھا تھا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

شرکت سیکرٹری جنرل "الاحبار" بہ اجلاس رابطہ عالمِ اسلامی

اپریل کے پہلے ہفتے وطن واپس پہنچے۔ اپریل ۱۹۷۴ء میں رابطۂ عالمِ اسلامی نے عالمِ اسلام کی ایک بین الاقوامی کانفرنس مکے میں منعقد کی۔ الاحبار کو بھی اس میں نمایندہ بھیجنے کی دعوت دی۔ میں خود تو بوجوہات نہ جاسکا۔ الاحبار کے سیکرٹری جنرل ریٹائرڈ بریگیڈیر محمد افضل خاں کو (جو میرے بھتیجے بھی ہیں) الاحبار کے نمائندے کی حیثیت سے بھیجا۔ وہ ایک نہایت مخلص کارکن ہیں اور انھوں نے الاحبار کی بڑی آبیاری کی ہے۔ اپنے فرائض کو انھوں نے نہایت تن دہی سے انجام دیا اور بعض نہایت مفید تجاویز کانفرنس میں پیش کیں۔ شیخ محمد صالح قزاز سے کتاب کی چھپائی کے سلسلے میں طویل ملاقات کی اور پھر جناب حسن التہامی سیکرٹری جنرل اسلامی سیکرٹریٹ جدہ سے ملے جو اُن کو اپنی رہائش گاہ پر کھانے کے واسطے بھی لے گئے اور سیکرٹریٹ کے کام کو بہتر بنانے کے واسطے مفید گفتگو ان سے ہوئی۔ عزیزم محمد افضل خان کے چھوٹے بھائی محمد صفدر خاں نے بھی الاحبار کی بڑی خدمت کی ہے۔ عربی کا ترجمہ اور کتاب کی چھپائی بہت حد تک ان کی مالی امداد کا نتیجہ ہے۔ اللہ انھیں جزائے خیر دے۔

اب ۱۹۷۵ء مارچ کا اخیر ہے۔ ۱۹ دسمبر ۱۹۷۱ء کو مشرقی پاکستان ہم سے علیحدہ ہوا۔ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ کہانی آپ بار بار سن چکے ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ گو ہمارا ایک بازو ہم سے کٹ گیا، ہمارا باقی جسم ماشاءاللہ صحیح سلامت ہے اور غداروں کی وقتی کامیابی کے باوجود قائداعظم کے دو قومی نظریے کو ہرگز ہرگز کوئی نقصان نہیں پہنچا۔

مسلمان اور ہندو آج بھی اسی طرح دو مختلف قومیں ہیں جیسے پاکستان بننے کے وقت تھیں. ہمارے نظریات مختلف، ہماری روایات مختلف، ہمارا مذہب مختلف، ہمارے عقیدے مختلف، ہماری تاریخ مختلف، مستقبل کی خواہش اور امنگیں مختلف۔ ہمیں کسی صورت اور کسی قیمت پر بھی بھارت کی چالوں میں نہیں آنا چاہیئے۔ ہمارے جواں سال طبقے کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلینی چاہیئے کہ ہماری (پاکستانیوں کی) دُنیوی اور اُخروی نجات اسی میں ہے کہ ہم سچے مسلمان بن کر کسی دوسرے کی غلامی میں نہ جا پھنسیں اور اس کے زیر سایہ نہ آئیں اور جس غرض کے واسطے پاکستان بنایا گیا تھا، ہمیشہ اس کو پیش نظر رکھیں۔ یعنی یہ کہ یہ مسلمانوں کا وطن ہے اور یہاں اسلامی آئین اور اسلامی معاشرہ قائم ہونا چاہیئے۔ ہمیں لسانی، علاقائی، نسلی جغرافیائی اختلافات کو سختی سے مٹانا چاہیئے۔ ہم کہیں بستے ہوں، ہم ایک ملت ہیں (ملتِ واحدہ اسلامیہ) ہم میں پٹھان، بلوچ، پنجابی، سندھی کی کوئی عملی تفریق نہیں ہونی چاہیئے۔

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیِ والا گہر!
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہ گزر

پاکستان حاصل کرتے وقت ہم نے سندھی، پنجابی، بنگالی کا نعرہ نہیں لگایا تھا بلکہ صرف اسلام کا نعرہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ بچے بچے کی زباں پر تھا۔

اس وقت تو کسی نے نہیں کہا تھا کہ میں بلوچ ہوں، سندھی، بنگالی ہوں۔ اگر اس وقت ایسا ہو سکتا تھا تو اب مسلمان ملت بننے میں کیا دشواری ہے۔ پاکستان اِس وقت کئی مشکلات سے دوچار ہے۔ اِس کے خلاف جارحیت کی دھمکیاں بھی دی جارہی ہیں۔ ہم تمام مشکلات کا صرف اسی صورت میں مقابلہ کر سکتے ہیں کہ ہم اپنے عمل سے دنیا کو بتلائیں کہ پاکستان کے مسلمان جہاں تک ملکی دفاع کا مسئلہ ہے، ایک ہیں۔ ہم میں کوئی تمیز سندھی، پنجابی، بلوچی

یاسعدی کی نہیں ہے۔ اگر خدانخواستہ یہ صورت ہوئی کہ

اُمتے بودی امم گردیدۂ !
بزمِ خود را خود ز ہم پاشیدۂ

تو ہمارا مستقبل مخدوش ہے۔

غیب کا حال اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے۔ پاکستان کی قسمت کے متعلق وہی جانتا ہے۔ البتہ تجویز اور سعی ہمارا فرض ہے۔ اس میں تساہل نہیں ہونا چاہیئے۔ ہمیں پتہ ہونا چاہیئے کہ

اہلِ حق را زندگی از قوت است
قوتِ ہر ملت از جمعیت است

لہٰذا ہمیں سب سے پہلے جمعیت بنانی چاہیئے اور جمعیت بھی "جمعیتِ حرم" یعنی اسلام از م۔ کل مومن اخوۃ"۔ سب مسلمان بھائی بھائی ہیں۔

ہماری پہلی تجویز یہ ہونی چاہیئے کہ موجودہ طرز (رومیانہ) زندگی کو چھوڑ کر سادگی اختیار کرنی چاہیئے۔ ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت پر سب خرچ یک قلم بند کیے جائیں۔ ساری قوم پیٹ پر پتھر باندھ کر آیندہ کے واسطے اپنے دفاع اور ترقی کی تیاری کرے۔ جب تک ہم خود اپنے پاؤں پر نہ کھڑے ہوں گے، دوسروں کے سہارے یا آسرے پر ہم تباہی سے نہیں بچ سکتے۔ اس وقت ہم فضول نمائشی کاموں پر بے دریغی سے روپیہ خرچ کر رہے ہیں۔ خواہ ملک کا اس میں حقیقی فائدہ ہے یا نہیں محض وقتی اور سیاسی مطلب براری کے لیے اس غریب ملک کا روپیہ اس بے دردی سے دریا بُرد کرنا! کیسے ہمارے مستقبل کو تابناک بنا سکتا ہے؟ ہر بے جا اور فضول خرچ بند کر کے ملک کی حفاظت اور ترقی کا انتظام کیا جائے۔ سامانِ دفاع زیادہ سے زیادہ ملک میں بنایا جائے۔ تاکہ بروقت دوسرے سے نہ مانگنا پڑے۔

ملکی دفاع کے لیے انتہائی جدوجہد ہماری PRIORITY NO. 1 ہونی چاہیئے۔ فرض اولیں۔ باقی سب کام ان کے سامنے ہیچ ہیں۔

ایٹمی توانائی کو فروغ دینے کے واسطے ہمیں اپنا تن، من، دھن قربان کر دینا چاہیئے آجکل کی جنگوں میں جدید ترین آلاتِ حرب ہی کام آسکتے ہیں۔ ہم ابھی تک اس میدان میں بہت پیچھے ہیں بلکہ خوابِ خرگوش میں پڑے ہوئے ہیں۔

یہ حال صرف ہمارا ہی نہیں، سارا عالمِ اسلام اس کمزوری میں مبتلا ہے۔ میں مدّت سے اس کے خلاف واویلا کر رہا ہوں اور ہر ایک سے کہتا ہوں کہ خدا کے واسطے جھوٹی نمائش کو چھوڑ کر تمام ملکی ذرائع ملک کے دفاع کو مضبوط ترین بنانے کے لیے استعمال کرو۔

دوسری بات جو ہمیں کرنی چاہیئے، وہ یہ ہے کہ ذاتی اناکو چھوڑ کر جس طرح بن پڑے اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کیا جائے۔ شخصی اور پارٹی سطح سے ابھر کر ملکی مفاد کے واسطے اپنی زندگیاں وقف کر دی جائیں۔ اس وقت ملک میں حزبِ اقتدار اور حزبِ اختلاف میں جو بُعد پیدا ہو گیا ہے (اور بڑھ رہا ہے) وہ ہمارے واسطے باعثِ تشویش ہے۔ کئی طرف سے ہمیں دھمکیاں دی جارہی ہیں۔ ایک سُوپر طاقت دو ہمسایوں کو ہمارے برخلاف استعمال کرنے پر تُلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اگر ایسے نازک حالات میں بھی ہم نے ہوش نہ سنبھالی تو کب جاگیں گے جب پانی سر سے گزر جائے گا؟

تیسری تجویز جو ہمارے مستقبل کو پُر اُمید بنا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ہم اسلامی بلاک سے اپنا رشتہ اور مضبوط کریں۔

فروری ۱۹۷۴ء میں لاہور میں مسلمان سربراہوں کی چوٹی کی کانفرنس بہت اچھا خیال تھا لیکن زیادہ اچھا ہوتا کہ اجتماعی طور پر ہم عالمِ اسلام کے ہر حصہ کے دفاع کی تجاویز بھی سوچتے۔ مسلمان ملکوں میں بڑھتے ہوئے اختلافات کو دور کرنے کی تدابیر پر غور کرتے۔ مستقل اسلامی سیکرٹریٹ کے ہر ممبر سے برادری میں وعدہ لیتے کہ وہ کسی دوسرے ممبر کے خلاف کسی قسم کی کارروائی نہ کرے گا اور اگر اس کی خلاف ورزی کرے گا۔ تو ساری برادری سے بگڑ جائے گی۔ مسلم ملکوں کا اتحاد صرف مذہب کی بنا پر ہونا چاہیئے۔ R.C.D. جیسی تنظیمیں اپنی جگہ

ایک افادیت رکھتی ہیں۔ اس میں بحث نہیں (اگرچہ میں تو سمجھتا ہوں کہ محض علاقائی قرب کی بنا پر مسلمان کا اتحاد مکمل اتحادِ اسلامی کا خاکہ نہیں ہے۔ میں نے تو جب R.C.D. بنی تھی، انھی خیالات کا اظہار کیا تھا جو ملکی اخبارات میں نہ چھپ سکا۔ اور آخر مجھے

MUSLIMS NEWS INTERNATIONAL LONDON

میں اپنا مضمون چھپوانا پڑا، جس کے لیے اس ادارے کو اس کی بھاری قیمت دینی پڑی یعنی لندن سے کراچی آنا پڑا تاکہ حکومتِ وقت کی اس پر کڑی نگرانی رہے۔)

R.C.D. کے اجرا پر بھی چڑھتے سورج کی پرستش کرنے والوں نے ببانگِ دہل کہا تھا کہ حضرت جمال الدین افغانی اور علامہ اقبال کا خواب پورا ہوگیا۔ میں نے کہا ہرگز نہیں۔ اس تعاون کی بنیاد ہی ان دونوں بزرگوں کی بنیاد سے جدا ہے۔ اپنی جگہ یہ اچھی بات ہے لیکن یہ وہ PAN-ISLAMISM نہیں ہے۔ یہ وہ جمعیتِ حرم نہیں ہے، جس کا تصور اقبال نے پیش کیا تھا۔

البتہ فروری ۱۹۷۴ء کی لاہور کانفرنس جس میں مسلم ممالک کے سربراہ اور تحریکِ آزادیٔ فلسطین کے راہنما شامل ہوئے، یقیناً مذہب کی بنیاد پر استوار کی گئی تھی اور وہ اس لحاظ سے R.C.D. جیسی تنظیموں سے اعلیٰ وارفع وجداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ یہ کانفرنس مسلم ممالک کو قریب لانے کا بڑا اچھا ذریعہ بنی۔ اخوت اور بھائی چارہ کے مظاہرے کی بھی مستحسن مثال پیش ہوئی اور ہمیں امید رکھنی چاہیئے کہ اگر اخوت کا یہ جذبہ جو لاہور کانفرنس میں کارفرما تھا، قائم و دائم رہا تو عالمِ اسلام کی تازہ اہمیت کی وجہ سے اسلامی ممالک دنیا میں پھر عزت و افتخار سے ہمکنار ہوں گے۔

ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ لاہور کانفرنس میں دفاعِ اسلام کی عملی تجاویز پر غور ہونا چاہیئے تھا۔

اور اس کے علاوہ یہ اعلان ہو جانا چاہیئے تھا کہ ہمارا نصب العین دولتِ مشترکہ

ممالکِ اسلامیہ کا قیام ہے اور ہمارا عقیدہ پین اسلام ازم یعنی عالمی اتحادِ اسلامی ہے۔

اس اعلان کی شدید ضرورت تھی۔

"آپ کو یاد ہوگا کہ جب تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی (۱۹۴۰ء کے قریب) تو بہت کم لوگوں کو منزل کا پتہ تھا۔ اس لیے اس کے راستوں سے بھی ناواقفیت تھی۔

لیکن ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں پاکستان ریزولیوشن پاس کر کے ملّت کو ایک واضح نصب العین، ایک متعین منزل اور ایک حیات افروز جذبہ نصیب ہوا اور آپ نے دیکھا کہ ۷ سال کے عرصہ میں ہی خدا کے فضل سے پاکستان قائم ہوگیا (اللہ تعالےٰ اسے ہمیشہ پائندہ اور تابندہ رکھے۔)"

اب بھی مسلم سربراہوں کا فرض ہے کہ وہ ملّت کے سامنے ایک صاف منزل پیش کر دیں تاکہ وہاں تک پہنچنے کے طریقوں اور راستوں پر سوچ بچار ابھی سے شروع ہو جائے۔

غالباً اس بات کو دہرانے کی ضرورت نہیں کہ اگر بچے کھچے پاکستان کو بچانا ہے تو سندھو دیش، پختونستان، آزاد بلوچستان وغیرہ گمراہ کن نعروں کو ترک کر کے تمام علاقائی نسلی، لسانی بت پاش پاش کر دیئے جائیں۔ سندھی، بلوچی، پٹھان، پنجابی کی گردان یک قلم موقوف کر دی جائے۔ جو کام کیا جائے ملّت کے واسطے کیا جائے۔ اُمّت کے واسطے کیا جائے۔ سارے ملک کے مفاد کے واسطے کیا جائے اللہ اور اس کے پیارے رسولؐ کی تعلیم کے مطابق کیا جائے۔

میرے وہ عزیز نوجوان جو پاکستان بننے کے بعد عالمِ وجود میں آئے اور جو شاید اس کتاب کو پڑھیں، ہندو (بنیا) سیاست کی عیاریوں سے واقف نہیں۔ ان کو غالباً یہ

معلوم نہیں کہ بھارت نے پاکستان کو پہلے دن سے ذہنی طور پر تسلیم نہ کیا تھا (اور نہ اب اسے تسلیم ہے) درحقیقت بھارتی ہندو کی نظر میں ہم کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں کہ ہم نے بھارت ماتا (ماں) کے ٹکڑے کر دیئے۔ ہندو ہمارے اس جرم کو کبھی نہیں بھولا اور نہ بھول سکتا ہے

دوسرے ان عزیزوں کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ برہمنی سامراج انڈونیشیا سے کابل تک ہندو اقتدار کے خواب مدت سے دیکھتا آرہا ہے اور اب بھی دیکھ رہا ہے۔ جوناگڑھ حیدرآباد گوا، سکم، کشمیر کو جس طرح اس نے ہڑپ کیا ہے، اس کا ہمارے عزیز نوجوانوں کو ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ہمارا مستقبل اسی صورت میں امید افزا بلکہ تابناک ہوسکتا ہے کہ ہم یہ عہد کریں کہ ملت کے ہر فرد نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی طرح مجاہدانہ زندگی گزارنی ہے اور اسلام اور پاکستان پر اپنی سب متاعِ عزیز قربان کر دینی ہے۔ جان کی ضرورت پڑے تو وہ بھی بخوشی حاضر ہے۔

اگر یہی جذبہ ہم میں کارفرما رہا اور ہمارے رہنمایانِ ملک نے تمام تر توجہ ملکی دفاع و ترقی کے لیے وقف کر دی تو پھر انشاءاللہ آپ دیکھیں گے کہ پاکستان کا مستقبل روشن بلکہ منوّر ہے۔ پاکستان زندہ رہے گا، پائندہ رہے گا۔ انشاءاللہ العزیز۔ لیکن اگر ہم نے اپنے مستقبل کے لیے وہی غفلت برتی جو ہم برت رہے ہیں تو پھر ڈر ہے کہ ہمارا نام بھی اسی طرح سے صفحۂ ہستی سے مٹ جائے گا۔ بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بے نشان ہیں۔

میں کتاب کا آخری صفحہ لکھ رہا تھا کہ ۲۵ مارچ ۱۹۷۵ء شام ۵ بجے یہ منحوس خبر سنی کہ شاہ فیصل کو ان کے بھتیجے نے گولی مار کر شہید کر دیا ہے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ یہ صدمہ میرے لیے ہی نہیں (مجھے مرحوم سے بڑی عقیدت تھی) بلکہ سارے عالمِ اسلام کے لیے ایک بہت بڑا المناک حادثہ تھا۔ اس المیہ کے اثرات دیر تک عالمِ اسلام کو متزلزل کرتے رہیں گے۔ شاہ فیصلؒ ایک چٹان تھے۔ حق و صداقت کی چٹان، ایمان و ایقان کی چٹان۔ جس کے ساتھ تمام مذموم طاقتیں ٹکرکھا کر پاش پاش ہو جاتی تھیں۔ وہ بلاشبہ نہ

صرف دنیائے اسلام بلکہ ساری دنیا کے راہنماؤں میں ایک خاص درجہ رکھتے تھے۔ اب تھا اکبر آں پالیسی واں نگہِ دور بینی کجا۔ ان کی شہادت میں کس کا ہاتھ کام کر رہا تھا؟ مشرقِ وسطےٰ کی سیاست پر ان کی شہادت کے بعد کیا اثرات مرتب ہوں گے؟ تسبیح کے بکھرے ہوئے دانوں کو کون اکٹھا کرنے کی زحمت اٹھائے گا؟ حرمِ کعبہ اور مدینہ منورہ کا اب کون پرسانِ حال ہوگا؟ سب ایسے سوالات ہیں جو دماغ میں ابھرتے ہیں اور کچھ وقت کے لیے دماغ کی سوچنے والی قوت کو معطل کر دیتے ہیں لیکن مسلمان کو مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد اور "خورشید نکلتا ہے سدا پردۂ شب سے" پر ہمارا الیقین ہے۔ شکر ہے کہ ان کے جانشین یقین دلا رہے ہیں کہ وہ شہید کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں گے۔ اللہ تعالےٰ انھیں توفیق دے اور استقامت بخشے کہ وہ بھی اسلام اور عالمِ اسلام کی اسی طرح خدمت کریں جیسے شاہ فیصل شہیدؒ نے کی تھی۔ کاش کہ ۲۵ مارچ کا المیہ پیش نہ آتا اور اس کتاب کے اختتام پر مجھے خون کے آنسو نذر دنے پڑتے۔ لیکن "وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے" مسلمان راضی برضائے مولا ہے۔

یہ کتاب میں نے ۲۶ دسمبر ۱۹۷۴ء میں لکھنی شروع کی تھی۔ خدا نے ایسا کیا کہ ۲۶ مارچ ۱۹۷۵ء مطابق ۱۲ ربیع الاوّل یوم میلاد النبیؐ کو ختم ہوئی۔ یہ دن ساری دنیا کیلئے برکتوں اور رحمتوں والا ہے ارضِ پاکستان کی کہانی بڑی دلچسپ اور سبق آموز ہے یہ جاری و ساری رہنی چاہیئے لیکن

بڑے شوق سے سن رہا تھا زمانہ
ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے

سوتے سوتے نوجوان عزیزانِ ملّت کو صرف یہ مزید کہنا چاہتا ہوں:

تم سے تھے تو تھا موعزت کو قوم کی اب
اپنے تو قافلے سب پا در رکاب یاں ہیں

(حالیؔ)